آپ سے کیا پردہ
ابنِ انشاء

نمبر شمار	مضامین	صفحہ نمبر
1	نالے کو رسا باندھنے والا	9
2	چند سبق آموز کہانیاں	13
3	سیٹھ حاتم طائی سے سیٹھ لٹھا بھائی	18
4	کیسنجر کی واپسی	26
5	خطبہ صدارت حضرت ابن انشاء	30
6	سوئی میں اونٹ کیسے ڈالا جائے	34
7	رامائن اور مہابھارت	39
8	اتفاق میں برکت ہے	42
9	ڈگریاں بڑی نعمت ہیں	45
10	التماس متضمن بہ اجازت برائے فیملی پلاننگ	49
11	ذکر کاہلی کا	51
12	داخلے جاری ہیں	55
13	ایک دن ڈاکٹر بال جبریل کے ہاں	59
14	نسخہ بھونکتے کتے سے بچنے کا	64
15	ہماری باتیں ہی باتیں ہیں	67
16	حکیم جی لندن میں پہنچ گئے	71
17	ہمارا ملک	76
18	ایک خبر دیپالپوری	78

نمبر شمار	مضامین	صفحہ نمبر
19	کچھ اعداد و شمار کے بارے میں	82
20	ایک کالم بغیر عنوان	86
21	بجٹ کی باتیں	89
22	ہونہار طالب علموں کے درمیان	94
23	ترجمہ کرا لیجئے تقریر لکھوا لیجیے سودا منگوا لیجیے	99
24	آنا ہمارا	104
25	جٹ چوری پٹ فیلہ	108
26	کچھ اخباروں کے بارے میں	113
27	ویسے تو ہم خیریت سے ہیں	119
28	ایک دو کہانیاں مکرر ارشاد ہیں	123
29	لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو	126
30	پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے	131
31	اس لیے تصویر جاناں ہم نے کھنچوائی نہیں	135
32	اب ہماری قربانی شرعاً جائز نہیں رہی	139
33	منو بھائی	143
34	ہفتہ ٹریفک کیوں شروع کیا	148
35	ڈاک خانے والے پانی چھوڑ دو	152
36	ہمارا تمہارا خدا بادشاہ	155
37	چند غیر ضروری اعلانات بس مسافروں کے مژدہ	157
38	نظر ثانی کے بعد	161
39	علاج سے پرہیز بہتر ہے	168

نمبر شمار	مضامین	صفحہ نمبر
40	پرہیز علاج سے بہتر ہے	172
41	بیان پالتوں جانوروں کا	176
42	ایک سپاسنامہ ایک بے لوث کارکن کی طرف سے	179
43	آ گئے قوم کے بے لوث خدمت کرنے والے	183
44	حکیم بقل بطورا	188
45	ذکر دروازوں کا کرسیوں کا اور بوریے کا	193
46	قصہ آب رواں کا اور مچھلیوں کا	197
47	ابھی کل کی بات ہے	201
48	کیا پانی بھی برادر	204
49	واپسی مچھر خان کی	208
50	ہم دعوت نامہ لے کر گئے تھے	213
51	میر صاحب سے آغا صاحب تک	218
52	قصہ ایک بہت بولنے والے کچھوے کا	224
53	کچھ انڈوں کی طرف داری میں	230
54	آج ایک سبق جغرافیے کا	234
55	اس کوچے میں	239
56	ایک سوالنامے کا جواب نامہ	242
57	کام نکما کر دیا	246
58	ایک کالم برستے پانی میں	250

نمبر شمار	مضامین	صفحہ نمبر
59	کراچی میں دو عیدیں	254
60	ہم تقریر کرنے سے کتراتے ہیں	257
61	پریس کلب میں تقریب رونمائی	262
62	ترقی دھوبیاں کوآپریٹیو سوسائٹی	268
63	اگر میاں مجنوں یہ جنتری دیکھ لیتے	271
64	ان دنوں ہم ٹیکس دینے میں مصروف ہیں	277
65	طریقہ محفل میں بات کرنے کا	283
66	تبصرے کے لیے سالن کی دو پتیلیاں آنی ضروری ہیں	292
67	ہمارا ریڈیو بج رہا ہے اور بے آواز ہے	297
68	آج کیا پکایا جائے...... لکھنے کا مسئلہ کیسے حل ہو	302
69	لاؤڈ اسپیکر کے لیے پردے کا خاص انتظام ہے	307
70	اہرام بنانے کے لیے قطب مینار سیمنٹ استعمال کیجیے	310
71	ہمیں نظر کرم کی بھیک ملے	313
72	مصوری میں گھوڑا مارکہ پینسل کی اہمیت	319
73	دو سپاسنامے جناب گاؤ کی آمد اور حضرت خر کی رفت کی تقریب	324
74	بحث کچے اور پکے گانوں کی	327
75	شعر لکھوا لیجیے یا پنکچر لگوا لیجیے	332
76	اسکولوں میں داخلہ نہیں ملتا تو	336
77	جنگ نہیں ریہرسل تھی	341
78	بدل کر مریضوں کا ہم بھیس غالب	343

نمبر شمار	مضامین	صفحہ نمبر
79	ہوائی سفر بھی کیا سفر ہے؟	347
80	ہم منگولیا نہیں گئے تھے	350
81	سچ کے پاؤں نہیں ہوتے	360
82	اسے اشتہار نہ سمجھا جائے	365
83	طلاق کے مقدمے میں میاں بیوی کے درمیان راضی نامہ ہوگیا	366
84	شاعری کی کہیں بھی قدر نہیں	370
85	جانا ننھے شہزادے کا بلا رعایا کے بادشاہ کی مملکت میں	374
86	ہے ہے مرا باغ لے گیا کون؟	382
87	رپورٹ پٹواری مفصل ہے!	387
88	بچ موڑ توں...... ہفتہ ٹریفک شروع ہوگیا	394
89	شہزادی امینہ نے اپنی شادی کے لیے ٹینڈر طلب کرلیا	399
90	بج رہا ہے اور بے آواز ہے!	405
91	ذکر اونٹوں اور بلیوں کا	410
92	پنجاب یونیورسٹی میں شعبہ حماقت کھل گیا!	414
93	حساب کتاب روپوں کا اللہ اور فائدے غریبی کے	419
94	ہماری تقریر یوم غبغب گھڑیالوی پر!	423
95	پاکستان ناول مینوفیکچرنگ کمپنی	429
96	ایک چھوٹی سی سیر درویش کی!	433
97	جب طوفان نوح کا پانی ہمارے صحن میں داخل ہوا	438
98	دیش مکھ جی کیسے دیش کو مکھ دکھائیں گے	442

نالے کو رسا باندھنے والے

بے شک ہم نے پچھلے دنوں اخبار میں پڑھا تھا کہ وزیر خزانہ عقیلی صاحب نے عظیم تر کراچی کو پانی کی بہم رسانی کے منصوبے کے لیے ہر ممکن مدد دینے کا وعدہ کیا ہے لیکن ہمیں یہ گُمان نہ تھا کہ اس منصوبے پر اتنی جلدی عمل ہوگا اور ہماری انقرہ سے واپسی کا انتظار بھی نہ کیا جائے گا۔ عقیلی صاحب کا بیان پڑھنے کے بعد ہم کئی دن کپڑے اُتارے ٹونٹی کھولے نل کے نیچے بیٹھے رہے۔ آخر مایوس ہوکر چل دیے کہ اچھا بحیرۂ روم میں نہالیں گے۔ آبنائے باسفورس میں ڈبکی لگالیں گے۔ ہمارے جانے کی دیر تھی کہ پانی کُھل گیا اور ایسا آسمان کا چھپر پھاڑ کر کُھلا کہ لوگوں کے گھروں میں ایک غسل خانے تو ضرور سوکھے رہے۔ باقی ہر جگہ جل تھل ہوگیا۔ ہم یہ خبر پاتے ہی بھاگے بھاگے کراچی واپس آئے اور جلدی سے نل کھولے بالٹی آگے کی۔ اس میں سے ایک سرد آہ نکلی، ایک مصرعہ ٹپکا۔

جو کسی کے کام نہ آسکے
میں وہ ایک مُشتِ غبار ہوں

اصل میں قصور ہمارا ہے۔ ہم پانی کے لیے کالم پر کالم تو لکھتے رہے لیکن یہ وضاحت کرنا بھول گئے کہ ہم پانی نلوں کے راستے چاہتے ہیں۔ براہِ راست نہیں کیونکہ ہم کوئی

گوالے تھوڑا ہی ہیں۔ نہ پانی کے جانور ہیں۔ ہمارا خیال تھا کے۔ڈی۔اے والوں نے عظیم تر کراچی کے لیے پانی کی بہم رسانی کا منصوبہ عقیلی صاحب کو پیش کرتے ہوئے یہ بات صاف کردی ہوگی، کیونکہ عقیلی صاحب کراچی میں نہیں رہتے۔ وہ ان رموز کو کیا جانیں کہ ہمیں پانی کی کتنی ضرورت ہے اور کس طور ضرورت ہے۔ خیر بندہ بشر ہے۔ غلط فہمی ہو ہی جاتی ہے۔ بہر حال آئندہ کے لیے یہ ملحوظ رکھا جائے کہ ہمیں پانی فقط اتنا چاہیے کہ خود پی سکیں۔ اتنا نہیں کہ ہمیں پی جائے۔

ہمارے ایک دوست کا کہنا ہے کہ غلط فہمی خود ہمیں ہوتی ہے۔ پانی کی اس ریل پیل سے جو ہمارے بعد کراچی میں ہوئی عقیلی صاحب کا کچھ تعلق نہیں۔ عظیم تر کراچی کے لیے پانی کا عظیم تر منصوبہ تو ابھی تک ان کی ٹرے میں سوکھا پڑا ہے۔ یہ کارگزاری کہیے یا کارستانی، کارکنانِ قضا و قدر کی ہے۔ ان بزرگوں سے پوچھا گیا تو انہوں نے محکمہ موسمیات پر بات ڈالی کہ ہم تو جو کچھ کرتے ہیں ان کی پیشین گوئی سُن کر کرتے ہیں۔ اس سے سرِ مو انحراف کی ہمیں مجال نہیں۔ کے۔ ڈی۔ اے والے اپنا قصور صرف...... اس حد تک مانے کہ ہم نے ابرِ کرم کا پرنالہ فقط ابن انشا کے گھر پر کھولنے کی استدعا کی تھی کیونکہ یہی بڑھ بڑھ کر کالم لکھتا تھا اور محرّم کے دنوں میں بھی پانی کے لیے ہمیں تنگ کرتا تھا۔ باقی مخلوق محض اس کے ہمسائے میں رہنے کی وجہ سے ماری گئی۔ بُری صحبت کا یہی انجام ہوتا ہے۔ بھینس کالونی کے گوالوں نے اقرار کیا کہ بے شک ہم چاہتے تھے کہ دودھ کی کمی پوری ہونے کی کوئی سبیل نکلے۔ لیکن یہ منشا ہماری بھی نہ تھی۔ کہ اس سبیل کی ٹونٹی پوری کھول کر اس زناٹے کا تریڑا دیا جائے۔ معلوم ہوتا ہے ہماری دُعا کا پتہ غلط ہو گیا اور یہ عالم بالا پر اس شاعر کو موصول ہو گئی جس نے لکھا تھا۔

رونے پہ باندھ لے جو مری چشمِ تر کمر
کسی زمین؟ فلک پہ ہو پانی کمر کمر

☆☆☆

چند ماہ اُدھر کی بات ہے کہ لاہور میں مینہ برسا اور چھاجوں برسا۔ لوگوں کے سُوکھے دھانوں پر پانی پڑا تو ہر کسی نے یہ جتانے کی کوشش کی کہ ویسے تو من آنم کہ من دانم۔ لیکن یہ بارش بندے نے برسوائی ہے۔ مجھ ہی گنہگار نے اللہ میاں کو اشارہ کیا تھا کہ ہاں اب اجازت ہے۔ ہمارے دوست میاں انتظار حسین نے طبعی انکسار کی بنا پر اپنا نام تو نہ لیا، ہاں ساری داد اپنے اور ہمارے دوست ناصر کاظمی کی جھولی میں ڈال دی کہ انہوں نے ایک غزل لکھی تھی وہ ہم نے ٹیلی ویژن پر ان سے گوائی اور صاحبو...... بادلوں کو اُمڈ گھمنڈ کر آتے ہی بنی۔ اسی تقریب سے ہم نے بخاری صاحب سے عرض کیا تھا کہ کراچی میں ٹیلی ویژن کے خداوند آپ ہیں۔ یہاں بھی تان سینوں اور بیجو باوروں کی کمی نہیں۔ آپ بھی کسی کو پکڑیے ٹیلی ویژن کا اسٹوڈیو تو ابھی نہیں بنا۔ لیکن کھمبے تو گڑ گئے ہیں۔ ایک کھمبے پر اسے چڑھا کر حکم دیجیے کہ ملہار گا۔ تجھے معقول پیسے دیں گے۔ لیکن پہلے چھتری تان لے ورنہ بھیگ جائے گا۔ کیا عجب بخاری صاحب نے ہماری یہ فرمائش ریڈیو کے فرمائشی پروگرام کو بھیج دی ہو جو اب تک ان کی بات مانتے ہیں کیونکہ انقرہ میں جمعرات ۲۷ر جولائی کو ہم نے بارش کی تباہی کا سُن کر فکر مندی سے ریڈیو کھولا تو یہاں گیارہ بجے دن کی خبریں ہو رہی تھیں۔ معلوم ہوا قیامت برپا ہے جونہی خبریں ختم ہوئیں۔ پہلا ریکارڈ یہی سُنائی دیا۔

جھوم جھوم کر برسو بادل جھوم جھوم کر برسو۔

☆☆☆

خیر ہمیں شاعری اور نغمے کی تاثیر سے انکار نہیں اور یہ بھی تسلیم کہ ہمارے ہاں ایسے باکمال شاعر اور نغمہ سرا گزرے ہیں کہ گلیوں کوچوں میں صدا لگاتے پھرتے تھے۔ بارش برسوالو بارش۔ آپ کو اپنے لان میں پانی دینا ہے، تو آواز دی کہ میاں ذرا آدھ انچ بارش چاہیے۔ کتنے پیسے لو گے؟ معاملہ پٹا تو اس نے فوراً برساتی اوڑھ کان پر ہاتھ رکھ کر ایک تان لگائی۔ آدھا انچ بارش برس چکی تو خود بہ خود دھوپ نکل آئی۔ پرانے زمانے

میں ایک بات یہ اچھی تھی کہ بارش زیادہ ہوجائے، جیسی کراچی میں ہونے لگی ہے تو نالے کو رَسا باندھنے والے بھی مل جاتے تھے۔ اب کسی ناصر کاظمی یا بڑے بارش علی خان سے کہیے تو کہ میاں ذرا اورنگی نالے کو رسا باندھ اور روک۔ جھونپڑیاں بہی جارہی ہیں۔ آج کل یہ فنِ شریف ناپید ہوگیا ہے۔ جس طرح آتش بازی پر پابندی لگنے کے بعد سے دیپک راگ گانے والے ڈھونڈے سے نہیں ملتے۔

☆☆☆

چند سبق آموز کہانیاں

ایک تھی چڑیا ایک تھا چڑا، چڑیا لائی دال کا دانا۔ چڑا لایا چاول کا دانا۔ اس سے کھچڑی پکائی۔ دونوں نے پیٹ بھر کر کھائی۔ آپس میں اتفاق ہو تو ایک ایک دانے کی کھچڑی بھی بہت ہو جاتی ہے۔

چڑا بیٹھا اُونگھ رہا تھا کہ اس کے دل میں وسوسہ آیا کہ چاول کا دانا بڑا ہوتا ہے۔ دال کا دانا چھوٹا ہوتا ہے۔ پس دوسرے روز کھچڑی پکی تو چڑے نے کہا اس میں سے چھپّن حصّے مجھے دے۔ چوالیس حصّے تو لے۔ اے بھاگوان۔ پسند کر یا ناپسند کر۔ حقائق سے آنکھیں مت بند کر۔ چڑے نے اپنی چونچ میں سے چند نکات بھی نکالے اور اس بی بی کے آگے ڈالے۔ بی بی حیران ہوئی بلکہ رو رو کر ہلکان ہوئی کہ اس کے ساتھ تو میرا جنم کا ساتھ تھا لیکن کیا کرسکتی تھی۔

دوسرے دن پھر چڑیا دال کا دانا لائی اور چڑا چاول کا دانا لایا۔ دوسرے دن الگ الگ ہنڈیا چڑھائی۔ کھچڑی پکائی۔ کیا دیکھتے ہیں کہ دو ہی دانے ہیں۔ چڑے نے چاول کا دانا کھایا۔ چڑیا نے دال کا دانا اُٹھایا۔ چڑے کو خالی چاول سے پیچش ہوگئی۔ چڑیا کو خالی دال سے قبض ہوگئی۔ دونوں ایک حکیم کے پاس گئے جو ایک بِلّا تھا۔ اس نے دونوں کے سروں پر شفقت کا ہاتھ پھیرا اور پھیرتا ہی چلا گیا۔

ع دیکھا تو تھے دو مُشت پر

یہ کہانی بہت پرانے زمانے کی ہے۔ آج کل تو چاول ایکسپورٹ ہوجاتا ہے۔ اور دال مہنگی ہے۔ اتنی کہ وہ لڑکیاں جو مولوی اسمٰعیل میرٹھی کے زمانے میں دال بگھارا کرتی تھیں آج کل فقط شیخی بگھارتی ہیں۔

☆☆☆

ایک تھا گورو، بڑا نیک دھرماتما۔ دو اس کے چیلے تھے۔ وفادار، جاں نثار، گورو کے خون کی جگہ اپنا پسینہ بہانے کے لیے تیار۔ ایک کا شُبھ نام پوربول تھا۔ دوسرے کا پچھمی چند۔ گوروجی جب لوگوں کو اُپدیش دینے اور ان کی مرادیں پوری کرنے کے بعد آرام کرنے کو لیٹتے تو چیلا پوربول ان کی داہنی ٹانگ دباتا اور پچھمی چند بائیں ٹانگ کی ٹہل سیوا کرتا۔ دونوں اپنے اپنے حصّے کی ٹانگ کی مٹھی چاپی کرتے۔ تیل چپڑ کر اسے چمکاتے۔ جھنڈیاں اور گھنگرو باندھ کر اسے سجاتے۔ اس پر مکھی بھی نہ بیٹھنے دیتے تھے۔ ایک روز کرنا پرماتما کا ایسا ہوا کہ گوروجی ایک کروٹ لیٹ گئے اور ان کی بائیں ٹانگ داہنی ٹانگ کے اوپر جا پڑی۔ چیلے پوربول کو بہت غصّہ آیا۔ اس نے فوراً ایک ڈنڈا اُٹھایا اور بائیں ٹانگ پر رسید کردیا۔ گوروجی نے بلبلا کر داہنی ٹانگ اوپر کرلی۔ اب پچھمی چند کی غیرت نے جوش مارا۔ اس نے اپنی لٹھیا اٹھائی اور داہنی ٹانگ کی خوب مرمت کی۔ گوروجی بہت چلائے کہ ظالمو! کیوں مارے ڈالتے ہو۔ ہائے! لیکن چیلے کب مانتے تھے۔ گوروجی کی ٹانگیں سوج کر کُپا ہوگئیں۔ مدّتوں ہلدی چُونا لگانا پڑا۔

اب آگے چلیے۔ کہانی ابھی ختم نہیں ہوئی۔ لالہ پچھمی چند کے کئی بیٹے تھے۔ بڑے ہونہار اور ہوشیار۔ پشاوری مل، سندھو رام، لاہوری مل اور بلوچ رائے۔ لالہ جی کا دیہانت ہوا تو یہ ٹانگ انہوں نے ورثے میں پائی۔ وہ گوروجی کی ٹانگ دباتے تھے لیکن کوئی ران کا حصّہ زیادہ دباتا تھا۔ کوئی پنڈلی پر زیادہ توجہ دیتا تھا۔ آخر ایک زبردست

جھگڑا ہوا۔ اور طے ہوا کہ ہم اپنا حصّہ الگ کرلیں گے۔ لالہ پوکومل نے کہا۔ ہاں۔ ہاں، ٹھیک کررہے ہو۔ میں بھی اپنے حصّے کی ٹانگ کاٹ کر لے جارہا ہوں۔ اب ان برخورداروں نے گنڈاسہ منگوایا۔ ایک نے ران سنبھالی بوری میں ڈالی۔ دوسرے نے پنڈلی لے لی تیسرے نے گھٹنا اٹھایا۔ چوتھے نے باقی کو سمیٹا اور گھر کی راہ لی اور اس کے بعد سبھی ہنسی خوشی زندگی بسر کرنے لگے۔

گُوروجی کا کیا ہوا؟ مرے یا جیے۔ جیے تو کتنے دن تک جیے۔ اس کا کہانی میں ذکر نہیں۔

☆☆☆

ایک تھا کچھوا۔ ایک تھا خرگوش۔ دونوں نے آپس میں دوڑ کی شرط لگائی۔ کوئی کچھوے سے پوچھے کہ تو نے کیوں لگائی؟ کیا سوچ کر لگائی۔ دنیا میں احمقوں کی کمی نہیں۔ ایک ڈھونڈو ہزار ملتے ہیں۔ طے یہ ہوا کہ دونوں میں سے جو نیم کے ٹیلے تک پہلے پہنچے، وہ میری سمجھا جائے۔ اسے اختیار ہے کہ ہارنے والے کے کان کاٹ لے۔ دوڑ شروع ہوئی۔ خرگوش تو یہ جا وہ جا پلک جھپکنے میں خاصی دور نکل گیا۔ میاں کچھوے وضع داری کی چال چلتے منزل کی طرف رواں ہوئے۔ تھوڑی دور پہنچے تو سوچا بہت چل لیے..... اب آرام بھی کرنا چاہیے۔ ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر اپنے شان دار ماضی کی یادوں میں کھو گئے۔ جب اس دُنیا میں کچھوے راج کیا کرتے تھے۔ سائنس اور فنونِ لطیفہ میں بھی ان کا بڑا نام تھا۔ یونہی سوچتے میں آنکھ لگ گئی۔ کیا دیکھتے ہیں کہ خود تو تختِ شاہی پر بیٹھے ہیں۔ باقی زمینی مخلوق شیر، چیتے، خرگوش، آدمی وغیرہ ہاتھ باندھے کھڑے ہیں یا فرشی سلام کررہے ہیں۔ آنکھ کھلی تو ابھی سستی باقی تھی۔ بولے ابھی کیا جلدی ہے۔ اس خرگوش کے بچے کی کیا اوقات ہے۔ میں بھی کتنے عظیم ورثے کا مالک ہوں۔ واہ بھئی واہ میرے کیا کہنے۔

جانے کتنا زمانہ سوئے رہے تھے جب جی بھر کے ستا لیے تو پھر ٹیلے کی طرف رواں ہوئے۔ وہاں پہنچے تو خرگوش کو نہ پایا۔ بہت خوش ہوئے اپنے کو داد دی کہ واہ رے مستعدی میں پہلے پہنچ گیا۔ بھلا کوئی میرا مقابلہ کرسکتا ہے۔؟

اتنے میں ان کی نظر خرگوش کے ایک پلّے پر پڑی جو ٹیلے کے دامن میں کھیل رہا تھا۔

کچھوے نے کہا۔''اے، برخوردار تو خرگوش خان کو جانتا ہے؟''

خرگوش کے بچے نے کہا۔''جی ہاں جانتا ہوں۔ میرے ابا حضور تھے۔ معلوم ہوتا ہے آپ وہ کچھوے میاں ہیں جنہوں نے باوا جان سے شرط لگائی تھی۔ وہ تو پانچ منٹ میں یہاں پہنچ گئے تھے۔ اس کے بعد مدّتوں آپ کا انتظار کرتے رہے آخر انتقال کر گئے۔ جاتے ہوئے وصیّت کر گئے تھے کہ کچھوے میاں آئیں تو ان کے کان کاٹ لینا۔ اب لائیے ادھر کان۔''

کچھوے نے اپنے کان اور سری خول کے اندر کر لی۔ آج تک چھپائے پھرتا ہے۔

☆☆☆

ایک کوّا روٹی کا ٹکڑا لیے ہوئے ایک درخت کی ٹہنی پر بیٹھا تھا۔ ایک لومڑی کا گزر ادھر سے ہوا۔ منہ میں پانی بھر آیا (لومڑی کے) سوچا کہ کوئی ایسی ترکیب کی جائے کہ یہ اپنی چونچ کھول دے اور یہ روٹی کا ٹکڑا میں جھپٹ لوں۔

پس اس نے مسکین صورت بنا کر اور منہ اوپر اٹھا کر کہا۔ کوّے میاں سلام! تیرے حُسن کی کیا تعریف کروں۔ کچھ کہتے ہوئے جی ڈرتا ہے۔ واہ وا دوا، چونچ بھی کالی، پر بھی کالے، آج کل تو دنیا کا مستقبل کالوں ہی کے ہاتھ میں ہے۔ افریقہ میں بھی بیداری کی لہر دوڑ گئی ہے۔ لیکن خیر، یہ سیاست کی باتیں ہیں۔ آمدم برسر مطلب میں نے تیرے گانے کی تعریف سنی ہے۔ تو اتنا خوب صورت ہے تو گاتا بھی اچھا ہوگا۔ مجھے گانا سننے کا شوق یہاں کھینچ لایا ہے۔ ہاں تو ایک آدھ ٹھمری ہو جائے۔''

کوّا پھولا نہ سمایا لیکن سیانے پن سے کام لیا۔ روٹی کا ٹکڑا منہ سے نکال کر پنجے میں تھاما اور لگا کائیں کائیں کرنے۔ بی لومڑی کا کام نہ بنا تو یہ کہتی ہوئی چل دی۔

''ہت تیرے کی۔ بے سُرا بھانڈ معلوم ہوتا ہے۔ تُو نے بھی حکایات لقمان پڑھ رکھی ہیں۔''

☆☆☆

ایک پیاسے کوّے کو ایک جگہ پانی کا مٹکا پڑا نظر آیا۔ بہت خوش ہوا لیکن یہ دیکھ کر مایوسی ہوئی کہ پانی بہت نیچے ہے۔ فقط مٹکے کی تہ میں تھوڑا سا ہے۔ سوال یہ تھا کہ پانی کو کیسے اوپر لائے اور اپنی چونچ تر کرے۔

اتفاق سے اس نے حکایات لقمان پڑھ رکھی تھیں۔ پاس ہی بہت سے کنکر پڑے تھے۔ اس نے اٹھا کر ایک ایک کنکر اس میں ڈالنا شروع کیا۔ کنکر ڈالتے ڈالتے صبح سے شام ہوگئی۔ پیاسا تو تھا ہی نڈھال ہوگیا۔ مٹکے کے اندر نظر ڈالی تو کیا دیکھتا ہے کہ کنکر ہی کنکر ہیں۔ سارا پانی کنکروں نے پی لیا ہے۔ بے اختیار اس کی زبان سے نکلا۔ ہت تیرے کی لقمان۔'' پھر بے سُدھ ہو کر زمین پر گر گیا اور مر گیا۔

اگر وہ کوّا کہیں سے ایک نلکی لے آتا تو مٹکے کے منہ پر بیٹھا بیٹھا پانی کو چوس لیتا۔ اپنے دل کی مُراد پاتا۔ ہرگز جان سے نہ جاتا۔

☆☆☆

سیٹھ حاتم طائی سے سیٹھ لٹھا بھائی ململ بھائی تک!

کل ہم نے ایک صاحب کو اپنے دروازے پر منڈلاتے دیکھا۔ ڈھیلی ڈھالی عبا زیب تن۔ سر پر عقال باندھے۔ کمر پر ہاتھ رکھے کراہتے۔ ہائے ہائے کرتے ہوئے۔

ہم نے کہا۔ ''کون ہو بھیا! سچ مچ کوئی چوٹ آئی ہے یا بھیک مانگنے کی صورت بنائی ہے۔ ہمارے پاس پیسے نہیں ہیں کسی کو فضول دینے کے لیے۔ آ جاتے ہیں لوگ عربوں کی سی وضع بنا کر۔''

بولے ''میرا نام حاتم ہے۔ شاید آپ نے سنا ہو۔''

ہم نے کہا ''ہاں ہاں سنا ہے بلکہ تمہیں دیکھا بھی ہے۔ اگر تم وہی آدمی ہو جس نے فلم حاتم میں صبیحہ کے ساتھ کام کیا ہے۔ اچھا کام تھا تمہارا۔ اک ذرا موٹے نظر آتے تھے۔''

کہنے لگے ''بخدا میں وہ نہیں ہوں۔ نہیں معلوم وہ موٹا مسٹنڈا کون ہے۔ میں تو حاتم طائی ہوں۔ قصے کہانیوں والا۔''

ہم نے کہا...... ''اچھا وہ شخص جس کی وجہ شہرت فضول خرچی ہے۔ حاتم سیٹھ تم اتنی سخاوت نہ دکھاتے تو یہ حال کیوں ہوتا۔ آج تمہاری ایک حاتم کاٹن مل ہوتی۔ ایک حاتم سلک مل ہوتی۔ حاتم جوٹ مل ہوتی۔ حاتم فرٹیلائز فیکٹری ہوتی اور ایک ......خیر اب کیا ہوا ہے تمہیں۔ منہ سے پھوٹو تو۔''

بولے ''کچھ لوگ رات بھر میری قبر پر لاتیں مارتے رہے۔ قبر کے ساتھ ہڈیاں بھی چکنا چور ہو گئیں۔ ہائے مر گیا۔''

''کون ظالم تھے وہ؟'' ہم نے کہا ''ذرا نام پتہ بتاؤ۔ تھانے میں ان کی رپورٹ کریں۔''

بولے ''آپ کے ملک کے کپڑا ملوں والے سیٹھ تھے۔ میری قبر پر لاتیں مارتے جا رہے تھے اور اعلان کر رہے تھے۔'' ہو گیا۔ ہو گیا خلقِ خدا کا بھلا ہو گیا۔ ڈھائی روپے تک کے کپڑے پر ڈھائی فی صد کمی۔ اُٹھو گر نہ حشر نہ ہو گا پھر کبھی۔ دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا۔''

ہم نے کہا ''یہ ڈھائی روپیہ کا ڈھائی فی صد کیا ہوا؟''

بولے۔ ''یہ تو مجھے بھی معلوم نہیں۔ لیکن بہت ہو گا۔''

ہم نے کہا ''ہاں ہمارا بھی یہی خیال ہے۔ اچھا کسی سے پوچھیں گے۔ کسی سے کیا خود سیٹھ صاحبان سے بات کریں گے۔ اتنے میں تو یہ چونیّ لے۔ کسی سے ہلدی چونا لے کر اپنی ہڈیوں پر لگا اور باقی پیسوں کی روٹی کھا۔ دیکھنا بھوکا مت رہنا۔''

حاتم نے دعا دی۔ ''سخی داتا کی خیر۔ اللہ زیادہ دے۔'' اس کے بعد ہائے ہائے کرتا، لنگڑاتا ایک طرف کو چلا گیا۔

(۲)

''سیٹھ لٹھا بھائی ململ بھائی دفتر میں تشریف رکھتے ہیں؟'' ہم نے ان کے منیم

صاحب سے پوچھا۔

''کیا مانگتا ہے؟'' منیم صاحب نے روکھے پن سے کہا۔ ''نوکری مانگتا ہے تو سیٹھ صاحب کے پاس کوئی نوکری نہیں۔ ہم نے پھٹا لکھ کر بھی لگا دیا ہے۔ یتیم خانے کے لیے چندہ مانگتا ہے۔ تو بھی معاف کر۔ سیٹھ صاحب آج کل خود یتیم ہو رہے ہیں۔''

ہم نے کہا۔ ''ہم یہ کچھ نہیں مانگتا بابا۔ انٹرویو مانگتا ہے اخبار کے لیے۔''

بولا۔ ''ہمارے سیٹھ کا فوٹو بھی چھاپے گا؟''

ہم نے کہا ''ضرور چھاپے گا۔ اس کا بھی چھاپے گا۔ تم کہو تو تمہارا بھی چھاپے گا۔''

بولا۔ ''ٹھیک ہے۔ ابھی ملائے دیتا ہوں۔''

سیٹھ صاحب ہمارے ملک کی مایہ ناز ہستی ہیں۔ ان کا نام اندرون ملک اور بیرون ملک مشہور ہے۔ انٹرپول والے تک ان کو جانتے ہیں۔

ان کے کئی مل ہیں۔ بنک ہے۔ بیمہ کمپنی ہے۔ کپڑا بھی بیچتے ہیں۔ لوہا بھی بیچتے ہیں گھی بھی بیچتے ہیں..... تیل بھی بیچتے ہیں۔ کھاد بھی بیچتے ہیں۔ ایمان بھی بیچتے ہیں۔ غرض یہ کہ کوئی چیز ایسی نہیں جو نہ بیچتے ہوں۔ کوئلے کی دلالی اس پر مستزاد۔ خوش اخلاق بھی بہت ہیں۔ اُٹھ کر مصافحہ کیا۔ بتیسی بھی نکالی۔ لیکن یہ دیکھ کر ہمارے ساتھ فوٹو گرافر نہیں ہے، جلدی سے سمیٹ لی۔

ہم نے کہا۔ ''سیٹھ جی۔ ہم ایک بات پوچھنے آئے تھے۔ یہ رہا ہمارا کارڈ۔''

بولے۔ ''ہاں ہاں پوچھو بھائی .... آپ بہت اچھا لکھتے ہیں۔ کمال کرتے ہیں (کارڈ پر نام پڑھنے کی کوشش کرتے ہوئے) کیا نام ہے آپ کا؟ ابن عیسیٰ۔ عیسیٰ صاحب میں تو ہر روج پڑھوا کر سنتا ہوں۔''

ہم نے کہا ''شکریہ یہ بتائیے کیا یہ سچ ہے کہ آپ نے ڈھائی روپے تک کے کپڑے پر ڈھائی فیصد دام کم کر دیے ہیں؟''

فرمایا ''ہاں ہاں۔ سارے اخباروں میں مسرّت سے اس کا اعلان بھی کر دیا ہے۔ یوں سمجھو ہم نے یہ قربانی کی ہے۔ گریب آدمیوں کے لیے۔''

ہم نے کہا ''ڈھائی روپے پر ڈھائی فیصد کیا بنا؟''

بولے۔ ''خود حساب کر لو۔ ایک روپے پر ڈھائی پیسے۔ ڈھائی روپے پر ایک آنہ یعنی جو کپڑا ڈھائی روپے کا تھا۔ اب دو روپے سات آنے کا ہو گا۔ جتنا جی چاہے لے لو۔ بابا۔ ہماری ٹیپ ٹاپ پر مت جاؤ۔ ہمارا دل گریب ہے۔ گریبوں کے ساتھ ہے پچھلے الیکشن میں بھی ہم نے یہی بات کہی تھی بلکہ کئی کئی ہجار روپے غریب ووٹروں میں بانٹ دیے تھے۔''

ہم نے کہا۔ ''اس میں کیا شک ہے لیکن سیٹھ صاحب ہم نے تو کوئی کپڑا بازار میں ڈھائی روپے سے کم دام کا نہیں دیکھا۔ آپ کون سا کپڑا ڈھائی سے کم کا بناتے ہیں؟''

انہوں نے پکار کہا ''منیم جی..... عیسیٰ صاحب کو بتاؤ ہم کون کون سا کپڑا ڈھائی روپے سے کم دام کا بناتے ہیں۔''

منیم صاحب نے کہا ''سیٹھ صاحب۔ آج کل تو کوئی ایسا کپڑا نہیں۔ ایک کھدّر ہوا کرتا تھا سوا دو روپے گز کا۔ وہ بھی کوئی چھ مہینے ہوئے پونے تین روپے گز کر دیا گیا۔''

بولے ''پونے تین روپے تو اس پر تو ہم کچھ گھٹا نہیں سکتے۔ مجبوری ہے۔ منیم جی اس سے کم کا کچھ نہ کچھ تو بنتا ہو گا۔ ہماری ڈھاکے والی فیکٹری میں کیا بنتا ہے؟''

''وہ تو ٹاٹ ہے حجورا'' منیم صاحب نے کہا۔

''وہ بھی تو کپڑا ہی ہوا۔'' سیٹھ صاحب بولے ''گرمیوں کے لیے بڑے کام کی چیز ہے۔''

ہم نے کہا ''جی ہاں۔ ہم اس سے بوریا بناتے ہیں۔ ہو خبر گرم ان کے آنے کی تو اسی کو بچھاتے ہیں۔''

''ان سے کیا مطلب آپ کا؟ مارشل لا والے تو نہیں؟'' سیٹھ جی نے سہم کر کہا۔ ''منیم جی وہ اپنا زرِ مبادلہ تو چھپا دیا۔''

''جی ہاں۔ چنتا نہ کیجیے۔'' منیم جی نے کہا ''آپ کی جانماز کے نیچے چھپا دیا ہے۔''

''آپ بھی لاتوں کے بھوت ہیں سیٹھ۔'' ہم نے آہستہ سے کہا۔

''کیا کہا عیسیٰ صاحب!'' سیٹھ صاحب بولے۔

''کچھ نہیں۔ لیکن سیٹھ جی ایک گز پر ایک آنہ؟ یہ تو کچھ بات نہ ہوئی۔ آپ بڑھاتے دس فیصدی، پچیس فیصدی، پچاس فیصدی کے حساب سے ہیں۔ گھٹاتے ہیں تو ڈھائی فیصدی۔ ہم پر یہ احسان جو نہ کرتے تو یہ احسان ہوتا۔''

''دیکھیے عیسیٰ صاحب۔'' سیٹھ صاحب سنجیدہ ہو کر بولے۔

''آپ کو یہ تھوڑا معلوم ہوتا ہے۔ حساب لگائیے۔ اگر کوئی گریب آدمی پانچ روپے کا کپڑا پاجامے کے لیے لیتا ہے تو اسے دو آنے بچیں گے۔ پورے دو آنے۔ اگر وہ سو روپے کا خریدے تو ڈھائی روپے کا سیدھا سیدھا فائدہ ہے۔ ہجار روپے کا خریدے تو پچیس روپے کا۔ پچیس روپے تھوڑی رقم نہیں ہوتی۔ کسی گریب آدمی سے بات کیجیے بہت کھس ہوگا وہ یہ سن کر۔''

ہم نے کہا ''بے شک۔ اب بات ہماری عقل میں آئی۔''

''اور یہ دیکھو۔ ہم نے قوم کی کھدمت کے لیے اپنے آپ اعلان کیا ہے۔ جب ہم خود ہی غریبوں کے لیے اتنا کچھ کرنے کو تیار ہیں تو لوگ سوشلزم کی بات کیوں کرتے ہیں عیسیٰ صاحب۔''

ہم نے کہا۔ ''یہ ہماری بھی سمجھ میں نہیں آتا۔''

''اور پھر سوشلزم اسلام کے کھلاف بھی تو ہے۔'' سیٹھ صاحب نے زور دے کر کہا۔

''ہاں سیٹھ۔'' ہم نے تائید کی ''جو چیز تیرے مفاد کے خلاف ہے وہ اسلام کے

خلاف ہو جاتی ہے۔ تُو اور اسلام ایک چیز ہوئے نا؟''

''کیا کہا عیسیٰ صاحب؟''

''کچھ نہیں۔ ہم اپنے آپ سے باتیں کر رہے تھے۔ اچھا خدا حافظ سیٹھ صاحب۔''

''ارے منیم جی۔'' سیٹھ صاحب پکارے۔ ''عیسیٰ صاحب کے لیے چائے لاؤ اور کھارا بسکٹ بھی۔ اور ہاں عیسیٰ صاحب۔ یہ فوٹو ہمارا چھاپے گا۔ ہمارے انٹرویو کے ساتھ۔ ذرا بڑا سا کر کے۔ ابھی کل ہی کھچوایا ہے۔''

(۳)

یہ ایک شخص تھا میلا سا تہمد باندھے۔ پھٹی ہوئی بنیان پہنے داڑھی بڑھی ہوئی۔ پاؤں سے ننگا۔

''ابے تُو کون ہے؟'' ہم نے للکار کر کہا۔

''جی میں ہوں غریب آدمی۔'' وہ مسکینی سے بولا۔

''کیا ثبوت ہے؟'' ہم نے پوچھا ''جیب کی تلاشی دو ہمیں۔''

''میری جیب ہی نہیں ہے حضور!''

''پھر ٹھیک ہے۔'' ہم نے کہا۔ ''اچھا انٹرویو دے۔''

بولا ''حضور! میرے پاس نہیں ہے۔ ہوتا تو ضرور دیتا۔''

''ابے انٹرویو کا مطلب نہیں جانتا؟'' ہم نے دھول جما کر کہا۔

''ہم سوال کریں گے۔ تو جواب دینا۔''

کچھ اس کا ضعف۔ کچھ ہمارا رعب۔ زمین پر بیٹھ گیا۔ اور بولا۔

''جی اچھا۔''

''تُو پاکستانی ہے؟''

''جی ہاں۔''

"ڈویلپمنٹ کا نام سنا ہے؟ G.N.P. کا مطلب جانتا ہے؟"

"جی نہیں۔"

"تو اپنا معیارِ زندگی کیوں نہیں بلند کرتا؟"

"حضور غلطی ہوئی۔ آئندہ کروں گا۔ آپ طریقہ بتا دیجیے۔"

"بچت کیا کر۔ بہت پیسے ہو جائیں گے تیرے پاس۔ بچّوں کو اچھے اسکولوں میں پڑھا۔ انہیں پھل اور انڈے التزام سے کھلا ٹیلیویژن دیکھا کر۔ آرٹ کونسل جایا کر تیرا ذہنی پس منظر وسیع ہوگا۔ تیری شخصیت میں گہرائی آئے گی۔"

کچھ نہیں بولا۔ بھونچکا بیٹھا ٹکر ٹکر دیکھتا رہا۔

ہم نے کہا۔ "اچھا یہ بتا تُو نے کپڑا سیٹھوں کا اعلان سُن لیا کہ ڈھائی روپے تک کے کپڑے پر ڈھائی فیصدی دام کم کر دیے گئے۔ اب تو تُو خوش ہے نا تیرے سارے دلدّر دھوئے گئے۔"

"کیا مطلب ہے جی اس کا؟"

ہم نے کہا "ارے گھامڑ۔ اگر تو سو روپے کا کپڑا خریدے تو ڈھائی روپے کی بچت۔"

"اگر ہزار روپے کا خریدے تو پچیس روپے کا فائدہ۔ لاکھ روپے کا خریدے تو........"

"لیکن جی میں یہ سو روپے اور ہجار روپے اور لاکھ روپے کہاں سے لاؤں گا؟"

"یہ سوچنا تیرا کام ہے۔" ہم نے کہا "ہم تو صرف یہ بتانے آئے تھے کہ ہمارے معاشرے کے ایک محبِّ وطن طبقے نے تری ہمدردی میں کتنا بڑا قدم اُٹھایا ہے اور یہ شان دار رعایتی اعلان رضا کارانہ طور پر کیا ہے۔ اپنے آپ کیا ہے۔"

بولا۔ "اپنے آپ کیا ہے جی؟"

ہم نے کہا "ہاں۔ اور وہ ہمارے شکریے کے مستحق ہیں۔"

"ایک کہانی سناؤں آپ کو؟" گریب آدمی کہنے لگا۔

"ابے تُو بھی کہانی سنانے لگا۔ نا بابا۔" ہم نے کہا۔

بولا۔ "جی کہانی نہیں، لطیفہ ہے چھوٹا سا۔ ایک غرض مند کسی سیٹھ کے پاس گیا اور مدد کا سوال کیا۔ سیٹھ صاحب نے اپنی نورانی داڑھی پر ایک بار ہاتھ پھیرا اور کہا "بابا۔ جا تیری قسمت میں کچھ نہیں۔"

سائل نے کہا۔ "کیا مطلب سیٹھ جی؟"

بولے۔ "ہمارا دستور ہے کہ کوئی سائل سوال کرے تو اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہیں۔ جتنے بال ٹوٹ کر ہاتھ میں آئیں اتنے روپے سائل کو عنایت کرتے ہیں۔ اتفاق سے اس وقت کوئی بال ہمارے ہاتھ میں نہیں آیا۔"

سائل بولا۔ "اجازت ہو تو کچھ عرض کروں۔"

سیٹھ صاحب نے بڑی مہربانی سے کہا۔ "ہاں ہاں کہو۔"

بولا۔ "حضور! انصاف یہ ہے کہ داڑھی آپ کی ہو اور ہاتھ میرا پھر کوئی بال ہاتھ میں نہ آئے تو البتہ......"

ہم نے طیش میں آ کر کہا۔ "ابے ناشکرے۔ کنگلے۔ کوئی تیرے لیے اپنا گھر لُٹا دے ڈھائی فیصد تھوڑا ہوتا ہے۔ آخر سیٹھوں کی اپنی بھی ضرورتیں ہوتی ہیں۔ کوٹھیاں، کاریں، کلب۔ کُتّے۔"

وہ کچھ کہنے کو تھا کہ ہم نے ایک لات کس کر جمائی۔ "چل بھاگ تو اپنا معیارِ زندگی کبھی بلند نہیں کرے گا۔ تیری وجہ سے ہمارا سارا بین الاقوامی رعب غارت ہو گیا۔"

(۶۹ء میں لکھا گیا)

☆☆☆

کیسنجر کی واپسی

ہمارے دوست مرزا جمیل الدّین عالؔی میں خدا نے کام کرنے کی قوت وصلاحیت بے پناہ رکھی ہے اتنی کہ ایک آدھ مصروفیت یا فقط کارِ منصبی سے اس کا ازالہ نہیں ہوسکتا۔ ایک طرف وہ بینک کے اعلیٰ عہدے دار ہیں۔ دوسری طرف انجمن ترقی اردو کے اعزازی سیکرٹری۔ ایک مدّت تک یہ پاکستان رائٹرز گلڈ کے سیکرٹری جنرل رہے۔ ہاں اردو کالج کی زمام کار بھی ان کے ہاتھ میں تھی۔ اس زمانے میں معلوم ہوا کہ انجمن باشندگان لوہارد کے بھی وہ نائب صدر ہیں۔ ایک ہاؤسنگ سوسائٹی کے خازن بھی تھے۔ ان تمام اداروں کے معاملے ان کے پاس آتے تھے۔ ایک ہی میز پر آتے تھے اور وہ بحسن وجوہ ان سے عہدہ برآ ہوتے تھے لیکن بندۂ بشر ہے۔ ایک بار ہم نے دیکھا کہ رائٹرز گلڈ کی فائل پر سفارش لکھی آئی ہے کہ چار سو گز کے سارے پلاٹوں کی الاٹمنٹ منسوخ کردی جائے۔ ہم حیران ہو رہے تھے کہ یہ کام کیسے کریں کہ ہاؤسنگ سوسائٹی کا کارندہ فائل لے آیا۔ کہا صاحب آپ نے کیا لکھ دیا ہے کہ اردو کے ادیبوں کی نگارشات کے ترجمے دوسرے ملکوں میں شائع کیے جائیں گے۔ آخر اس فائل کا نوٹ اس فائل پر اور اس فائل کا اس پر منتقل کیا گیا۔ ایک بار انجمن کی فائل پر انہوں نے لکھ دیا تھا کہ ملتان میں بینک کی دو برانچیں اور کھول دی جائیں اور بینک کی فائل پر لکھا تھا کہ مثنوی کدم راؤ پدم راؤ کی اشاعت کا جلد بندوبست کیا جائے۔

☆☆☆

کل اخبار میں ایک اور جمیل الدین عالؔی کا ذکر پڑھا جس کا نام ہنری کیسنجر ہے اور ان کے پاؤں کی گردش کا آپ پڑھتے ہی رہتے ہیں کہ آج کہیں۔ کل کہیں، صبح کہیں شام کہیں۔ بے شک سفر کرنے میں ہمارے ساتھ بھی ایسا ہوتا ہے کہ جاپان میں ہانگ کانگ کے سکّے چلانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور ہانگ کانگ میں بنکاک والے ہوٹل کے کمرے کی چابی مانگتے ہیں۔ اور کوریا میں شکریہ جاپانی زبان میں ادا کرتے ہیں۔ لیکن کیسنجر کی کہانی زیادہ دلچسپ ہے۔ کیسنجر کی کہانی آرٹ بخوالڈ کی زبانی۔

☆☆☆

جب ہنری کیسنجر مختلف ملکوں کے دورے ختم کرکے واشنگٹن میں صدر فورڈ کے پاس گئے تو انہوں نے پوچھا۔

''میاں کیسنجر! کیسا رہا تمہارا دورہ؟''

''بہت اچھا رہا' مسٹر پریذیڈنٹ!'' کیسنجر نے کہا۔ ''میں جہاں گیا لوگوں کو اپنے ڈھب پر لے آیا۔ اپنی بات منوا کر اٹھا۔ مثلاً میں نے اندرا گاندھی کو اس بات پر راضی کرلیا کہ وہ اپنے تیل کی قیمت دس ڈالر فی بیرل کم کردیں۔''

''لیکن ہنری! ہندوستان تو تیل برآمد کرتا ہی نہیں۔

اس کے ہاں تو تیل ہوتا ہی نہیں۔''

''اچھا؟ یہ بات ہے تبھی میں کہوں کہ مسز گاندھی نے اتنی جلدی کیسے میری درخواست پر صاد کردیا۔''

''اچھا تو روس میں بات چیت کیسی رہی؟''

''بہت اچھی رہی۔ ہم مسٹر برزنیف کو ایک اٹامک انرجی پلانٹ دے رہے ہیں۔''

''ہیں؟ روس کو ایک انرجی پلانٹ؟ آپ کو تو ان سے یہ کہنا تھا کہ اپنے جوہری ہتھیاروں میں کمی کریں۔''

''لیکن یہ بات تو میں نے بنگلہ دیش سے منوالی ہے۔ مسٹر پریذیڈنٹ کہ جوہری

ہتھیار بنانا کم کر دیں۔ انہوں نے وعدہ بھی کر لیا ہے کہ وہ امریکہ کی خواہش کے احترام میں اس سال ایٹم بموں کی تیاری روک دیں گے۔"

"بنگلہ دیش ہتھیار بنائے نہ بنائے، اس سے ہمیں کچھ واسطہ نہیں۔ اور بات بتاؤ ہنری؟"

"مسٹر پریذیڈنٹ کیا عرض کروں۔ صبح کہیں ہوتا تھا شام کہیں۔ ایک ٹانگ یہاں دوسری ٹانگ وہاں۔ اس میں گڑبڑ ہوگئی۔ وہ اٹامک انرجی پلانٹ مجھے کس کو دینا تھا بھلا؟"

"مصر کے صدر سادات کو۔"

"بے شک اب یاد آیا۔ میں نے اس کے بجائے سادات سے یہ دریافت کیا کہ کیا ہم اسرائیل کو فوجی رسد بھیجنے کے لیے آپ کے ہوائی اڈے استعمال کر سکتے ہیں۔"

"یہ بات تو ہنری تمہیں پرتگال سے کہنی تھی۔"

"بے شک، میں بھی کتنا بدھو ہوں۔"

"تم نے پرتگال سے کیا کہا؟"

"پرتگال سے میں نے یہ فرمائش کی کہ وہ صحرائے سینائی کو خالی کر دے اور دریائے اُردن کے مغربی کنارے سے بھی فوجیں واپس بُلا لے۔"

"پرتگال نے کیا جواب دیا ہنری؟"

"انہوں نے کہا بسر و چشم۔"

"ہنری! میں تمہیں کیسے یاد دلاؤں کہ پُرتگال نے سینائی پر قبضہ نہیں کر رکھا۔ وہ تو موزمبیق پر قابض ہے۔"

"عجیب بات ہے میں نے موزمبیق کو خالی کرنے کی فرمائش اسرائیل سے کر ڈالی۔"

"اس کا ردِ عمل اس پر کیا تھا؟"

"انہوں نے بھی یہی کہا۔ ہاں ہاں ضرور ضرور۔"

"ہنری! معلوم ہوتا ہے تم تھک گئے ہو تمہارے اعصاب جواب دے گئے ہیں۔"

"جی ہاں، تھک تو واقعی گیا ہوں۔ لیکن دورہ کامیاب تھا۔ ہم نے شاہ ایران کو بیس کروڑ بشل گیہوں دینے کی پیش کش کر دی ہے۔"

"ایران کو بیس کروڑ بشل گیہوں۔"

"جی ہاں ہمارے امدادی پروگرام کے تحت۔"

"لیکن ہنری یہ سوچو کہ ایران کی کمائی تیل سے اتنی ہے کہ اس کے پاس ہم سے زیادہ ڈالر ہیں۔"

"میں سمجھا، ڈالروں کی یہ بہتات اٹلی کے ہاں ہے۔"

"پاگل ہو گئے ہو؟ اٹلی تو بالکل کنگال ہے۔ ہنری! تمہیں یہ گیہوں کا وعدہ اٹلی سے کرنا تھا۔"

"بڑی چوک ہوگئی۔ دراصل اٹلی اور ایران کے نام ایک دوسرے سے اتنے ملتے جلتے ہیں کہ میں گڑبڑا جاتا ہوں۔"

"اصل میں غلطی میری ہے۔ ہنری! مجھے تم کو ایک ساتھ اتنے سارے ملکوں میں نہیں بھیجنا چاہیے تھا۔ آدمی واقعی بوکھلا جاتا ہے۔ تم پاپائے روم سے بھی ملے؟"

"جی ہاں، ملا۔ انہوں نے مجھے شرفِ باریابی بخشا۔ میں نے انہیں آپ کا پیغام بھی دے دیا۔"

"کون سا پیغام بھلا؟"

"یہی کہ وہ امریکا سے نئے لڑاکے ہوائی جہازوں کے بارہ سکویڈرن خریدیں۔"

"خوب! اچھا میں تم سے آخری سوال کرتا ہوں۔ اگر تم نے پوپ سے لڑاکا جہازوں کے سکویڈرن خریدنے کی فرمائش کی ہے تو ہمارے لیے دعا کرنے کو کس سے کہا؟"

"یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے؟ شاہ فیصل سے۔"

(یہ کالم انشا جی نے جنوری ۱۹۷۵ء میں لکھا تھا)۔

خطبۂ صدارت حضرت ابنِ انشاء

پچھلے دنوں ایک کتاب چھپی ہے۔ ''چلتے ہو تو چین کو چلیے'' اس کے فاضل مصنف کا کیا عمدہ قول ہے کہ انسان کی صحیح قدر اس کے وطن سے باہر ہی ہوتی ہے جہاں اس کی اصلیت جاننے والا کوئی نہیں ہوتا۔ سفر وسیلۃ الظفر کا مطلب بھی شاید یہی ہے۔ ان صاحب کا جب چین میں تعارف کرایا گیا کہ یہ اپنے ملک کے نامی گرامی ناول نویس ہیں اور فسانہ آزاد، گئودان، آگ کا دریا، خدا کی بستی اور آنگن وغیرہ انھی کی تصانیف ہیں تو یہ ہر چند کہ ناول لکھنا پڑھنا بھی نہ جانتے تھے۔ فرط عجز وانکسار سے دہرے ہو گئے۔ کسی بات کی تردید کرنا خلافِ آداب جانا۔ ایک اور صاحب کسی کاروبار کے سلسلے میں کسی باہر کے ملک میں گئے اور ملک الشعرا ہو کر واپس آئے۔ آقائے حاجی بابا اصفہانی بھی اصفہانِ آنا خلافِ مصلحت جانتے تھے۔ استنبول میں تو یہ ایک رئیس کے داماد ہو کر ٹھاٹ دکھاتے تھے۔ لیکن وطن آتے تھے تو پرانے گاہک بجائے سر آنکھوں پر بٹھانے کے یہی فرمائش کرتے تھے کہ خلیفہ ذرا میرا سر تو مونڈ دیجیو اور ہاں ڈاڑھی بھی تراش دیجیو۔ اللہ بخشے تمہارے باپ کا سا خط بنانے والا اب سارے اصفہان میں کوئی نہیں رہا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ استنبول کی آب وہوا کی تعریف کیا کرتے تھے اور جب تک

زندہ رہے وہیں قیام کرنا پسند کیا۔

مقصود اس قصّے کا یہ ہے کہ ہمارا اپنے ہی شہر اور اپنے ہی پرانے کالج میں مہمان خصوصی بن کر آنا ایک طرح کی سنگین غلطی بلکہ غلط کاری ثابت ہوتا۔ لیکن ہم نے اطمینان کر لیا ہے کہ ہمارے زمانے کے اساتذہ میں سے کوئی کالج میں بچا ہے تو مروّت کے مارے ہماری کسی بات پر یہ نہ کہے گا کہ ہماری بلّی ہم ہی کو میاؤں۔

صاحبو! ویسے تو ہم آہیں بھر بھر کر اپنے ماضی کی عظمت کی جو جو داستانیں چاہیں بیان کریں لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ اس درس گاہ کے برآمدوں میں دو برس جوتیاں چٹخاتے ہوئے ہم نے نہ کچھ کھویا، سوائے عزتِ سادات کے۔ اور نہ کچھ پایا سوائے ڈگری کے۔ ہماری کلاسیں ایک طرح سے تعلیم بالغاں کی کلاسیں تھیں۔ ہمارے اساتذہ نے ہمارا عیب وثواب اور نفع نقصان ہم ہی پر چھوڑ رکھا تھا کیونکہ ہمارے ہم سبقوں میں ایک دو تو شاید صاحبِ اولاد بھی تھے۔

ان اساتذہ کے علم وفضل میں کلام نہیں۔ لیکن ان کا فیضِ صحبت ہمارا کچھ بگاڑ نہ سکا۔ ہم جیسے چھلے چھلائے اور دُھلے دُھلائے آئے تھے ویسے ہی واپس آ گئے۔

ایک زمانہ تھا کہ ہم قطب بنے اپنے گھر میں بیٹھے رہتے تھے اور ہمارا ستارہ گردش میں رہا کرتا تھا۔ پھر خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ ہم خود گردش میں رہنے لگے اور ہمارے ستارے نے کراچی میں بیٹھے بیٹھے آب وتاب سے چمکنا شروع کر دیا۔ پھر اخبار جنگ میں ''آج کا شاعر'' کے عنوان سے ہماری تصویر اور حالات چھپے۔ چونکہ حالات ہمارے کم تھے لہٰذا ان لوگوں کو تصویر بڑی کرا کے چھاپنی پڑی اور قبول صورت سلیقہ شعار، پابند صوم وصلوٰۃ اولادوں کے والدین نے ہماری نوکری، تنخواہ اور چال چلن کے متعلق معلومات جمع کرنی شروع کر دیں۔ یوں عیب بینوں اور نکتہ چینیوں سے بھی دنیا خالی نہیں۔ کسی نے کہا یہ شاعر تو ہیں لیکن آج کے نہیں۔ کوئی بے درد بولا۔ یہ آج کے تو

ہیں لیکن شاعر نہیں۔ ہم بددل ہو کر اپنے عزیز دوست جمیل الدین عالی کے پاس گئے
انہوں نے ہماری ڈھارس بندھائی اور کہا دل میلا مت کرو۔ یہ دونوں فریق غلطی پر ہیں
۔ہم تو نہ تمہیں شاعر جانتے ہیں نہ آج کا مانتے ہیں۔ ہم نے کسمسا کر کہا۔ یہ آپ کیا
فرما رہے ہیں؟ بولے میں جھوٹ نہیں کہتا اور یہ رائے میری تھوڑی ہے سبھی سمجھ دار
لوگوں کی ہے۔

☆☆☆

ابن انشاء یہ نام ہم نے نہ جانے کب رکھا تھا اور کیوں رکھا تھا کی توجیہ تو یہ ہو سکتی ہے
کہ ہمارے اصلی نام میں ایک چوپائے کا نام شامل ہے۔ نیا نام رکھنے کا فائدہ یہ ہوا کہ
لوگ سیّد انشاء اللہ خاں انشا کی رعایت سے ہمیں بھی سیّد لکھنے لگے۔ یعنی گھر بیٹھے
ہماری ترقی ہو گئی۔ اسی نسبت سے دلّی والوں نے ہمیں اپنا ہم وطن جان کر ہماری زبان
پر کم اعتراض کیے اور دلّی مرکنٹائل ہاؤسنگ سوسائٹی والوں نے ایک پُر فضا پلاٹ کی
ہمیں پیش کش کی۔ لکھنؤ والوں نے البتہ ہماری زبان کے نقائص کے لیے اسی کو بہانہ
بنالیا کہ ہاں دلّی والے ایسی ہی زبان لکھا کرتے ہیں۔ پھر ایک روز ایسا ہوا کہ ایک
صاحب نے آ کر ہمارا ہاتھ ادب سے چُوما اور کہا۔ واللہ آپ تو چھپے رستم نکلے۔ آپ کا
کلام پڑھا اور جی خوش ہوا۔ ہم نے انکسار برتا کہ ہاں کچھ ٹوٹا پھوٹا کہہ لیتے ہیں۔ آپ
نے کون سی غزل دیکھی ہماری۔ حافظے پر زور ڈال کر بولے ’’کچھ اس قسم کی ہے، کمر
باندھے ہوئے چلنے کو یہاں سب یار بیٹھے ہیں۔‘‘ ہم نے کہا۔ ’’کہاں پڑھی ہے۔؟‘‘
بولے۔ ’’مولوی محمد حسین آزاد کی آبِ حیات میں منقول ہے۔‘‘

☆☆☆

جنگ میں ’’آج کا شاعر‘‘ کے ضمن میں خواتین کے بھیجے ہوئے پسندیدہ اشعار بھی
چھپا کرتے ہیں۔ ایڈیٹر صاحبہ نے ہمیں فون کیا کہ ذرا چیک کر کے بتائیے۔ یہ سارے

اشعار آپ کے ہیں؟ بعض اوقات بیبیاں مختلف شاعروں کے اشعار کو خلط ملط بھی
کر دیتی ہیں۔ ہم نے کہا سنائیے۔ ان میں بھی پہلا شعر جو کوئی دس خواتین کی پسند تھا۔
یہی تھا۔ ع۔ کمر باندھے ہوئے.... یہ غزل ہمیں ہمیشہ سے پسند رہی ہے۔ لہٰذا ہم نے
ایڈیٹر صاحبہ سے کہا کہ کسی کا دل توڑنے کی ضرورت نہیں۔ اگر کسی کو ہمارا یہی شعر پسند
ہے تو خیر چھاپ دیجیے۔ دوسرا شعر بھی اسی غزل کا تھا۔

بھلا گردش فلک کی چین دیتی ہے کسے انشاء
غنیمت ہے کہ ہم صورت یہاں دو چار بیٹھے ہیں

ہم نے کھنکار کر کہا۔ خیر یہ بھی ٹھیک ہے آگے چلیے اس سے اگلا شعر تھا۔

یاد آتا ہے وہ حرفوں کا اٹھانا اب تک
جیم کے پیٹ میں اک لفظ ہے سوخالی ہے

ہم نے کہا۔ ہمیں یاد نہیں پڑتا کہ یہ شعر ہمارا ہو۔ مشتبہ بات ہے اسے کاٹ دیجیے
اس کے بعد نوبت ان شعروں پر پہنچی۔

کہیں بچھڑا ہوا دیکھا جو اک سُرخاب کا جوڑا
تو ڈھاریں مار کر رویا بطِ گرداب کا جوڑا
لگی غُلیل سے ابرُو کی، دل کے داغ کو چوٹ
پر ایسی ہے کہ لگے تڑسے جیسے زاغ کو چوٹ

☆☆☆

شوق سے تو ہاتھ کو میرے مروڑ
میں ترا پنجہ مروڑوں کس طرح

☆☆☆

سوئی میں اونٹ کیسے ڈالا جائے

ہم قارئین کرام کے اصرار پر خانہ داری کے کچھ چٹکلے درج کرتے ہیں۔ امید ہے قارئین انہیں مفید پائیں گی اور ہمیں دعائے خیر سے یاد کریں گی۔

سوئی میں دھاگا ڈالنا

یہ کام بہ ظاہر مشکل معلوم ہوگا لیکن اگر ذرا توجہ سے اِس کی ترکیب کو ذہن نشین کر لیا جائے تو کوئی دقت پیش نہ آئے گی۔ سب سے پہلے ایک سوئی لیجیے۔ لے لی، اَب دھاگا لیجیے، اور اب وہ دھاگا اس میں ڈال دیجیے۔ بس اتنی سی بات ہے۔ احتیاط صرف اتنی لازم ہے کہ سوئی کے دوسرے ہوتے ہیں ایک نوک دوسرا ناکا۔ بعض لوگ نوک کی طرف سے ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں کبھی کبھی اس میں کامیابی بھی ہو جاتی ہے۔ لیکن یہ طریقہ غلط ہے صحیح طریقہ یہ ہے کہ ناکے میں دھاگا ڈالا جائے۔

پرانی کتابوں میں آیا ہے کہ اُونٹ کو سوئی کے ناکے میں سے گزارنا آسان ہے بہ نسبت اس کے کہ کنجوس آدمی جنت میں جائے۔ اس آخر الذکر کی بات کی ہم نے کبھی کوشش نہیں کی، حالانکہ یہ لوگ کسی صورت جنت میں چلے جاتے تو وہاں جہاں لوگوں کے گمان کے مطابق ہمارا قیام ہوگا۔ قدرے امن رہتا۔ اب رہا اونٹ کو سوئی کے ناکے

میں سے گزارنا جسے آسان بتایا جاتا ہے۔ ہمیں اعتراف ہے کہ ابھی تک ہمیں اس میں کامیابی نہیں ہوئی۔ سچ یہ ہے کہ ابھی تک ایسا اونٹ ہمیں کوئی نہیں ملا جو اس بات پر آمادہ ہو۔ جب کہ ایسے کنجوس بے شمار مل جائیں گے جو جنت میں جانے کے لیے تیار بلکہ بے تاب ہوں گے۔ ہماری ناکامی کا مطلب یہ نہیں کہ ہم مایوس ہو گئے۔ ایک طرف ہم اپنے مطلب کے اونٹ کی تلاش میں ہیں۔ دوسری طرف ایسی سوئی کی جستجو جاری ہے جس کا ناکا اتنا بڑا ہو جس میں سے یہ حیوان شریف ہنستا کھیلتا گزر سکے۔ ہمارے قارئین میں سے کسی صاحب یا صاحبہ کے پاس ایسی سوئی ہو تو عاریتاً دے کر ممنون فرمائیں تجربے کے بعد واپس کر دی جائے گی۔

بٹن ٹانکنا

بٹن کئی طرح کے ہوتے ہیں۔ مثلاً کرتے کا بٹن، پتلون کا بٹن، سیپ کا بٹن، ہاتھی دانت کا بٹن، بجلی کا بٹن وغیرہ۔ بعض خاص قسم کی آنکھوں کو بھی جن کے بنانے میں کارکنانِ قضا وقدرت نے فیاضی سے مسالا استعمال نہ کیا ہو، بٹن کا نام دے دیتے ہیں لیکن یہاں ہمیں اس قسم کے بٹنوں سے کوئی سروکار نہیں۔ ان کا لگانا صرف قضا وقدرت کے درزیوں کو آتا ہے۔ بجلی کے بٹن لگانے کے لیے بھی الیکٹریشن کے لائسنس کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہاں ہماری غرض عام قسم کے بٹنوں سے ہے جنہیں آپ بھی تھوڑی کوشش کر کے لگا سکتی ہیں۔ کوئی لائسنس وغیرہ کا جھنجٹ بھی اس میں نہیں۔

اس کے لیے سامان بھی معمولی درکار ہے۔ سوئی' دھاگا بٹن اور دانت۔ ان کے علاوہ کپڑا بھی کیونکہ بٹن بالعموم کپڑے پر ٹانکے جاتے ہیں لکڑی یا لوہے پر یا خلا میں نہیں۔ سوئی میں دھاگا ڈالنے کی ترکیب ہم لکھ ہی چکے ہیں۔ اب سوئی کو بٹن کے

سوراخ میں سے گزارنا رہ جاتا ہے جو آپ کسی سے بھی سیکھ سکتی ہیں۔ اب بٹن لگ گیا تو فالتو دھاگا دانتوں سے کاٹ ڈالیے۔ یاد رہے کہ اس کے لیے اصلی دانت درکار ہیں۔ مصنوعی دانتوں سے کوشش کرنے میں ہم نے دیکھا ہے کہ کبھی کبھی دانت دھاگے کے ساتھ چلے جاتے ہیں۔

بٹن لگانے سے زیادہ مشکل کام بٹن توڑنا ہے۔ اور یہ ایک طرح سے دھوبیوں کا کاروباری راز ہے۔ ہم نے گھر پر کپڑے دھلوا کر اور پٹخوا کر دیکھا لیکن کبھی اس میں کامیابی نہ ہوئی جب کہ ہمارا دھوبی انہی پیسوں میں جو ہم دھلائی کے دیتے ہیں' پورے بٹن بھی صاف کر لاتا ہے، اس کے لیے الگ کچھ چارج نہیں کرتا۔ ایک اور آسانی جو اس نے اپنے سرپرستوں کے لیے فراہم کی ہے وہ یہ ہے کہ اپنے چھوٹے بیٹے کو اپنی لانڈری کے ایک حصے میں بٹنوں کی دکان کھلوادی ہے جہاں ہر طرح کے بٹن بارعایت نرخوں پر دستیاب ہیں۔

داغ دھبے مٹانا

اس کے لیے پہلی ضروری شرط داغ دھبے ڈالنا ہے کیونکہ دھبے نہیں ہوں گے تو آپ مٹائیں گے کیا۔ پہلے فیصلہ کیجیے کہ آپ کس قسم کے دھبے مٹانا چاہتے ہیں۔ سیاہی کے؟ اِس کے لیے فونٹن پین کو قمیص پر ایک دوبار چھڑکنا کافی ہے۔ آج کل آموں کا موسم ہے۔ ان کا رس بھی پتلون پر گرایا جاسکتا ہے۔ پان کے داغ زیادہ پائیدار ہوتے ہیں ان کے لیے کسی اسپتال یا سینما کی سیڑھیوں میں چند منٹ کھڑے ہونا کافی ہے۔ تارکول کے داغ بھی آج کل مفت ہیں کیونکہ کے ڈی اے نے جو رفاہ عامہ کا ایک محکمہ ہے جابجا تارکول کے ڈرم کھڑے کر رکھے ہیں اور کڑھاؤ چڑھا رکھے ہیں۔

اِن داغوں کے مٹانے پر زیادہ خرچ بھی نہیں اٹھتا فقط تین روپے۔ یہ ہماری تالیف

کردہ کتاب ''داغ ہائے معلیٰ'' کی قیمت ہے بلکہ اس کی پانچ جلدیں اکٹھی منگائی جائیں تو لنڈا بازار اور بوتل والی گلی کے دکاندار جو ہمارے سول ایجنٹ ہیں تول کر بھی ڈیڑھ روپے فی سیر کے حساب سے دے دیتے ہیں۔ داغ ربائے معلیٰ' عجیب سا نام ہوگا لیکن یہ تاریخی نام ہے جس سے ۱۳۸۹ھ برآمد ہوتے ہیں۔ آج کل ۱۳۸۶ھ چل رہا ہے اس کو ہماری کتاب کا آئندہ ایڈیشن سمجھا جائے۔

خالی وقت کیسے گزارا جائے

ایک مشہور مثل ہے کہ اچھی بات جہاں سے بھی ملے اخذ کر لینی چاہیئے۔ سو اس باب میں ہم اپنے ایک انگریزی ہفتہ وار معاصر کے صفحہ خواتین سے بھی مدد لے رہے ہیں۔ فاضل مصنف یا مصنفہ نے دفع الوقتی کے لیے کوئی بے کار قسم کا مشغلہ تجویز نہیں کیا جیسا کہ بعض لوگ قصہ خوانی' کشیدہ کاری یا بچوں کو آموختہ یاد کرانے وغیرہ کا مشورہ دیتے ہیں جس میں قطعاً کوئی فائدے یا یافت کا پہلو نہیں بلکہ لکھا ہے کہ برج' رمی یا ماہجونگ وغیرہ کھیلنے کی عادت ڈالیے۔ پرانے خیال کے لوگ رشک وحسد کے مارے ان کھیلوں پر ناک بھوں چڑھائیں گے اور ممکن ہے اس کو جوا وغیرہ بھی قرار دیں۔ لیکن ان کی پروا نہ کرنی چاہیئے۔ فاضل مصنف یا مصنفہ نے لکھا ہے کہ تاش کی بازی پر پیسے ضرور لگا کے کھیلیئے لیکن زیادہ نہیں تھوڑے اس سے واضح ہوگا کہ جوا صرف وہ ہوتا ہے جس میں زیادہ پیسے لگا کر کھیلا جائے۔ اس مضمون میں ایک اور احتیاط کی تلقین کی گئی ہے۔ لکھا ہے کہ ایسا بھی نہ ہو کہ ادھر میاں نے دفتر جانے کے لیے گھر سے باہر قدم رکھا اور اُدھر بیگم صاحبہ رمی کھیلنے پڑوسن کے ہاں چلی گئیں اور پھر میاں کی واپسی کے بعد گھر تشریف لائیں۔ گویا صرف آٹھ سات گھنٹے کھیلنا کافی ہے۔ میاں کے دفتر سے آنے کے وقت کا اندازہ کر لیا جائے اور جو دس بیس روپے جیتے ہوں اس پر اکتفا کر کے اس

وقت تک ضرور واپس آ جانا چاہیے۔

جو خواتین زیادہ بڑی بازی لگاتی ہیں یا میاں کی واپسی کے بعد گھر آتی ہیں ان کے متعلق بھی اس مضمون میں لکھا ہے کہ وہ نکتہ چینی سے زیادہ ہمدردی کی مستحق ہیں کیا عجب ان کے جی کو کیا روگ لگا ہے جس کے فرار کے طور پر وہ شرطیں باندھ کے اور یوں جم کے رمی یا برج کھیلتی ہیں۔

ایک صاحبہ نے دفع الوقتی کے لیے ایک جانور پالنے کا شغل اختیار کیا ہے۔ انہوں نے دو خرگوش پانچ چوہے‘ دو بلیاں ایک کتا‘ دس تیتر اور دو طوطے پالے تھے جن میں سے ایک بولتا بھی ہے۔ اب ان میں سے صرف چڑیاں اور دونوں طوطے رہ گئے ہیں کیونکہ چوہوں کو بلیاں پہلے ہی روز نوش جان کر گئی تھیں اور کتے کو ناشتا دینے میں دیر ہوئی تو اس نے پچھلے منگل کو خرگوش کا صفایا کر دیا۔ یہ خیال بھی نہ کیا کہ اس روز گوشت کا ناغہ ہوتا ہے۔ بلی کو گھر سے بھگانے میں بھی اس ذاتِ شریف کا ہاتھ بتایا جاتا ہے۔ لیکن اب اس امر پر بحث فضول ہے کیونکہ کمیٹی والے اسے پکڑ کر لے جا چکے ہیں۔ ہم نے موصوفہ کو کئی بار تیتر کے گوشت کے فضائل پر لیکچر دیے ہیں کہ مزیدار ہوتا ہے اور خون صالح پیدا کرتا ہے۔ ان کے باورچی نے بھی ہماری بات کی بارہا تائید کی ہے لیکن وہ ابھی تک متامل ہیں۔ اس وقت ان کی توجہ طوطے کو پڑھانے پر ہے۔ وہ تو حیوان کا حیوان ہی رہا لیکن موصوفہ کو بولتا سنتے ہیں تو کئی بار شبہ ہوتا ہے کہ میاں مٹھو بول رہا ہے۔

☆☆☆

رامائن اور مہابھارت

رامائن رام چندر جی کی کہانی ہے۔ یہ راجہ دسرتھ کے پرنس آف ویلز تھے۔ لیکن ان کی سوتیلی ماں کیکئی اپنے بیٹے بھرت کو راجا بنانا چاہتی تھی۔ اس کے بہکانے پر راجا دسرتھ نے رام چندر جی کو چودہ برس کے لیے گھر سے نکال دیا۔ ان کی رانی سیتا کو بھی۔ ان کے بھائی لچھمن بھی ساتھ ہو لیے۔ بن باس کے لیے نکلتے وقت رام چندر جی کے پاس کچھ بھی نہ تھا۔ بس ایک کھڑاؤں تھی۔ وہ بھی بھرت نے رکھوالی کہ آپ کی نشانی ہمارے پاس رہنی چاہیے۔ اس کھڑاؤں کو بھرت تخت کے پاس بلکہ اُوپر رکھتا تھا تاکہ رام چندر جی کا کوئی آدمی چُرا کے نہ لے جائے۔

جنگل میں رہنے کی وجہ سے ان کو گزارے میں چنداں تکلیف نہ ہوتی تھی۔ رام جی تو آخر رام جی تھے زیادہ کام ان کا لکشمن یعنی برادر خورد کیا کرتے تھے۔

یہ لوگ گن گن کر دن گزار رہے تھے کہ کب بارہ برس پورے ہوں اور کب یہ واپس جا کر راج پاٹ سنبھالیں اور رعایا کی بے لوث خدمت کریں۔ ایک روز جب کہ رام اور لچھمن دونوں شکار کو گئے ہوئے تھے‘ لنکا کا راجا راون آیا اور سیتا جی کو اُٹھالے گیا۔ اس پر رام چندر جی اور راون میں لڑائی ہوئی۔ گھمسان کا رن پڑا جیسا کہ دسہرے کے تہوار میں پڑتا آپ نے دیکھا ہوگا۔

ہنومان جی اوران کے بندروں نے رام چندر جی کا ساتھ دیا اور وہ راون اور اس سے
راکششوں کو مار کر جیت گئے۔ پرانے خیال کے ہندو اسی لیے بندروں کی اتنی عزّت
کرتے ہیں۔ ان کو انسانوں پر ترجیح دیتے ہیں۔

مہابھارت

مہابھارت کوروں اور پانڈوؤں کی لڑائی کی داستان ہے۔ کورو تو جیسا کہ نام ہی سے
ظاہر ہے بڑے کورچشم لوگ تھے۔ ہاں پانڈو اچھے تھے۔ اتنا ضرور ہے کبھی کبھی جوا کھیل
لیتے تھے۔ اور تعدّد ازدواج کا رواج بھی ان میں تھا، یعنی ایک عورت کے پانچ شوہر
ہوسکتے تھے۔ یکے بعد دیگرے نہیں۔ وہ تو آج کل بھی ہوتے ہیں بلکہ بیک وقت
دروپدی پانچوں پانڈوؤں کی بلاشرکت غیرے بیوی تھی۔ چونکہ اس کا سلوک پانچوں
سے یکساں تھا اس لیے ہم اس معاملے پر زیادہ اعتراض نہیں کرتے۔

مہابھارت کے زمانے میں شادی میں ایسی مشکلات ہوتی تھیں جیسی آج کل ہوتی
ہیں کہ لڑکے کا حسب نسب، جائداد اور تعلیم وغیرہ پوچھتے ہیں حتیٰ کہ ذریعہ روزگار بھی،
پنجابی یوپی کا سوال بھی اُٹھتا ہے اور شیعہ سنی کی دیکھ پرکھ بھی ہوتی ہے۔ مہابھارت کے
سنہری زمانے میں سوئمبر رچاتے تھے۔ جو شخص بھی نیچے تیل کے کنڈ میں عکس پر نظر
جمائے اوپر گھومتی مچھلی کی آنکھ میں تیر کا نشانہ لگاتا تھا اس کے سر اپنی لڑکی منڈھ دیتے
تھے۔ دروپدی کے سوئمبر میں ارجن نے تیر مارا جو گھومتی مچھلی کی آنکھ میں سیدھا جا لگا۔
یہ حُسنِ اتفاق تھا ورنہ تو ایسے کرتب کے لیے آدمی کا ماہر بازی گر یا نٹ ہونا ضروری ہے
ہم آپ نہیں لگا سکتے۔

کورو پانڈوں میں لڑائی کیوں ہوئی تھی؟ یہ ہم نہیں جانتے۔ ہر لڑائی کے لیے وجہ کا
ہونا ضروری بھی نہیں۔ اب کچھ آنکھوں دیکھا حال اس لڑائی کا سنیے۔

خواتین وحضرات یہ کوروکشیتر کا میدان ہے جو تحصیل کیتھل ضلع کرنال میں واقع
ہے۔ لڑائی اب شروع ہونے ہی والی ہے۔ کورو ایک طرف ہیں پانڈو دوسری طرف
ہیں۔ یہ ہونا بھی چاہیے۔ دونوں ایک طرف ہوں تو لڑائی کا کچھ مزہ نہ آئے۔ لڑنے
والوں کے علاوہ بھی کچھ لوگ میدان میں نظر آرہے ہیں۔ یہ درونا اچاریہ ہیں۔ دونوں
فریقوں کے بزرگ ہیں۔ اپنا لشکر کوروؤں کو دے رکھا ہے۔ آشیرداد پانڈوؤں کو دے
رکھی ہے۔ پانڈوؤں کا مطالبہ تھا کہ آپ آشیرداد کوروؤں کو دے دیں۔ لشکر ہمیں دے
دیں لیکن اچاریہ جی نہیں مانے۔ یہ کون ہیں؟ یہ کرشن جی ہیں۔ مشہور افسانہ نگار کرشن
نہیں نہ مہاشہ کرشن بلکہ اور صاحب ہیں۔ کرشن کنھیا کہلاتے ہیں۔ ابھی ابھی گوپیوں
کے پاس سے آئے ہیں۔ مکھن ابھی تک ہونٹوں پر لگا ہے۔ بیٹھے گیتا لکھ رہے ہیں
ارجن کو اپدیش دے رہے ہیں کہ مارو، مارو، اپنوں کو مارو، جھجکو نہیں۔ تاج وتخت کا
معاملہ ہے مذاق کی بات نہیں'' یاد ہے کہ کورو اور پانڈو ایک دوسرے کے کزن ہیں۔
اے لو کھانڈے سے کھانڈا بجنے لگا اور رتھ سے رتھ ٹکرا رہا ہے۔ یہ لڑائی تو لمبی چلتی معلوم
ہوتی ہے۔ لہٰذا اب ہم واپس اسٹوڈیو چلتے ہیں۔

☆☆☆

اتفاق میں برکت ہے

ایک بڑے میاں جنہوں نے اپنی زندگی میں بہت کچھ کمایا بنایا تھا آخر بیمار ہوئے مرض الموت میں گرفتار ہوئے۔ ان کو اور تو کچھ نہیں۔ کوئی فکر تھی تو یہ کہ ان کے پانچوں بیٹوں کی آپس میں نہیں بنتی تھی۔ گاڑھی کیا پتلی بھی نہیں چھنتی تھی۔ لڑتے رہتے تھے۔ کبھی کسی بات پر اتفاق نہ ہوتا تھا۔ حالانکہ اتفاق میں بڑی برکت ہے۔ آخر انہوں بیٹوں پر اتحاد اور اتفاق کی خوبیاں واضح کرنے کے لیے ایک ترکیب سوچی۔ ان کو اپنے پاس بلایا اور کہا۔ ''دیکھو اب میں کوئی دم کا مہمان ہوں۔ سب جا کر ایک ایک لکڑی لاؤ۔''

ایک نے کہا ''لکڑی؟ آپ لکڑیوں کا کیا کریں گے؟''

دوسرے کہا ''بڑے میاں کا دماغ خراب ہو رہا ہے۔

لکڑی نہیں۔ شاید ککڑی کہہ رہے ہیں۔ ککڑی کھانے کو جی چاہتا ہوگا۔'' تیسرے نے کہا۔ ''نہیں کچھ سردی ہے۔ شاید آگ جلانے کو لکڑیاں منگاتے ہوں گے۔''

چوتھے کہا۔ ''بابو جی، کوئلے لائیں؟''

پانچویں نے کہا ''نہیں، اُپلے لاتا ہوں۔ وہ زیادہ اچھے رہیں گے۔''

باپ نے کراہتے ہوئے کہا ''ارے نالائقو! میں جو کہتا ہوں وہ کرو۔ کہیں سے

لکڑیاں لاؤ جنگل سے۔''

ایک بیٹے نے کہا ''یہ بھی اچھی رہی۔ جنگل یہاں کہاں؟ اور محکمہ جنگلات والے لکڑی کہاں کاٹنے دیتے ہیں؟''

دوسرے نے کہا ''اپنے آپے میں نہیں بابو جی۔ بک رہے ہیں جنوں میں کیا کیا کچھ۔''

تیسرے نے کہا۔ ''بھئی لکڑیوں والی بات تو اپن کی سمجھ میں نہیں آئی۔''

چوتھے نے کہا ''بڑے میاں نے عمر بھر میں ایک ہی تو خواہش کی ہے۔ اسے پورا کرنے میں کیا حرج ہے؟''

پانچویں نے کہا ''اچھا، میں جاتا ہوں۔ ٹال پر سے لکڑیاں لاتا ہوں۔''

چنانچہ وہ ٹال پر گیا۔ ٹال والے سے کہا ''خان صاحب ذرا پانچ لکڑیاں تو دینا۔ اچھی مضبوط ہوں۔''

ٹال والے نے لکڑیاں دیں۔ ہر ایک خاصی موٹی اور مضبوط باپ نے دیکھا تو اس کا دل بیٹھ گیا۔ یہ بتانا بھی خلافِ مصلحت تھا کہ لکڑیاں کیوں منگائی ہیں اور اس سے کیا اخلاقی نتیجہ نکالنا مقصود ہے۔ آخر بیٹوں سے کہا ''اب ان لکڑیوں کا گٹھا باندھ دو۔''

اب بیٹوں میں پھر چہ میگوئیاں ہوئیں۔ ''گٹھا! وہ کیوں؟''

''اب رسی کہاں سے لائیں۔ بھئی بہت تنگ کیا ہے اس بڈھے نے۔'' آخر ایک نے اپنے پاجامے میں سے ازار بند نکالا اور گٹھا باندھا۔

بڑے میاں نے کہا۔ ''اب اس گٹھے کو توڑو۔''

بیٹوں نے کہا۔ ''لو بھئی، یہ بھی اچھی رہی۔ کیسے توڑیں؟ کلہاڑا کہاں سے لائیں؟''

باپ نے کہا ''کلہاڑے سے نہیں، ہاتھوں سے توڑو گھٹنے سے توڑو۔''

حکمِ والد مرگِ مفاجات۔ پہلے ایک نے کوشش کی، پھر دوسرے نے، پھر تیسرے نے، پھر چوتھے نے، پھر پانچویں نے ۔لکڑیوں کا بال بیکا نہ ہوا۔ سب نے کہا۔"باؤجی! ہم سے نہیں ٹوٹتا یہ لکڑیوں کا گٹھا۔"

باپ نے کہا۔"اچھا۔اب ان لکڑیوں کو الگ الگ کردو۔ان کی رسّی کھول دو۔"

ایک نے جل کہا"رسّی کہاں ہے، میرا ازار بند ہے۔اگر آپ کو کھلوانا تھا تو گٹھا بندھوایا ہی کیوں تھا؟ لاؤ بھئی کوئی پینسل دینا۔ازار بند ڈال لوں پاجامے میں۔"

باپ نے بزرگانہ شفقت سے اس کی بات کو نظرانداز کرتے ہوئے کہا"اچھا،اب ان لکڑیوں کو توڑ دو۔ایک ایک کر کے توڑو۔"

لکڑیاں چونکہ موٹی موٹی اور مضبوط تھیں، بہت کوشش کی۔ کسی سے نہ ٹوٹیں۔ آخر میں بڑے بھائی کی باری تھی۔اس نے ایک لکڑی پر گھٹنے کا پورا زور ڈالا اور تڑاق کی آواز آئی۔

باپ نے نصیحت کرنے کے لیے آنکھیں یک دم کھول دیں۔کیا دیکھتا ہے کہ بڑا بیٹا بے ہوش پڑا ہے۔لکڑی سلامت پڑی ہے۔آواز بیٹے کے گھٹنے کی ہڈی ٹوٹنے کی تھی۔

ایک لڑکے نے کہا۔"یہ بڈھا بہت جاہل ہے۔"

دوسرے نے آواز دی"ضدی۔"

تیسرے نے کہا۔"کھوسٹ۔سنکی، عقل سے پیدل، گھامڑ۔"

چوتھے نے کہا"سارے بڈھے ایسے ہی ہوتے ہیں۔کمبخت مرتا بھی نہیں۔"

بڈھے نے اطمینان کا سانس لیا کہ بیٹوں میں کم از کم ایک بات پر تو اتفاق رائے ہوا۔اس کے بعد آنکھیں بند کیں اور نہایت سکون سے جان دے دی۔

☆☆☆

ڈگریاں بڑی نعمت ہیں

لاہور کے ایک اخبار میں ایک وکیل صاحب کے متعلق یہ خبر مشتہر ہوئی ہے کہ کوئی ظالم ان کا سرمایہ علم و فضل اور دولتِ صبر و قرار اور آلات کاروبار لوٹ لے گیا ہے۔ تفصیل مالِ مسروقہ کی یہ ہے ایک ڈگری بی۔اے کی۔ ایک ایل ایل بی کی۔ ایک کیریکٹر سرٹیفکیٹ بدیں مضمون کہ حامل سرٹیفکیٹ ہذا کبھی جیل نہیں گیا۔اس پر ہر قسم کے مقدمے چلے۔ لیکن یہ ہمیشہ بری ہوا۔ الماری کا تالا توڑ کر یہ سرٹیفکیٹ لے گئے ہوں یا یہ سہواً خود اُن کے پاس چلے گئے ہوں۔ وہ براہِ کرم واپس کر دیں۔ان کو کچھ نہیں کہا جائے گا۔ اگر کوئی اور صاحب اس نابکار چور کو پکڑ کر لائیں تو خرچہ آمدورفت بھی پیش کیا جائے گا۔ حلیہ یہ ہے۔ چور کا نہیں، سرٹیفکیٹوں کا کہ ان پر بندے کا نام لکھا ہے۔ گلشن علی سمرقندی، سابق سوداگر شکر قندی۔ مقیم گوالمنڈی۔ بعض کم فہم ظاہر بین کہیں گے کہ ڈگری سے کیا ہوتا ہے۔ وکیل صاحب۔ شوق سے کاروبار جاری رکھیں۔ وکالت علم و عقل بلکہ زبان سے کی جاتی ہے۔ ڈگری کوئی تعویذ تھوڑا ہی ہے کہ جس کے بازو پر باندھا وہ گونگا بھی ہے تو پٹ پٹ بولنے لگا۔ فصاحت کے بتاشے گھولنے لگا۔ لیکن ہماری سنیے تو ڈگری اور عہدہ دونوں کام کی چیزیں ہیں۔ بلکہ علم اور لیاقت کا نعم البدل ہیں۔ آناں را کہ ایں دہند۔ آں نہ دہند۔ آپ نے منصب دار لوگوں کو دیکھا ہوگا۔ کہ بظاہر بے علم معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن وقت آنے پر ادب اور آرٹ کے

اسرور موز پر ایسی مدبّرانہ گفتگو کرتے ہیں کہ دانا اندر آں حیراں بماند۔ جتنا بڑا عہدہ دار ہوگا۔ اتنی ہی اونچی بات کرے گا۔ نیچے والوں کو خاطر میں نہ لائے گا۔ ڈگری کو بھی ہم نے اسی طرح لوگوں کے سر چڑھ کر بولتے دیکھا۔ ایک ہمارے مہربان ہیں۔ اردو زبان وادب کے پروفیسر۔ ایک روز دست نگر کو دستِ نگر پڑھ رہے تھے۔ اور ”استفادہ حاصل کرنا“ بول رہے تھے۔ ہم نے بڑے ادب سے ٹوکا۔ لیکن وہ بکھر گئے اور پوچھنے لگے۔ کتنا پڑھے لکھے ہو تم؟ ہم نے کہا کچھ بھی نہیں بس حرف شناس ہیں۔ الف بے آتی ہے۔ بیس تک گن بھی لیتے ہیں۔ اس پر وہ اندر سے دو فریم شدہ چوکھٹے اُٹھا لائے......ان پر ایک ڈگری ایم اے کی تھی۔ دوسری پی ایچ ڈی کی۔ بولے اب کہو تمہارا کہا سند ہے یا ہمارا فرمایا ہوا۔ اُس دن پہلی بار ہمیں اپنی غلطی معلوم ہوئی۔ اب ہم بھی ریڈیو اور ٹیلی ویژن والوں کی طرح دستِ نگر، چشمِ دید، دم زدن اور استفادہ حاصل کرتے ہی بولتے اور لکھتے ہیں۔

ڈگری اور سرٹیفیکٹ کا چلن پرانے زمانے میں اتنا نہ تھا جیسا آج کل ہے۔ اس زمانے کے لوگ بیمار بھی سرٹیفیکٹ کے بغیر ہو جایا کرتے تھے۔ اور بعض اوقات تو شدّتِ مرض سے مر بھی جایا کرتے تھے۔ اب کسی کی علالت کو خواہ سامنے پڑا ایڑیاں رگڑ رہا ہو، بلا سرٹیفیکٹ کے ماننا قانون کے خلاف ہے۔ پرانے زمانے میں لوگوں کے اخلاق بھی بلا سرٹیفیکٹ کے شائستہ ہوا کرتے تھے۔ اب جس کے پاس کیریکٹر سرٹیفیکٹ نہیں سمجھو کہ اس کا کچھ اخلاق نہیں۔ اس کی نیک چلنی مشتبہ اب تو مرنے جینے کا انحصار بھی سرٹیفیکٹ پر ہے۔ سانس کی آمدو شد پر نہیں۔ آپ نے اُس شخص کا قصّہ سُنا ہوگا جو خزانے سے پنشن لینے گیا تھا۔ جون کی پنشن تو اُسے مل گئی کیونکہ اُس ماہ کے متعلق اس کے پاس بقید حیات ہونے کا سرٹیفیکٹ تھا۔ لیکن مئی کی پنشن روک لی گئی کہ جب مئی میں زندہ ہونے کا سرٹیفیکٹ لاؤ گے تب ادا کی جائے گی۔ اصول اصول ہے۔ اس منطق سے تھوڑا ہی توڑا جا سکتا ہے کہ جو شخص جون میں زندہ ہے، اس کے مئی

میں بھی زندہ ہونے کا غالب امکان ہے۔ باقاعدہ سرٹیفیکٹ ہونا چاہیے۔

عشق کاریست کہ بے آہ و فغاں نیز کنند۔ وکیلوں کے لیے بے شک ڈگری کی پابندی ہے۔ اسی لیے وہ ڈگریاں چوری ہو جانے پر پریشان اور بے بس ہو جاتے ہیں۔ لیکن موکلوں اور گواہوں کو ان کے بغیر ہی ایسی لیاقت پیدا کرتے دیکھا ہے کہ ڈگری والا تری قدرت کا تماشا دیکھے۔ آپ نے اُن میر صاحب کا ذکر سُنا ہے جو ہاتھ میں چھڑی لئے پھندنے دار ٹوپی پہنے، بغل میں بستہ مارے کچہری کے احاطے میں گھومتے رہتے تھے کہ اگر لکھوائے کوئی اُن کو خط تو ہم سے لکھوائے یعنی.........

مناسب معاوضے پر گواہی دے کر حاجت مندوں کے آڑے وقت کام آتے تھے۔ ایک روز کی بات ہے کہ کوئی جائداد کا مقدمہ عدالت میں تھا۔ مدعی کا وکیل تیار نہ تھا۔ اُسے پوری اُمید تھی کہ آتے ہی تاریخ لے لے گا۔ لیکن مجسٹریٹ نے جانے کیوں اصرار کیا کہ سماعت آج ہی ہوگی۔ گواہ پیش کیے جائیں۔ ورنہ یک طرفہ ڈگری دیتا ہوں۔ وکیل صاحب بوکھلائے ہوئے باہر نکلے کہ میر صاحب دکھائی دیے۔ ان کی جان میں جان آئی۔ فوراً انہیں بازو سے پکڑ کر اندر لے گئے۔ مقدمہ سمجھنے سمجھانے کا تو وقت ہی نہ تھا۔ بس اتنی بھنک کان میں پڑی کہ کوئی خان بہادر رضا علی مر گئے ہیں۔ ان کی جائداد کا قصّہ ہے یہ کون تھے......کیا تھے؟ جھگڑا کیا ہے۔ کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ بہر حال پیش ہو گئے اور حلف اٹھا کٹہرے میں کھڑے ہو گئے۔ وکیل مخالف کو معلوم تھا کہ ......یہ بھاڑے کے ٹٹو ہیں۔ ابھی ان کے قدم اُکھاڑ دوں گا۔ جرح.....شروع کر دی۔

”میر صاحب۔ آپ خان بہادر رضا علی مرحوم کو جانتے تھے؟“

میر صاحب نے فرمایا۔ ”اجی جاننا کیا معنی.....دانت کاٹی روٹی تھی۔ بڑی خوبیوں کے آدمی تھے۔ خدا مغفرت کرے۔ ان کی صورت ہمہ وقت آنکھوں کے آگے پھرتی ہے۔“

”کیا عمر تھی ان کی۔؟“

''بس چالیس اور اسّی کے درمیان ہوں گے۔ بدن چور تھے اسی لیے صحیح اندازہ آج تک کوئی نہیں لگا سکا۔''

''اچھا یہ بتائیے کہ وہ لانبے تھے یا ناٹے۔''

میر صاحب نے کہا۔ ''خوب لانبا قد تھا۔ لیکن ازراہ خاکساری جُھک کر چلتے تھے۔ اس لیے ناٹے معلوم ہوتے تھے۔''

وکیل نے دوسرا سوال داغا...... ''ان کی رنگت تو آپ بتا ہی سکتے ہیں۔ گورے تھے یا کالے۔''

میر صاحب نے کہا۔ ''خوب سُرخ و سفید رنگت تھی۔ لیکن بیماری کے باعث جلد سنولا جاتی تھی تو کالے نظر آنے لگتے تھے۔''

وکیل نے ایک اور وار کیا..... ''یہ بتائیے کہ داڑھی مونچھ رکھتے تھے یا صفا چٹ تھے۔''

میر صاحب ہنسے اور کہا۔ ''مرحوم کی طبیعت عجب باغ و بہار تھی۔ کبھی جی میں آیا تو مونچھیں رکھ لیں۔ وہ بھی کبھی پتلی۔ کبھی گچھے دار۔ داڑھی بھی چھوڑ دیتے تھے خشخشی کبھی یک مشت۔ کبھی یہ لمبی ناف تک اور پھر ترنگ آتی تو سب کچھ منڈا صفا چٹ ہو جاتے تھے۔''

''اچھا داڑھی آپ نے ان کی دیکھی ہوگی۔ سفید ہوتی تھی یا کالی۔''

میر صاحب نے کہا۔ ''ویسے تو سفید ہی ہوتی تھی لیکن جب خضاب لگا لیتے تھے تو بالکل کالی نظر آتی تھی۔ ان کی طبیعت ایک رنگ پر نہیں تھی۔ وکیل صاحب کہہ دیا نا کہ باغ و بہار آدمی تھے۔''

وکیل صاحب نے کہا..... ''اچھا یہ فرمائیے کہ ان کا انتقال کس مرض میں ہوا۔''

میر صاحب نے ایک لمبی آہ بھری اور کہا...... ''رونا تو یہی ہے کہ آخر تک کچھ تحقیق نہ ہوئی۔ ڈاکٹر کچھ کہتے تھے۔ حکیم کچھ۔ مرگ چو آید طبیب ابلہ شود ہم تو یہی کہیں گے کہ ان کو مرض الموت تھا۔ ہائے کیسی نورانی صورت تھی ہمارے خان بہادر صاحب کی۔ ان کی یاد آتی ہے تو سینے میں تیر سا لگتا ہے۔'' یہ کہہ کر وہ ڈس ڈس رونے بھی لگے۔

مجسٹریٹ نے کہا۔ ''اچھا۔ اب دوسرے مقدمے کی باری ہے۔ اگلی بدھ کو دوسرے گواہان پیش ہوں۔''

☆☆☆

التماس متضمن بہ اجازت برائے فیملی پلاننگ

حضورِ انور!

ہم دیارِ پاکستان کے کھٹمنڈو پلٹ خاندانی اور اکسیری حکیم اور عطائی درخواست کرتے ہیں کہ ہمیں شہریوں کے جان و مال سے کھیلنے کی اجازت عطا فرمائی جائے۔

جنابِ والا! اس ملک میں آبادی بہت بڑھ رہی ہے۔ اور فیملی پلاننگ کا محکمہ چنداں کامیاب نہیں رہا۔ چونکہ ہماری قوم کے لیے اس سرے سے فیملی پلاننگ کرنا مشکل ہے اور شاید خلافِ شرع بھی ہے لہٰذا دوسرے سرے سے کوشش کرنی چاہیے۔ حضورِ والا! آپ پر روشن ہے کہ ہم نے خاندانوں کے خاندانوں کا صفایا کر دیا ہے۔ مشک آنست کہ خود ببوید کراچی اور لاہور کے وسیع قبرستان ہمارے دعوے کا زندہ ثبوت ہیں۔

جناب والا! قبرستان کے ساتھ زندہ کا لفظ ہم لطف زبان کے لیے لائے ہیں کیونکہ ہماری سرکار دولت مند کو زبان سے یعنی زبانوں کے مسائل سے بھی گہری اور عملی دلچسپی ہے۔ یہ مطلب ہرگز نہ لیا جائے کہ ہم زندہ آدمی کو قبرستان میں گاڑ دیتے ہیں۔

جناب والا! ایک دیرینہ مطالبہ ہمارا یہ ہے کہ ہمیں اپنے مطلب کے اندر ہی لٹھے

مشک کافور، اگربتیوں اور سنگِ مرمر کے اسٹور کھولنے کی اجازت دی جائے تاکہ ہمارے مریضوں کے لواحقین کو دور نہ جانا پڑے، تکلیف نہ ہو۔

اجازت دی جائے شہر کا امن تباہ کرنے کی

حضور والا!

ہم شہر ہٰذا کے شرپسند، شہر کا امن تباہ کرنے کی اجازت چاہتے ہیں جو ہمیں امید ہے ضرور عطا کی جائے گی۔

جناب والا! حکیم الامت نے فرمایا ہے کہ۔

پلٹ کر جھپٹنا، جھپٹ کر پلٹنا ☆ لہو گرم کرنے کا ہے اک بہانہ

آپ تسلیم کریں گے کہ جس قوم کے لوگ آپس میں نہیں لڑ سکتے، وہ باہر والوں سے کیا لڑیں گے۔

جناب والا! امن کو درہم برہم کرنا ہمارا کاروبار ہے اور روز افزوں گرانی نے ہماری کمر توڑ کر رکھ دی ہے۔ چاقو اور خنجر مہنگے ہوگئے ہیں اور لاٹھیاں تک کیونکہ بانس مشرقی پاکستان سے آتا تھا۔ اگر سرکار ہمیں ڈنڈے، چاقو اور ناجائز اسلحہ رعایتی نرخوں پر مہیا کرے تو غریب نوازی یعنی شریر نوازی ہوگی۔

☆☆☆

ذکر کاہلی کا

ہمارا شمار ان لوگوں میں ہے جن کا ذکر پطرس نے اپنے مضمون "سویرے جو کل آنکھ میری کھلی" میں کیا ہے۔ اگر یہ مضمون ہمارے ہوش سنبھالنے سے پہلے کا نہ ہوتا، اگر پطرس مرحوم کے نیاز بھی حاصل رہے ہوتے۔ تو یہی سمجھتے کہ انہوں نے یہ ہمارے بارے میں لکھا ہے۔ اُٹھنا نمبر ایک اور اُٹھنا نمبر دو ہمیشہ سے ہماری زندگی کا معمول رہے ہیں۔ یہ نہ سمجھا جائے کہ ہم نے پطرس کے ہیرو کی طرح سورج کو کبھی طلوع ہوتے دیکھا ہی نہیں۔ کئی بار دیکھا ہے۔ فلموں میں بڑا اچھا لگتا ہے۔

جوش اور جگر دونوں بڑے شاعر ہیں۔ لیکن ہمارا ذاتی رجحان ہمیشہ جگر کی طرف رہا ہے۔ شاعری کی وجہ سے نہیں بلکہ اس لیے کہ ہماری ہی طرح کے تھے۔ چرند پرند اور جوش ملیح آبادی کی طرح علی الصباح نہیں اُٹھ بیٹھتے تھے۔ ارے بھئی وہی تو وقت چڑیوں کے چہچہانے کا ہوتا ہے۔ جو لوگ نور کے تڑکے چھڑی لیے باغ میں جا پہنچتے ہیں۔ وہ ان... بے زبانوں کے معمولات میں مخل ہوتے ہیں۔ جگر صاحب سے بھی ہم کبھی نہیں ملے لیکن ایک بار ان کے قلم سے یا کسی اور کے قلم سے ہم نے پڑھا ہے کہ بھوپال میں ان لوگوں نے یعنی جگر صاحب اور ان کے دوستوں نے ایک انجمن الکُہلا قائم کی تھی۔ کُہلا، کاہل کی جمع ہے۔ جو جتنا بڑا احدی اور خدائی خوار ہوتا تھا، اتنا ہی اس انجمن میں یا

کلب میں ذی مرتبت سمجھا جاتا تھا۔ کہ انجمن کے دفتر میں ایک قالین بچھا تھا۔ یہ لوگ
وہاں پہنچ کر کھڑے کھڑے گر پڑتے تھے۔ کیونکہ کھڑے سے بیٹھنا اور بیٹھنے کے بعد
لیٹنا ایک محنت طلب امر ہے۔ ناحق کا تکلف ہے اور آدابِ کاہلی کے خلاف ہے۔ دن
بھر یہ لوگ وہاں اپنی کاہلی کے نشے میں غین پڑے رہتے تھے۔ کبھی کبھار کوئی شخص آ کر
ان کے منہ میں پانی ڈال جاتا تھا۔

سچ یہ ہے کہ کاہلی میں جو مزہ ہے وہ کاہل ہی جانتے ہیں۔ بھاگ دوڑ کرنے والے
اور صبح صبح اُٹھنے والے اور ورزش پسند اس مزے کو کیا جانیں۔ ہائے کم بخت تو نے پی ہی
نہیں۔ دیکھیے ہمارے قبیلے میں کیسا کیسا آدمی ہوا ہے۔ غالب بھی ''بیٹھے رہیں تصور
جاناں کیے ہوئے'' کے قائل تھے۔ میر صاحب یعنی میر تقی میر بھی اپنے حجرے میں
قطب بنے بیٹھے رہتے تھے۔ کبھی اپنے حجرے کی کھڑکی بھی نہ کھولی۔ کیونکہ کھولنا بھی
ایک طرح کا کام ہے بلکہ یہاں تک سنا ہے۔ ادھر کبھی نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھا تھا۔ ایک
صاحب نے کہا۔ ''میر صاحب یہ کھڑکی کھول لیا کیجیے۔ باہر کی ہوا آیا کرے گی۔ اور
اس طرف باغ بھی ہے۔'' حیران ہو کر بولے۔ ''اچھا میرے کمرے میں کوئی کھڑکی
بھی ہے۔'' میر اور غالب تو خیر پرانے زمانے کے آدمی تھے۔ ہمارے حکیم الامت
شاعر مشرق علامہ اقبال کے متعلق بھی ہم نے کبھی نہیں پڑھا کہ چاق و چوبند آدمی
تھے۔ یہی معلوم ہوا کہ تہمد باندھے چارپائی پر لیٹے رازی کے نکتہ ہائے دقیق پر
غور کرتے رہتے تھے اور حقہ پیتے رہتے تھے اس صبح خیز طبقے نے کوئی اتنا بڑا شاعر پیدا
کیا ہو تو ہمیں اس کا نام بتائیے۔ تعارف کرائیے۔ ہمیں یاد پڑتا ہے۔ مرزا محمد رفیع
سودا نے جو دلی کے چوروں پر مثنوی لکھی ہے، اس میں صبح اُٹھنے والوں کو کچھ اچھے
لفظوں میں یاد نہیں کیا۔ ملا مسجد کا صبح خیز یا ہے۔ ایسا ہی کوئی مصرعہ ارشاد کیا ہے۔ جس
کا مطلب یہ ہے کہ یہ بھی ان کا یعنی ایسی مثنوی کے ممدوحوں کا ساتھی ہے۔
یہ جان کر خوشی ہوئی کہ اہلِ مغرب میں سارے لوگ موجد اور سائنس داں ہی نہیں

ہیں بلکہ بہت سے ہمارے قبیلے کے ہیں۔ بلکہ ایسے کہ ہمارے قبیلے کے لیے باعث
نازش۔ ایک اخبار میں پڑھا کہ وہاں کاہلوں کے باقاعدہ کلب ہیں جن میں کاہل لوگ
بوجہ کاہلی کبھی نہیں جاتے۔ جو شخص چلا جائے اُسے مستعد جان کر اس کا نام کاٹ دیا جاتا
ہے۔ ہم نے جوش ملیح آبادی صاحب کا وہ نظامِ اوقات پڑھا کہ فلاں وقت سے فلاں
وقت تک یہ باغ میں ملے گا۔ اور فلاں وقت اُسے مے خانہ میں تلاش کیجیے۔ اور فلاں
وقت نہ جانے کہاں۔ اس کلب والوں نے جن کا نام

BORN-TIRED-ASSOCIATION

یعنی پیدائشی تھکے ماندوں کی انجمن ہے۔'' مثالی زندگی کا نظام اوقات یہ مقرر کیا ہے
کہ چوبیس سے دس گھنٹے تو سونا ہی چاہیے۔ باقی رہے چودہ گھنٹے ان میں آٹھ گھنٹے
آرام کے لیے وقف رہنے چاہئیں یعنی آدمی لیٹا اکڑتا رہے۔ کچھ کام نہ کرے۔ باقی
رہے چھ گھنٹے اس میں سے چار گھنٹے کھانے کے لیے وقف رہنے چاہئیں۔ کھانا اور
جگالی کرنا بھی تو ایک زندگی کی عشرتوں میں سے ہے۔ نوالے زہر مار کرنا تو کھانے کی
تعریف میں نہیں آتا۔ باقی رہے دو گھنٹے یہ انجمن تو ان میں بھی کسی قسم کے کام کاٹنٹا
پسند نہیں کرتی لیکن خیر کوئی ان میں کام کرنا چاہے تو اعتراض بھی نہیں کرتی۔ ہمارے
خیال میں تو اس میں سے بھی کچھ وقت نہانے شیو کرنے اور حاجات ضروریہ اور غیر
ضروریہ کی مد میں نکل جاتا ہے۔ بشرطیکہ یہ مغرب کے کاہل لوگ ان تکلفات کو ضروری
سمجھیں۔ یاد رہے کہ اس کلب کے ۳۵ر ہزار ممبر ہیں۔ سچ یہ ہے کہ ہمیں تو انجمن
سازی بھی تکلف اور کاہلی کے اصولوں کے منافی معلوم ہوتی ہے۔ فارم بھرنا فیس دینا،
دستخط کرنا وغیرہ۔ ایک بار تین کاہلوں میں مقابلہ ہوا تھا کہ ہر شخص اپنی اپنی کاہلی کا کوئی
قصہ سنائے جو سب سے زیادہ کاہل ہو وہ انعام پائے۔ ایک نے اپنا قصہ بیان کیا کہ
بیر کو اُٹھا کر منہ میں ڈالنے کے لیے بھی کسی راہ گیر کی خدمات حاصل کیں۔ دوسرے نے
اس سے زیادہ ڈوں کی لی...... تیسرے کے سامنے شمع پہنچی تو بولا یارو! قصے تو کئی ایک

ہیں۔لیکن کون سنائے؟ پس انعام کا حق دار یہی تیسرا ٹھہرا۔

☆☆☆

ہمارے ہاں کلب کا مطلب صرف نائٹ کلب سمجھا جاتا ہے۔ یا شراب نوشی اور رقص وتفریح کا اڈہ۔ یہ بات نہیں مغرب کے ملکوں میں شام کو گھر میں گھسے بیٹھے رہنا اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ ایران اور ترکی تک میں لوگ شام اُترتے ہی سیر وتفریح کے لیے نکل پڑتے ہیں۔ اور شام کا چوگا بھی باہر ہی کھاتے ہیں۔ جو کلبوں کے ممبر ہیں، وہ وہاں جا کر کچھ کھیلتے ہیں۔ کچھ پڑھتے ہیں۔ کچھ گپ کرتے ہیں۔ مغرب میں پینا پلانا بھی آدابِ زندگی میں داخل ہے۔ لہٰذا پی بھی لیتے ہیں۔ اور کبھی کبھار زیادہ بھی پی لیتے ہیں۔ بعض تو اپنے پاؤں چل کر گھر پہنچ جاتے ہیں۔ بعض کو ڈنڈا ڈولی کر کے لانا پڑتا ہے۔

☆☆☆

آپ میں سے بہت سوں نے رابرٹ لوئی اسٹیونسن کی کہانی ''خودکشی کا کلب'' پڑھی ہوگی۔ مولانا عبدالمجید سالک نے اسی نام سے اس کا ترجمہ کیا تھا۔ اس کلب کے ممبر بننے والے اپنی جان سے بیزار بے شک ہوتے تھے لیکن اپنی جان آپ لیتے ڈرتے تھے۔

خودکشی کے لیے ہمت چاہیے۔ اس کلب کا کام ان کی بے ضرر موت کا انتظام کرنا ہوتا تھا۔ اخبار میں آتا تھا کہ فلاں شخص کار کے نیچے آیا اور مر گیا۔ فلاں دریا میں ڈوبا پایا گیا۔ شاید مخموری میں پُل سے گزر رہا تھا۔ پاؤں رپٹ گیا۔ کسی کے ساتھ کوئی اور حادثہ گزرا۔ لیکن اصل میں یہ سارے اس کلب کے کارنامے ہوتے تھے۔ خیر وہ تو ایک قصہ تھا۔ ہمیں معلوم نہیں خودکشی کے کلب سچ مچ ہوتے ہیں یا نہیں ہوتے لیکن اسی طرح ایک کہانی سر آرتھر کانن ڈائل کی بھی ہے۔ جس میں شرلاک ہومز صاحب اپنا کارنامہ دکھاتے ہیں۔ اس کا نام ہے ''لال سروالوں کی انجمن'' صرف سُرخ بالوں والے اس کی خدمات سے متمتع ہو سکتے تھے۔ شرلاک ہومز کے تفتیش کرنے پر یہ سارا کارخانہ فراڈ ثابت ہوا۔ لیکن گنجوں کے کلب [illegible] ہیں۔

داخلے جاری ہیں

پرسوں ایک صاحب تشریف لائے

ہے رِند سے زاہد کی ملاقات پُرانی

پہلے بریلی کو بانس بھیجا کرتے تھے۔ یہ کاروبار کسی وجہ سے نہ چلا تو کوئلوں کی دلالی کرنے لگے۔ چونکہ صورت ان کی محاورے کے عین مصداق تھی، ہمارا خیال تھا اس کاروبار میں سرخ رو ہوں گے۔ لیکن آخری بار ملے تو معلوم ہوا نرسری کھول رکھی ہے۔ پودے اور کھاد بیچتے ہیں۔ پھولوں کے علاوہ سبزیوں کے بیج بھی ان کے ہاں سے با رعایت مل سکتے ہیں۔

آتے ہی کہنے لگے ''دس روپے ہوں گے؟''

ہم نے نہ دینے کے بہانے سوچتے ہوئے استفسار کیا۔

''کیا ضرورت آن پڑی ہے؟''

فرمایا۔ ''اپن ادبی ذوق کے آدمی ہیں، اپن سے اب گھاس نہیں کھودی جاتی۔ کھاد اور پود نہیں بیچی جاتی۔ اب ہم ایسا کام کرنا چاہتے ہیں جس سے قوم کی خدمت بھی ہو۔''

ہم نے کہا۔ ''دس روپے میں اسکول کھولیے گا؟''

بہت ہنسے اور بولے ''اچھی رہی۔ بھلا دس روپے میں بھی اسکول کھولا جا سکتا ہے۔ دس روپے میرے اپنے پاس بھی تو ہیں۔ دیکھیے سیدھا سیدھا حساب ہے۔ ایک دس

روپے کا تو بورڈ لکھوایا جائے گا۔ بورڈ کیا کپڑے پہ نام لکھوانا ہی کافی ہوگا اور دوسرے
دس روپے سے جو آپ مجھے دیں گے، میں شہر کی دیواروں، پلیوں، بس اسٹینڈوں وغیرہ
کے چہرے پر کالک پھیروں گا۔ یعنی اپنا اشتہار لکھواؤں گا کہ اے عقل کے اندھو۔
گانٹھ کے پورو آؤ کہ داخلے جاری ہیں۔''

ہم نے کہا۔ ''یہ جو تم لوگوں کے لپے پُتے گھروں کی دیواروں کو کالی کوچی پھیر کر
خراب کرو گے۔ کوئی پوچھنے والا نہیں ہے تمہیں۔ کارپوریشن نہیں روکتی، پولیس نہیں
ٹوکتی؟''

بولے ''پہلے یہ لوگ ملاوٹ کو تو روک لیں۔ عطائیوں اور گداگروں کو تو ٹوک لیں۔
شہر سے گندگی کے ڈھیر تو اٹھوالیں۔ کتے تو پکڑوالیں اور مچھروں مکھیوں کے منہ تو
آلیں۔''

ہم نے کہا۔ ''آپ بھی سچے ہیں۔ ان لوگوں کی مصروفیت کا ہمیں خیال ہی نہ رہا
تھا۔ اچھا اگر یونین کمیٹیوں کو خیال آ گیا کہ ان کا محلّہ اُجلا ہونا چاہیے۔''

ٹھٹھا مار کر بولے ''یونین کمیٹیاں؟ یہ کون لوگ ہوتے ہیں۔ کیا کام کرتے ہیں؟''

ہم نے کھسیانے ہو کر پوچھا۔ ''آپ کے پاس اسکول کے لیے عمارت بھی ہے۔
خاصی جگہ درکار ہوتی ہے۔ آپ کا گھر تو جہاں تک ہمیں معلوم ہے ۱۲۳ گز پر ہے۔''

فرمایا ''وہ ساتھ والا پلاٹ خالی ہے نا؟ جس میں ایک زمانے میں بھینسیں بندھا
کرتی تھیں۔ بچوں سے تین تین ماہ کی پیشگی فیس لے کر اس پر ٹین کی چادریں ڈلوالیں
گے۔ فی الحال تو اس کی بھی ضرورت نہیں۔ گرمیوں کے دن ہیں۔ اوپن ایئر ٹھیک رہے
گا۔ سنا ہے شانتی نکیتن میں بھی کُھلے میں کلاسیں لگتی تھیں۔''

ہم نے کہا۔ ''آپ کی بات کچھ ہمارے جی نہیں لگتی۔ بارشیں آنے والی ہیں۔ ان
میں اسکول بہ گیا تو!''

سوچ کر بولے۔ ''ہاں یہ تو ہے۔ جگہ تو اپنی نرسری کے سائبان میں بھی ہے بلکہ
اسکول کھولنے کا خیال ہی اس لیے آیا کہ کئی والدین نرسری کا بورڈ دیکھ کر آئے اور کہنے

لگے۔ ہمارے بچوں کو اپنی نرسری میں داخل کر لو۔ بڑی مشکل سے سمجھایا کہ یہ وہ نرسری
نہیں بلکہ پھولوں پودوں والی نرسری ہے۔ لیکن وہ یہی زور دیتے رہے کہ اسکولوں میں
تو داخلہ ملتا نہیں، یہیں داخل کر لو ہمارے بچوں کو کم از کم مالی کا کام سیکھ جائیں گے۔''

ہم نے کہا ''کس درجے تک تعلیم ہوگی؟''

فرمایا ''میٹرک تک تو ہونی ہی چاہیے۔ اس کے ساتھ کے۔ جی اور منٹگمری اور نہ
جانے کیا کیا ہوتا ہے۔''

ہم نے کہا۔ ''مانٹیسوری سے مطلب ہے غالباً۔''

فرمایا ''ہاں ہاں... مانٹیسوری۔ میرے منہ سے ہمیشہ منٹگمری ہی نکلتا ہے۔''

''پڑھائے گا کون؟'' ہم نے دریافت کیا۔

بولے۔ ''میں جو ہوں اور کون پڑھائے گا۔ اب مشق چھٹی.... ہوئی ہے ورنہ مڈل تو
بندے نے بھی اچھے نمبروں میں پاس کر رکھا ہے۔ اے۔ بی، سی تو اب بھی پوری آتی
ہے۔ سناؤں آپ کو؟

''اے۔ بی۔ سی۔ ڈی۔ ای۔''

ہم نے کہا۔ ''نہیں، اس کی ضرورت نہیں۔ آپ کی اہلیت میں کسے شک ہے۔ لیکن
آپ تو پرنسپل ہوں گے پھر آپ کی دوسری مصروفیات بھی ہیں۔ یہ پھول پودے کا
کاروبار بھی خاصا نفع بخش ہے۔ یہ بھی جاری رہنا چاہیے۔''

''بولے۔ ''ہاں یہ تو ٹھیک ہے۔ خیر ساٹھ ستر روپے میں کوئی بی اے۔ ایم اے۔
پاس ماسٹر یا ماسٹرنی رکھ لیں گے۔ جب تک چاہا کام لیا۔ چھٹیاں آئیں نکال باہر کیا۔
بلکہ ہمارے اسکول میں تو تین کے بجائے چھ ماہ کی چھٹیاں ہوا کریں گی تاکہ بچوں کی
صحت پر پڑھائی کا کوئی برا اثر نہ پڑے۔''

''نام کیا رکھا ہے اسکول کا؟'' ہم نے پوچھا۔ ''مدرسہ تعلیم الاسلام اقبال ہائی اسکول
وغیرہ؟''

بولے۔ ''جی نہیں۔ نام تو انگریزی چاہیے۔ فرسٹ کلاس کا ہو جس سے معلوم ہو کہ

ابھی ابھی انگریزوں نے آ کر کھولا ہے۔ کسی سینٹ کا نام تو اب خالی نہیں سینٹ جوزف' سینٹ پیٹرک' سینٹ یہ سینٹ وہ... سب ختم ہوئے۔"

ہم نے کہا۔ "سینٹ سائمن ٹمپلر ہوسکتا ہے۔"

غور کر کے کہنے لگے۔ "نہیں ہمارے اسکول میں جاسوسی کی تعلیم نہیں دی جائے "پھر آکسفورڈ' کیمبرج وغیرہ کے نام پر رکھیے۔"

فرمایا۔ "یہ بھی بہت ہوگئے بلکہ لٹل فوکس اور چلڈرن ہوم اور گرین وڈ وغیرہ بھی کئی ایک ہیں۔ میرا ارادہ "ہمپٹی انگلش اسکول" نام رکھنے کا تھا۔ لیکن وہ بھی کسی نے رکھ لیا۔ آج سارے ناظم آباد کی پلیوں پر یہی لکھا دیکھا" اس پر ہمارے ذہن میں ایک نکتہ آیا۔ ہم نے کہا۔ "ہمپٹی ڈمپٹی دو بھائی تھے۔ بھائی نہیں تھے تو ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے تو تھے ہی۔ آپ نہلے پہ دہلا ماریے۔ "ڈمپٹی انگلش اسکول" نام رکھیے۔ اس میں بچت بھی ہے۔ نیا اشتہار لکھوانے کی ضرورت بھی نہ پڑے گی۔"

"وہ کیسے؟" ازراہِ اشتیاق پوچھنے لگے۔

ہم نے کہا۔ "پینٹر سے کہیے کہ رات کو کوچی لے کر نکلے۔ ہمپٹی کی "ہ" پر کوچی پھیرتا جائے اور اسے "ڈ" بناتا جائے۔ سفیدی برائے نام خرچ ہوگی۔ دو تین روپے سے زیادہ نہ دیجیے گا پینٹر کو۔"

بولے "بات تو آپ بھی کبھی کبھی ایسی کر جاتے ہیں۔۔۔

دانا اندر آں حیراں بماند

مفت اور مفید مشورے کا شکریہ۔ لیکن وہ دس روپے تو دلوایئے اور ایک پان کھلوایئے۔ "ڈبل کتھے چونے کا۔"

یوں اسکول کھُل گیا اور یوں اسکول کھُل رہے ہیں۔ جس کا لکڑیوں کا ٹال نہ چلا اس نے اسکول کھول لیا اور جس کی نرسری کے پودے نہ بکے اس نے بھی اسکول کھول لیا۔ اسکول بڑھتے جاتے ہیں تعلیم گھٹتی جاتی ہے۔ خیر اس میں نقصان بھی کچھ نہیں۔ آج تک کسی کا تعلیم سے کچھ بنا بھی ہے؟

☆☆☆
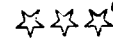
ایک دن ڈاکٹر بال جبریل کے ہاں

پرانے زمانے میں آج سے تیس چالیس برس پہلے اگر کوئی آدمی بیمار ہوتا تھا تو ڈاکٹر کے پاس جاتا تھا۔ ڈاکٹر اسے دیکھتا تھا' اس کا معائنہ کرتا تھا۔ اسے بتاتا تھا کہ تمہیں کیا بیماری ہے۔ اسے دوا دیتا تھا اور ہدایت کرتا تھا کہ جا کر بستر میں لیٹ جاؤ' آرام کرو۔ مریض بستر میں جا کر لیٹتا تھا۔ آرام کرتا تھا۔ دوا پیتا تھا اور یا تو صحت یاب ہو جاتا تھا یا پھر صحت یاب نہیں ہوتا تھا۔

لیکن یہ پرانی باتیں ہیں۔ خوشی کی بات ہے کہ سائنس اور طب کی ترقی کے ساتھ ساتھ یہ صورتِ حال نہیں رہی۔ اب یہ ہوتا ہے کہ پہلے مریض ایک بڑے ڈاکٹر کے پاس جاتا ہے جو کنسلٹنگ ڈاکٹر کہلاتا ہے۔ ماہر یا مشیر کہہ لیجیے۔ وہ اسے دیکھ کر ہوں ہاں کرتا ہے اور اسے دل کا معائنہ کرنے کے لیے ماہر امراض قلب کے پاس بھیجتا ہے۔ وہاں سے واپسی پر خون کا معائنہ کرنے کے لیے خون کے ماہر کے پاس بھیجتا ہے۔ پیشاب کا معائنہ کے لیے پیشاب کے ماہر کے پاس بھیجتا ہے۔

مریض اتنے میں جھنجلا جائے تو اس کے دماغ کا معائنہ کرنے کے لیے ماہر دماغ یا ماہر نفسیات کی طرف ہانک دیتا ہے۔ اس کے بعد اگر اس کے آپریشن کی ضرورت ہو تو ایک ماہر اُسے انجکشن دے کر یا کلوروفام سنگھا کر بے ہوش کرتا ہے اور اس کے بعد زیادہ

تر یہ ہوتا ہے کہ مریض صور اسرافیل کی آواز سن کر اٹھتا ہے تو دیکھتا ہے کہ فرشتے اس کا حساب کتاب لینے کے لیے رجسٹر لیے کھڑے ہیں۔

یہ سب تو ہوا۔ ہم سوچتے ہیں کہ اگر دوسرے پیشوں میں بھی یہی خصوصی ماہرین کی ریل پیل ہوگئی تو کیا ہوگا۔ یہ لیجیے۔ یہ اللہ دتہ صاحب ہیں۔ یہ دو گھنٹے سے "ڈاکٹر بال جبریل" ماہر مویات یعنی بالوں کے اسپیشلسٹ کے کلینک میں بیٹھے باری کا انتظار کر رہے ہیں۔ آخر ایک چوب دار آواز لگاتا ہے۔ "مسٹر آلو شوربہ!"

اللہ دتا صاحب احتجاج کرتے اٹھتے ہیں اور چوب دار کو بتاتے ہیں کہ میرا نام آلو شوربہ نہیں ہے اللہ دتا جنجوعہ ہے۔

اب مریض یا جو کچھ بھی اسے آپ کہیں ڈاکٹر بال جبریل کی حضوری میں پیش ہوتا ہے۔ ان کے نام کے ساتھ ڈگریوں کی ایک لمبی فہرست ہے۔ کاغذ ختم ہو جاتا ہے۔ ڈگریاں ختم نہیں ہوتیں۔

ڈاکٹر ایک نظر مریض کے چہرے پر ڈالتا ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ کچھ بال مریض کے چہرے پر نکل آئے ہیں۔ کچھ نکلنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ تاہم وہ اس سے سوال کرتا ہے۔ اس کی ذاتی زندگی کے بارے میں' اس کے والدین کے بارے میں' اس کی اولاد کے بارے میں کہ بچے کہاں کہاں پڑھتے ہیں۔ اس کے پیشے کے بارے میں' پسند کے بارے میں۔ پھر ایک محدب شیشہ لے کر اس کے چہرے کا معائنہ کرتا ہے۔ پھر سنجیدہ ہو جاتا ہے اور کہتا ہے سمجھ گیا' سمجھ گیا' آپ نے کب سے شیو نہیں کی۔

مریض بتاتا ہے کہ "دو دن سے نہیں کی۔"

ڈاکٹر کہتا ہے۔ "میرا اندازہ صحیح نکلا۔ آپ کو شیو کرانے کی ضرورت ہے۔"

مریض کا چہرہ لٹک جاتا ہے۔ اسے معلوم ہے کہ ڈاکٹر کا فرض اس کے مرض سے آگاہ کرنا ہے۔ خواہ وہ حقیقت کتنی ہی خوف ناک کیوں نہ ہو۔ اسے خود بھی اپنے

بارے میں یہی شبہ یا گمان تھا۔ بیوی نے بھی یہی بتایا تھا لیکن وہ تو عورت ذات ہے۔ دل میں دبدھا تھی کہ شاید ڈاکٹر کچھ اور بتائے۔ کچھ اور تشخیص کر دے۔ شاید اسے مہلت دے اور اسے حقیقت کا سامنا فوراً نہ کرنا پڑے۔ مریض ممیاتا ہے اور ڈاکٹر سے پوچھتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کیا اسے ایک دو دن کے لیے ملتوی کر سکتا ہوں۔ آج کل دفتر میں کام زیادہ ہے۔ فرصت نہیں۔ اسپیشلسٹ سختی سے کہتا ہے۔ "میں نے کہہ دیا نا کہ تمہیں شیو کی ضرورت ہے۔ تم چاہو تو اسے ملتوی کر دو۔ لیکن پھر نتائج کا ذمہ دار میں نہ ہوں گا۔"

مریض نے ایک لمبی آہ کھینچی۔ "اچھا اگر یہی بات ہے تو میں تیار ہوں۔ کر دیجیے میری شیو۔"

ڈاکٹر بال جبریل ماہر مویات مسکرایا۔ اس نے کہا۔ "جناب میں شیو نہیں کرتا میں تو صرف بالوں کا ماہر ہوں۔ میں تو تشخیص کرتا ہوں۔ اب آپ کو ماہر ریش و بروت ڈاکٹر سلمانی کے پاس بھیجتا ہوں۔" اس نے گھنٹی بجائی، اس کی سیکرٹری دوڑی آئی۔

"مس زلف دراز۔ ان صاحب کے نام کا کارڈ بنا دو شیونگ روم کے لیے۔ اگر ڈاکٹر سلمانی ہوں تو ان سے کہو اُن کے چہرے پر مُو ربائی کا عمل بذریعہ مقراض و تیغ کریں اور مشاطگی کے لیے شانہء صد دندانہ کا استعمال کریں۔"

مسٹر اللہ دتا اور تو کچھ نہ سمجھے' تیغ کے نام پر گھبرائے' انہیں معلوم نہ تھا کہ یہ استرے کا اصطلاحی نام ہے۔ تاہم چُپ رہے کہ اب جو ہو سو ہو۔ اتنا ضرور پوچھا کہ "کیا اس کے لیے مجھے بے ہوش کیا جائے گا۔ کلوروفام سنگھایا جائے گا۔؟"

ڈاکٹر صاحب نے پھر تبسم کیا اور کہا۔ "میری دانست میں اس کی ضرورت نہیں لیکن زیادہ صحیح ڈاکٹر سلیمانی ہی بتا سکتے ہیں۔ میرے خیال میں مس زلف دراز۔ ڈاکٹر صاحب کے پاس بھیجنے سے پہلے انہیں ماہر صابنیات کے پاس لے جاؤ وہ ان کے

چہرے پر صابن لگائیں۔ ماہر تولیات ان کے گلے میں تولیہ باندھیں۔"

سیکریٹری نے کچھ ڈاکٹر صاحب کے کان میں کہا۔ انہوں نے فکرمند ہو کر کہا۔ "یہ تو افسوس کی بات ہے کہ ماہر صابنیات گھنٹے بھر بعد ملیں گے۔ دونوں ایک مریض کے ساتھ مصروف ہیں۔ بڑا سنگین کیس ہے۔ پوری داڑھی صاف کرنی ہے۔ اور ہاں مس زلف دراز۔ ڈاکٹر سلمانی تو داڑھی مونڈیں گے۔ کان کے اوپر کے بال صاف کرنے کے ماہر ڈاکٹر دراز گوش بھی ہیں یا آج نہیں آئے۔"

مریض نے کہا۔ "کیا اس کے لیے علیحدہ اسپیشلسٹ ہے داڑھی مونڈنے والا کانوں کے آس پاس کے بال صاف نہیں کر سکتا۔"

ڈاکٹر بال جبریل نے کہا۔ "بعض لوگ کر لیتے ہیں لیکن خطرہ رہتا ہے کہ قینچی سے کان کی لو نہ کٹ جائے۔ تم جانو آج کل حجامت کی سائنس بھی کافی ترقی کر گئی ہے۔"

"اچھی بات ہے۔" مریض نے راضی بہ رضا ہو کر کہا۔

"اس کے بعد ان کو ماہر شمپوئیات کے پاس جانا ہوگا۔ لیکن اس سے پہلے امراض قلب کے ماہر کے پاس ہو آئیں۔ یا شاید اس کی ضرورت نہ ہو۔ آپ ہٹے کٹے معلوم ہوتے ہیں۔ بعض لوگ دوسری طرح کے ہوتے ہیں۔ ان کا شمپو کیا جائے تو بے ہوش ہو جاتے ہیں اور چمپی کی جائے تو بعض اوقات جاں بر نہیں ہوتے۔ اور اس سارے عمل کے بعد میرے خیال میں جلائے پاپوش کی ضرورت بھی پڑے گی۔"

مریض کے کان کھڑے ہوئے لیکن سیکریٹری صاحبہ نے دلاسا دیا کہ مطلب بوٹ پالش سے ہے۔

اب مریض نے کہا۔ "ڈاکٹر صاحب فیس۔ مشورے کی فیس۔"

ڈاکٹر نے سیر چشمی سے کہا۔ "اس کی آپ فکر نہ کریں۔ سیکریٹری صاحبہ وصول کر کے ہی آپ کو جانے دیں گی۔ ایمرجنسی کے لیے دروازے پر دو پہلوان بھی آپ نے

دیکھے ہوں گے۔ اچھا خدا حافظ۔ اگلے آدمی کو آواز دو۔"

اور جب بے چارے اللہ دتا صاحب ان سارے مراحل سے فارغ ہو گئے۔ داڑھی گھٹوا چکے اور چمپی کرا چکے تو "جلائے پاپوش" کے شعبے میں آئے۔ وہاں ایک لڑکا بوٹ پالش اور برش اور صافی وغیرہ لیے بیٹھا تھا۔ مسٹر اللہ دتا نے اطمینان کی سانس لی کہ ایک کام تو ایسا ہے جس میں ماہرین کی ضرورت نہیں۔ پرانی چال پر چل رہا ہے۔

"کون سے پاؤں پر پالش کروں صاحب" لڑکے نے پوچھا۔

"بھئی اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ اچھا داہنے پاؤں سے شروع کرو۔"

وہ بولا۔ "جناب اس کے لیے آپ کو دوسرے کمرے میں جانا پڑے گا۔ میں صرف بائیں پاؤں کے جوتے پر پالش کرتا ہوں۔" وہ بھی صرف بوٹ پر۔ چپل اور سینڈل کی پالش کے ماہرین دوسرے ہیں۔"

(بہ شکریہ لی کاک)

☆☆☆

نسخہ بھونکتے کتے سے بچنے کا!

ایک اخبار میں بھونکتے کتے سے بچنے کا نسخہ شائع ہوا ہے لکھا ہے۔

"اگر آدمی ساکت کھڑا ہو جائے۔ بازو اور ہاتھ نیچے کی طرف سیدھے کر لے اور دوسری طرف دیکھنے لگے تو بھونکتا ہوا کتا کچھ دیر کے بعد خاموش ہو جائے گا اور پھر وہاں سے چلا جائے گا۔"

اخبار نے یہ نہیں لکھا کہ یہ نسخہ کہاں سے لیا گیا ہے۔ اوپر فقط "جدید طبی تحقیق" کا عنوان دیا گیا ہے۔ یہ بھی مذکور نہیں آیا کتوں کو بھی مطلع کر دیا گیا ہے کہ ان پر اس ضابطہ اخلاق کی پابندی ضروری ہے۔ یہ اعتراض بھی کچھ لوگ کریں گے کہ اگر انسان حسب ہدایت بھیگی بلی بن کر منہ دوسری طرف کر کے کھڑا ہو جائے اور کتا اس کی ٹانگ لے لے تو ایڈیٹر اخبار ہذا کس حد تک ذمہ دار ہوگا۔ ہمارے نزدیک تو یہ اعتراض بے محل اور ناواجب ہے۔ بھونکنا ایک فعل ہے اور کاٹنا الگ۔ کتا کاٹ لے تو سیدھا سیدھا اسپتال جا کر چودہ انجکشن پیٹ میں لگوا لیجیے اور مزے کیجیے۔ اصل کوفت تو کتے کی عف عف سے ہوتی ہے اور اس کے لیے یہ نسخہ مجرب ہے۔

ان امور میں اصل مشکل اس وقت پیش آتی ہے جب کہ کتے کو معلوم نہ ہو کہ اسے اخبار میں چھپی ہوئی ہدایت کی پابندی کرنی ہے یعنی کوئی شخص بازو لٹکا کر دوسری طرف

منہ کرے تو اسے دم دبا کر کھسک جانا چاہیے۔ یا تو بعض کتے ناخواندہ ہوتے ہیں، یا اخبار نہیں پڑھتے یا جان بوجھ کر بات ٹال جاتے ہیں۔ پچھلے دنوں ایک مشہور ہوٹل کے لاؤنج میں ایک کتے کو استراحت کرتے پایا گیا۔ مینجر صاحب بہت خفا ہوئے۔ اسے کان سے پکڑ کر دروازے پر لے گئے جہاں موٹے موٹے لفظوں میں صاف لکھا ہوا تھا: "جن کتوں کے ساتھ ان کا مالک نہ ہو، ان کا ہوٹل میں آنا منع ہے۔"

بہ نظر احتیاط ہم لوگوں کو مشورہ دیں گے کہ وہ اس اخبار کا شمارہ ہمیشہ اپنے ساتھ رکھیں جس میں یہ ترکیب درج ہے۔ اگر کوئی کتا بھونکنے سے باز نہ آئے بلکہ کاٹنے پر اتر آئے تو جدید طبی تحقیق والا صفحہ اس کے سامنے کر دیں پھر بھی باز نہ آئے تو ڈنڈے سے اس کی خبر لیں۔

یہ ڈنڈے سے خبر لینے کی ہدایت ہماری طرف سے ہے۔ احباب مذکور کی ذمے داری نہیں۔ ہماری طبی تحقیق اتنی جدید نہ سہی تاہم مجرب ضرور ہے۔ ڈنڈا بڑی کار آمد چیز ہے اور بہت سے نسخوں میں پڑتا ہے۔ پرانے زمانے میں اسے تنبیہ الغافلین کہتے تھے۔ اور... شاگرد اسی کو احترام کی نظر سے دیکھتے تھے۔ کچھ مدت ہوئی ہم نے ایک کارٹون دیکھا کہ ایک استاد اپنے شاگرد رشید کو ایک موٹی سی کتاب سے دھڑا دھڑ پیٹ رہا ہے۔ کتاب کا نام بھی نظر آ رہا تھا۔ "دی چائلڈ سائیکالوجی۔ یعنی بچوں کی نفسیات۔"

ایک زمانے میں اخباروں سے صرف خبروں کا کام لیا جاتا تھا۔ یا پھر لوگ سیاسی رہنمائی کے لیے انہیں پڑھتے تھے۔ آج تو اخبار زندگی کا اوڑھنا بچھونا ہیں۔ سیٹھ اس میں منڈیوں کے بھاؤ پڑھتا ہے۔ بڑے میاں ضرورت رشتہ کے اشتہارات ملاحظہ کرتے ہیں اور آہیں بھرتے ہیں۔ عزیز طالب علم فلم کے صفحات پر نظر ٹکاتا ہے اور علم کی دولت نایاب پاتا ہے۔ بی بی اس میں ہنڈیا بھوننے کے نسخے ڈھونڈتی ہے اور بعض لوگوں نے تو اخباری نسخے دیکھ دیکھ کر مطب کھول لیے ہیں۔ پچھلے دنوں عورتوں کے

ایک اخبار میں ایک بی بی نے لکھ دیا تھا کہ پریشر ککر تو مہنگا ہوتا ہے اسے خریدنے کی ضرورت نہیں۔ یہ کام بہ خوبی ڈالڈا کے خالی ڈبے سے لیا جاسکتا ہے۔ کفایت شعار بیویوں نے یہ نسخہ آزمایا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کئی زخمی ہوئیں اور ایک آدھ بی بی تو مرتے مرتے بچی۔ ایسے نسخوں پر عمل کرتے ہوئے وہ حکایت نہ بھولنی چاہیے کہ ایک صاحب کی بھینس کو اپھارہ ہوگیا تھا۔ وہ ایک جہاں دیدہ بزرگ کے پاس دوڑے دوڑے گئے کہ ''پارسال آپ کی بھینس کو بھی تو اپھارہ ہوا تھا۔ آپ نے کیا دوا دی تھی؟''

ان بزرگ نے کہا۔ ''سیر بھر سوڈا کاسٹک پانی میں گھول کر پلا دیا تھا۔'' وہ شخص گیا اور یہ نسخہ آزمایا۔ بھینس اسے نوش جاں کرتے ہی مرگئی۔ وہ شخص پھر ان بزرگ کے پاس آیا اور شکایت کی کہ حضور میری بھینس تو یہ نسخہ استعمال کرتے ہی مرگئی۔

''بھئی مرتو میری بھینس بھی گئی تھی۔'' ان بزرگ نے نہایت حلم اور متانت سے فرمایا۔

ہم دس بارہ روز فلو میں مبتلا رہے اور بستر سے نہ اٹھ سکے۔ اس میں بھی کچھ دخل جدید طبی تحقیق کو ہے۔ ایک صاحب روحانی اور نفسیاتی علاج کرتے ہیں۔ انہوں نے ہدایت کی کہ اپنے دل میں یہ سمجھ لو کہ تمہیں فلو ولو کچھ بھی نہیں ہے۔ سب وہم ہے۔ ہم نے اس نسخے پر عمل کیا۔ بلکہ اگر کوئی کہتا تھا ''میاں دوا کرو تمہاری کھانسی تو خطرناک معلوم ہوتی ہے۔'' تو ہم یہی جواب دیتے تھے کہ میاں ہوش کی دوا کرو۔ کون سی کھانسی کیسی کھانسی۔ ان کا علاج ختم ہوا تو دوسرے کرم فرما نے ایک اخبار میں سے دیکھ کے بتایا کہ دو دن کا مکمل فاقہ کرو اور پیاز کی گٹھی سونگھتے رہو۔ اب ہم نے یہ عمل کیا۔ اتفاق سے نقوی کلینک والے ڈاکٹر نقوی صاحب نے دیکھ لیا اور کہا ''میاں کیوں پاگل ہو رہے ہو۔ اخبار والے ہو کر بھی اخبار کی باتوں پر یقین کرتے ہو۔'' یہ لو کیپسول اور یہ رہا مکسچر۔'' خیر اللہ نے صحت دی۔ ہم نے ان نفسیاتی معالج کو پکڑ لیا کہ حضرت ہم تو ڈاکٹر کی دوا سے ٹھیک ہوئے۔ آپ کو پچھلے دنوں فلو ہوا تھا آپ کیسے نفسیاتی علاج سے ٹھیک ہوگئے؟'' ہنس کے بولے ''میاں میں بھی ڈاکٹر ہی کی دوا سے ٹھیک ہوا تھا۔''

☆☆☆

ہماری باتیں ہی باتیں ہیں

ایک بی بی نے کہ مشہور صحافن ہیں ایک اخبار میں مضمون لکھا ہے جس میں کاہلی کی خوبیاں گنائی ہیں۔ کاہل ہم بھی ہیں لیکن یہ کبھی خیال نہ آیا تھا کہ ہمارا تصور جاناں کیے ہوئے لیٹے رہنا بھی ایک کمال ہے اور جس طرح کا بھی کسی میں ہو کمال اچھا ہے۔ یہ بی بی بھی ہماری عادت کی ہیں۔ دن کے بارہ بجے ناشتا کرتی ہیں وہ بھی اس لیے کر لیتی ہیں کہ ان کے میاں ان کو ساڑھے گیارہ بجے کان سے پکڑ کر اٹھا دیتے ہیں۔ وہ اپنی بیگم کے برعکس بہت مستعد آدمی ہیں۔ گیارہ ہی بجے اٹھ بیٹھتے ہیں۔ ان کا ایک بھائی تو ان سے بھی بڑھ گیا ہے۔ یعنی اور سویرے جاگ جاتا ہے۔ ترکیب یہ کی ہے کہ رات ہی کو صبح دس بجے کا الارم لگا لیتا ہے۔ ادھر دس بجے ادھر اس نے آنکھ کھولی۔ بستر میں چند پلٹے کھائے۔ دو ایک بار آنکھیں بند کیں۔ ذرا سا اونگھا۔ بہر حال ساڑھے دس بجے تک ضرور وہ اپنا جھبر جھالا پہن اخبار سمیٹ غسل خانے میں چلا جاتا ہے۔

ان بی بی نے دلائل و براہین سے ثابت کیا ہے کہ دنیا میں جتنے کام کیے کاہلوں نے کیے۔ یہ بھاگ دوڑ کرنے والے کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ ہم مشرقیوں کے ہاتھ میں آ کر تو خیر ہر اچھی چیز خراب ہو جاتی ہے حتیٰ کہ کاہلی بھی۔ لوگوں نے افیونیوں کے لطیفے گھڑ لیے ہیں کہ ایک شخص بیچ رستے میں پاؤں پھیلائے پڑا تھا۔ ایک گاڑی بان اس

راستے آیا تو اس نے آواز دی۔ ''اے پوستی اٹھ ورنہ ابھی تیری.....ٹانگیں کچلی جائیں
گی۔'' اس نے اپنے پاؤں کی طرف دیکھا وہاں اسے جوتا نظر نہ آیا جو گھر سے پہن کر
چلا تھا کیونکہ سوتے میں کسی نے اتار لیا تھا۔ مطمئن ہو کر اس نے گاڑی بان سے کہا
''گزار دے گاڑی! یہ میری ٹانگیں نہیں ہیں۔''

ملاحظہ فرمایئے! کتنا فضول لطیفہ ہے۔ جو سنے گا کاہلوں کے متعلق ہرگز اچھی رائے
قائم نہ کرے گا۔ اس کے مقابلے میں اہل مغرب نے اس سے جو شاندار فائدے
اٹھائے ہیں ان کا ذکر سنیئے۔ ان بی بی ہی نے مثال دی ہے کہ اگر نیوٹن کاہل نہ ہوتا بینچ
پر اپنے آپ میں مگن بیٹھا نہ رہتا تو آج کشش ثقل کا راز کیسے معلوم ہوتا؟ ہوا یوں کہ
درخت سے سیب گرا۔ کوئی اور ہوتا تو اسے جیب میں ڈال لمبا ہوتا۔ کھانے کے بعد
کھاتا اور ڈاکٹر کو بھگاتا۔ یہ اپنی جگہ سے مارے کاہلی کے اٹھے ہی نہیں۔ بس سوچتے
رہے کہ یہ سیب کیوں گرا۔ سوچتے سوچتے کشش ثقل دریافت کر لی۔ یہی جیمز واٹ
نے کیا۔ کیتلی کے پاس بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ بھاپ سے ڈھکن جو ہلنے لگا تو بجائے اس
کے کہ کوئی بوجھ اس پر رکھ کر اچھی طرح دبا دیتا کیونکہ ایسا واقعہ کیتلی کا سرپوش ہلنے کا دنیا
میں پہلی بار نہ ہوا تھا تو آج ہم یونہی چنگے بیٹھے ہوتے۔ یہ ریل ویل یہ انجن ونجن کچھ
بھی نہ ہوتے۔ عورتیں آٹا تک ہاتھ کی چکی سے پیستیں۔ ان کو کاہلی یا دیگر موضوعات پر
لکھنے کی فرصت ہی نہ ملتی۔

باوجود ان مضبوط دلائل اور شواہد کے جو ان بی بی نے اپنے مضمون میں دیے ہیں'
ہمیں شبہ ہوتا ہے کہ موجد بننے کے لیے شاید کاہلی کے علاوہ کچھ اور صلاحیتون کی بھی
ضرورت ہو۔ بی بی جی نے خود لکھا ہے کہ میں باوجود دست الوجود ہونے اور کئی کئی گھنٹے
بستر میں لیٹنے کے کوئی اچھوتا خیال نہیں پیش کر سکی۔ ادب عالیہ نہیں تخلیق کر سکی۔ ہم
سوچتے ہیں کہ نیوٹن کے بجائے ہم باغ میں بیٹھے ہوتے اور سیب ہمارے سامنے گرتا تو

کیا کرتے' بس اٹھا کے کھا لیتے۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ کشش ثقل کا کھڑاگ ہماری سمجھ میں
اب بھی نہ آیا۔ سیب پک گیا تھا۔ ڈنڈی کمزور ہو گئی تھی ذرا سی ہوا چلی اور وہ ٹوٹ کے
آن گرا۔ نیوٹن کو تو ابھی جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے ہیں۔ سیب تو کشش ثقل دریافت
ہونے سے بہت پہلے گرا کرتے تھے۔ اچھا ایک اور بات سنیئے۔ دنیا میں اور بہت سے
کاہل ہیں۔ ہمارے جیسے اور بی بی جیسے جن کے آس پاس چیزیں گرتی رہتی ہیں اگر
سب کے سب کشش ثقل دریافت کرنے بیٹھ جائیں تو دنیا کا اور کوئی کام نہ کر سکیں۔
اب یہی دیکھیے اس مضمون کے لکھنے کے دوران ہی چھت سے پلاسٹر کا ایک ٹکڑا عین
ہمارے سامنے گرا۔ ہم نے کوشس کی کہ اس میں کشش ثقل دریافت کریں۔ نوکر کو بلا
کر وجہ پوچھی۔ اس نے بھی یہی کہا کہ جی پلستر پرانا ہو رہا ہے۔ اس لیے گر جاتا ہے۔
کشش ثقل کی طرف اس کا بھی دھیان نہ گیا۔ اب لیجیے بھاپ کی بات ہم صبح ناشتا
چولھے کے پاس ہی بیٹھ کر کرتے ہیں۔ آج ہم نے بہت کوشش کی کہ کیتلی کی بھاپ کو
دیکھ کر ریل کا نہ سہی کوئی اور چھوٹا موٹا انجن ہی ایجاد کر لیں۔ لیکن نہ ہوا۔ اگر سبھی کاہل
موجد ہو جاتے تو کیا کہنے۔ جسے دیکھو بستر میں لیٹا ریل کا انجن ایجاد کر رہا ہے۔

یہ نہ سمجھا جائے کہ ہم حاشا وکلا کاہلی کی خوبیوں کے منکر ہیں۔ جو بُرا بھلا ہم کر لیتے
ہیں کاہلی کی بہ دولت ہے۔ کاہل نہ ہوتے تو کوئی سڑک بنا رہے ہوتے۔ مشین چلا
رہے ہوتے۔ یہ جو ہم نے شاعری میں نازک نازک مضمون باندھے ہیں اور غیب سے
مضامین کو خیال میں لاتے ہیں کچھ بھی نہ ہوتا۔ اگر کاہل نہ ہوتے تو شاید زندہ بھی نہ
ہوتے۔ ہمارے لواحقین اب تک بیمے کی رقم خرد برد کر چکے ہوتے۔ ہمارے پڑوس
میں حکیم عمر دراز رہتے تھے۔ نہایت چاق و چوبند ہر روز صبح چار بجے اٹھ کر ورزش کرتے
تھے۔ پھر ٹھنڈی ہوا کھانے کو سیر کو نکل جاتے تھے۔ ہمیں بہت ترغیب دی۔ ہم کبھی ان
کی باتوں میں نہ آئے بلکہ لحاف کو سر کی طرف کچھ اور کھینچ لیا۔ نتیجہ ان کے لالچ کرنے

کا یہ ہوا کہ ایک روز سڑک پر مع اپنی چھڑی کے اور صحت کے ایک ٹرک کے نیچے آ گئے۔

یہ بات تو ہر کوئی مانے گا کہ ٹرک سڑکوں پر چلنے والوں پر زیادہ چڑھتے ہیں' بہ نسبت چارپائی پر لیٹنے والوں کے۔

کاہلی کی قدر کاہل ہی کر سکتا ہے۔ بجز ارادہ پرستی خدا کو کیا جانے۔ وہ بدنصیب جسے بختِ نارسا نہ ملا۔ اقبال کاہل تھے' چارپائی پر دُھسا اوڑھے لیٹے رہتے تھے کیسی کمال کی شاعری کر گئے۔ وہ ایک مرد تن آسان تھا۔ تن آسانوں کے کام آیا۔ غالب بھی تصورِ جاناں کیے پڑے رہتے تھے۔ آج ان کی عظمت کو یومِ غالب منانے والے تک تسلیم کرتے ہیں۔ جو بڑے چلتے پُرزے اور چاق و چوبند آدمی ہیں۔ بد اچھا بدنام بُرا کے ذیل میں ایک اور مثال لیجیے۔ ہمارے معاشرے میں ان پڑھ کو بُرا سمجھا جاتا ہے اور تعلیم یافتہ لوگوں کے پراپیگنڈے میں آ کر لوگ تعلیم کو اچھا جانتے ہیں۔ اس کی تعریف کرتے نہیں تھکتے۔ کل ایسے ہی ایک صاحب کو ہم نے ایک سوال کر کے خاموش کر دیا۔ وہ یہ کہ اکبر بڑا آدمی تھا یا بہادر شاہ ظفر؟

اکبر بالکل ان پڑھ تھا۔ نہ ظفر کی طرح دل گداز غزلیں کہہ سکتا تھا نہ استاد ذوق کا صحبت یافتہ تھا نہ طغرہ نویسی میں خوش خطی دکھا سکتا تھا۔ بایں ہمہ کوہ ہمالہ تا راس کماری حکومت کر گیا۔ اس نے مرتے وقت اتنی بڑی سلطنت مغلیہ چھوڑی اور عالم فاضل بہادر شاہ ظفر نے نہ کسی کی آنکھ کا نور ہوں' نہ کسی کے دل کا قرار ہوں۔

(باتیں انشا جی کی)

حکیم جی لندن میں پہنچ گئے

ولایت والوں کو اپنے ملک کو ولایت بنانے میں جانے کتنی صدیاں لگیں۔ ہمارے پاکستانی اور ہندوستانی بھائی اسے چند ہی سال میں اپنے ڈھب پر لے آئے ہیں۔ لندن اور برمنگھم کے اردو اخباروں پر نظر ڈالیے آپ کا جی نہال ہو جائے گا۔ بہت کچھ جو انگریزی زبان میں چھپے تو شاید گرفت میں آ جائے۔ اُردو میں یہ خوبی چل رہا ہے۔ ڈاکٹروں کے معاملے میں ایسی سختی ہے کہ فاطمہ جناح میڈیکل کالج کی فارغ التحصیل ڈاکٹرنیوں کو بھی فی الحال پریکٹس کرنے کا اذن نہیں لیکن ہمارے عطائی بھائیوں کی راہ انگریز نہیں روک سکا۔ چنانچہ جہاں اور لوگ پہنچے وہاں زنانہ اور مردانہ پوشیدہ اور پیچیدہ بیماریوں کا مجرب اور حکیمی علاج کرنے والے بھی پہنچ گئے۔ کل یہاں کے ایک اُردو اخبار میں اشتہار دیکھا کہ چیین ہیلتھ سینٹر آرام باغ روڈ کے ممتاز ماہر جنسیات نے جن کے پاس آر۔ ایم۔ پی کی پُراسرار ڈگری ہے یہاں کے علاوہ لوگوں کے پُر زور اصرار پر لندن میں بھی اپنا مستقل دواخانہ کھول دیا ہے۔ جس میں خط و کتابت صیغہ راز میں رکھی جاتی ہے۔ حکیم صاحب نے اشتہار کے ساتھ اپنی تصویر بھی دی ہے۔ اُدھر نکڑ پر ہندوستان کے حکیم ایس ایل بٹ ناگر صاحب بھی جو اٹھارہ میڈیکل کتابوں کے مصنف ہیں، جس میں ہوم ڈاکٹر بھی شامل ہے، لوگوں کے پُر زور اصرار کی تاب نہ لا کر

تشریف لے آئے ہیں۔ان کے اشتہار کے بہ موجب لاکھوں آدمی گزشتہ تین سال میں ان کے چشمہ فیض سے سیراب ہو چکے ہیں۔اتنی بڑی ولایت میں یہ دو حکیم کافی نہ تھے لہٰذا حکیم صاحب عبدالرحمٰن معالج خاص مردانہ کو بھی مانچسٹر میں مطب کھولنا پڑا ہے یہ اپنے کو نیچرو پینتھ اور ہربلسٹ لکھتے ہیں۔یعنی قدرتی طریقوں اور جڑی بوٹیوں سے علاج کرنے والے ان کا دعویٰ حذاقت بے بنیاد نہیں ہے۔بلکہ اشتہار کہتا ہے۔تقریباً ایک سال کا عرصہ ہوا ایک صاحب اپنے ایک انیس سالہ بھتیجے اور اس کی سولہ سالہ دلہن کو لے کر مانچسٹر آئے اور حکیم صاحب سے بیان کیا کہ اس لڑکے کی شادی کو دو ہفتے ہوئے ہیں لیکن اس نے خودکشی کی کوشش بھی کی ہے۔اس کا کچھ علاج کیجیے حکیم صاحب نے تسلی دی اور دوائی بھی دی لڑکے نے تین ماہ دوائی استعمال کی۔چند ہفتے ہوئے۔وہ حکیم صاحب کے لیے ایک قمیص اور ٹائی اور دس پونڈ لڈو بطور تحفہ لائے۔اور خوشخبری سنائی کہ جی بابے کی کرپا اور آپ کے علاج سے سب کچھ ٹھیک ہے میرے بھتیجے کے ہاں لڑکا پیدا ہوا ہے۔اور ہم نے ڈھائی من لڈو تقسیم کیے ہیں۔لڈو کھاتے ایک اور ہندوستانی ماہر کی طرف آیئے۔یہ لندن میں ہیں۔ایشیا کے مشہور و معروف معالج۔ماہر جنسیات حکیم کے تر دیدی۔ان کی ڈگریاں اور زیادہ لمبی چوڑی ہیں۔

"این۔ڈی۔ڈی۔او۔پی۔اے۔اے۔آر۔ایس۔ایچ۔"

حیرت ہے کہ انہوں نے باقی کے حروفِ تہجی کیوں چھوڑ دیے۔اے سے زیڈ تک استعمال کرنے میں کیا امر مانع تھا۔یہ کھوئی ہوئی طاقت مردمی کے علاوہ کھانسی زکام ،نزلہ،گٹھیا اور پیٹ کے درد کا بھی حکیمی علاج کرتے ہیں۔البتہ ملاقات کے لیے فون پر وقت مقرر کرنا پڑتا ہے۔بہ قول خود طاقت کی دوائیوں کے بادشاہ اور انٹرنیشنل شہرت کے مالک،حکیم ہری کشن لال صاحب ماہر امراض پوشیدہ۔خود تو مصروفیات کے باعث تشریف نہیں لا سکے لیکن اپنا اشتہار لندن میں چھپوا دیا ہے۔حکیم صاحب کو جھانسی

یونیورسٹی نے کئی اعزازی ڈگریاں دے رکھی ہیں۔مثلاً ایم،ایس سی،اے اور ڈی ایس ،ای،اے۔ان کا مطلب کیا ہے؟ ڈگری کا مطلب نہیں پوچھا جاتا۔لمبائی دیکھی جاتی ہے۔ولایت والوں کی آسانی کے لیے انہوں نے اپنے ریٹ پونڈوں میں دیے ہیں۔شاہانہ علاج ۵۲ پونڈ۔درمیانی علاج ۳۲ پونڈ عام علاج ۱۸ پونڈ اور غریبانہ علاج ۱۲ پونڈ۔حکیم صاحب نے خدمت خلق کے جذبے سے یہ بھی اعلان کیا ہے کہ لاکھ روپے کی قیمتی کتاب پیغامِ جوانی مفت حاصل کریں۔اس میں لاکھ روپے کے پیغامِ جوانی کے علاوہ کئی لاکھ روپے کے حکیم صاحب کی دوائیوں کے اشتہار بھی ضرور ہوں گے۔سب مریضوں کے لیے مفت۔

پاکستانی اور ہندوستانی بھائیوں کے لیے تازہ ترین خوش خبری یہ ہے کہ حکیم جے ایم کوشل بھی جو کھوئی ہوئی قوتوں کو بحال کرنے میں یدطولیٰ رکھتے ہیں۔صرف پانچ روز کے لیے بریڈفورڈ میں ورود فرما ہوئے ہیں۔آپ کی ڈگریوں کا بھی شمار نہیں۔بی۔اے(پنجاب) اے۔بی۔ایچ۔ایس (بنارس یونیورسٹی) و بنارس یونیورسٹی بی۔اے (پی۔یو)۔اے۔بی۔ایم۔ایس (بی۔ایچ۔یو) ڈگری ڈاکٹری کی نہ بھی ہو تب بھی لیاقت کی دلیل تو ہے۔

☆☆☆

حکیموں کے علاوہ سب سے زیادہ اشتہار ہمارے ان پاکستانی ہندوستانی بھائیوں کے ہیں جو وطن واپس آنے والوں کو ٹیلی ویژن،ریفریجریٹر،ایئرکنڈیشنز،ٹیپ ریکارڈر،ٹائپ رائٹر،سلائی کی مشین وغیرہ فراہم کرتے ہیں۔

ایک صاحب ۶۰ فیصدی ڈسکاؤنٹ پر دوسرے ۶۵ فیصدی پر اور تیسرے ستر فیصدی ڈسکاؤنٹ پر ہم نے دیکھا نہیں لیکن سنا ہے۔بعض فرمیں سو فیصدی ڈسکاؤنٹ پر بھی یہ سامان فراہم کرتی ہیں۔

☆☆☆

آپ سوچتے ہوں گے کہ ان بزرگ نے جن کا ذکر ہم نے کیا ہے، ڈھائی من لڈو کہاں سے لیے ہوں گے۔ یاد رہے کہ ایشیائی مٹھائیوں کا عظیم الشان مرکز سویٹ سینٹر، جو جہلم والے مشہور و معروف پہلوان صاحب کی دکان ہے۔ شادی بیاہ اور دوسری تقریبات کے لیے بہ کفایت خالص گھی کی مٹھائیاں فراہم کرتا ہے۔ یہاں سے آپ گلاب جامن، رس ملائی، رس گلہ جلیبی برفی لڈو، پیڑا، بالوشاہی، پھینیاں وغیرہ وغیرہ وغیرہ ہی نہیں دہی بھلے آلو چھولے، سموسے، نمکین دالیں اور سویاں وغیرہ بھی خرید سکتے ہیں۔

مٹھائی سے رغبت نہ ہو تو شہ روز محل ریسٹورنٹ میں تشریف لائیے اور تندوری مرغ، تندوری روٹی، چکن اور مٹن تکے، قورمہ، کوفتہ وغیرہ کھائیے۔ یہ چیزیں حلال گوشت سے تیار ہوتی ہیں۔ جس سے آپ کا پیٹ بھر جائے اور خمار آنے لگے تو بھی مضائقہ نہیں۔ رضائی سینٹر سے آپ کو ہر قسم کی آرام دہ رضائیاں مل سکتی ہیں۔ شنیل کی ڈبل رضائی ۱/۲ ۵ پونڈ ساٹن ڈبل ۱/۲ ۳ پونڈ چھینٹ ڈبل بھی ساڑھے تین پونڈ، میں لیجیے اور پاؤں پسار کر سوئیے۔

اگر آپ کا سونے کو جی نہیں چاہتا تو سینما دیکھیے۔ جتنی فلمیں یہاں لگی ہوئی ہیں۔ پورے ہندوستان اور پاکستان میں نہ لگی ہوں گی۔ پلسیم الیسولڈوو (لنڈن) میں عندلیب (پاکستانی) ڈاکو منگل سنگھ ہے۔ یملا جٹ ہے۔ جس میں چاچا سنت رام جی کام کر رہے ہیں۔ یہ پیغام نصیحت، ہم جولی، سینری، تیسری منزل۔ دیوداس ان پڑھ وغیرہ۔ کلاسک سینما میں ساون آیا جھوم کے، پتھر کے صنم وغیرہ اور ڈین میں دیور بھابی اور زرقا۔ لکسر سینما مرنگھم میں'' سجن بیلی، تیرے عشق نچایا وغیرہ۔

الائٹ سینما میں (ڈو) سنچری میں میرے حضور، اور جی چاہتا ہے۔ مارلبرو، بریڈفورڈ

میں سپنوں کا سوداگر کیمیو۔ کیمبر لندن میں، آشیرواد، بمبئی کا بابو ناز سینما لندن میں استادوں کے استاد، کلاسک میں میرے محبوب۔ ایک لمبی لسٹ کوئی کہاں تک گنوائے زندہ پروگرام چاہیے تو اس کا بھی انتظام ہے۔ سردار آسا سنگھ مستانہ بھی یہاں ہیں۔ سریندر کور بھی اور پرکاش کور بھی آسا سنگھ مستانہ جی پنجابی گیتوں کے شہنشاہ ہیں، ہیر وارث شاہ گاتے ہیں۔ اور یہ دونوں یہاں ہیر کے علاوہ، ٹپے گاتی ہیں۔ اور پنجابی لوگ گیت سناتی ہیں۔ کبھی کبھی قوالیاں بھی ہوتی ہیں۔ آج کل کوئی قوال تو آئے ہوئے نہیں ہیں۔

البتہ ایک مشہور درگاہ کے گدی نشین صاحب کا اشتہار چھپا ہے کہ عرس مبارک میں تشریف لائیں نہ لائیں تو گھر بیٹھے اپنی نیک کمائی کا پیسہ حسب توفیق نذر و نیاز، فاتحہ، چادر، پھول شیرینی ختم وغیرہ کے لیے بہ طور نیاز بہ ذریعہ منی آرڈر، برٹش پوسٹل آرڈر، چیک وڈرافٹ کو کراس کر کے حقیر فقیر کے نام پتا ذیل پر روانہ کریں۔

☆☆☆

ہمارا مُلک

ایران میں کون رہتا ہے؟ ایران میں ایرانی قوم رہتی ہے۔ انگلستان میں کون رہتا ہے؟ انگلستان میں انگریز قوم رہتی ہے۔ فرانس میں کون رہتا ہے؟ فرانس میں فرانسیسی قوم رہتی ہے۔ یہ کون سا ملک ہے؟ یہ پاکستان ہے۔ اس میں پاکستانی قوم رہتی ہوگی؟ نہیں۔ اس میں پاکستانی قوم نہیں رہتی۔ اس میں سندھی قوم رہتی ہے۔ اس میں پنجابی قوم رہتی ہے۔ اس میں یہ قوم رہتی ہے۔ اس میں وہ قوم رہتی ہے۔ لیکن پنجابی تو ہندوستان میں بھی رہتے ہیں۔ سندھی تو ہندوستان میں بھی رہتے ہیں پھر یہ الگ ملک کیوں بنایا تھا؟

غلطی ہوئی۔ معاف کر دیجیے۔ آئندہ نہیں بنائیں گے۔

ہمارا تمہارا خدا بادشاہ

کسی ملک میں ایک تھا بادشاہ۔ بڑا دانش مند، مہربان اور انصاف پسند۔ اس کے زمانے میں ملک نے بہت ترقی کی اور رعایا اُسے بہت پسند کرتی تھی۔ اس بات کی شہادت نہ صرف اُس زمانے کے محکمہ اطلاعات کے کتابچوں اور پریس نوٹوں سے ملتی ہے بلکہ بادشاہ کی خود نوشت سوانح عمری سے بھی۔

شاہ جمجاہ، کے زمانے میں ہر طرف آزادی کا دور دورہ تھا۔ لوگ آزاد تھے اور اخبار

آزاد تھے کہ جو چاہیں کہیں، جو چاہیں لکھیں۔ بشرطیکہ وہ بادشاہ کی تعریف میں ہو، خلاف نہ ہو۔

اس بادشاہ کا زمانہ ترقی اور فتوحات کے لیے مشہور ہے۔ ہر طرف خوش حالی ہی خوش حالی نظر آتی تھی، کہیں تل دھرنے کو جگہ باقی نہ تھی۔ جو لوگ لکھ پتی تھے، دیکھتے دیکھتے کروڑ پتی ہو گئے۔ حُسنِ انتظام ایسا تھا کہ امیر لوگ سونا اُچھالتے اُچھالتے ملک کے اس سرے سے اُس سرے تک بلکہ بعض اوقات بیرونِ ملک بھی چلے جاتے تھے، کسی کی مجال نہ تھی کہ پوچھے اتنا سونا کہاں سے آیا اور کہاں لیے جا رہے ہو۔

روحانیت سے شغف تھا۔ کئی درویش اُسے ہوائی اڈے پر لینے چھوڑنے جاتے یا اُس کی کامرانی کے لیے چلّے کاٹتے تھے۔ طبیعت میں عفو و درگزر کا مادہ از حد تھا۔ اگر کوئی .....آ کر شکایت کرتا کہ فلاں شخص نے میری فلاں جائداد ہتھیالی ہے، یا فلاں کارخانے پر قبضہ کر لیا ہے، تو مجرم خواہ بادشاہ کا کتنا ہی قریبی عزیز کیوں نہ ہو، وہ کمالِ سیر چشمی سے اُسے معاف کر دیتے تھے۔ بلکہ شکایت کرنے والوں پر خفا ہوتے تھے کہ عیب جوئی بُری بات ہے۔

جب بادشاہ کا دل حکومت سے بھر گیا تو وہ اپنی چیک بُکیں لے کر تارک الدُنیا ہو گیا اور پہاڑوں کی طرف نکل گیا۔ کچھ لوگ کہتے ہیں اب بھی زندہ ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

☆☆☆

ایک خبر دیپالپور کی

دیپالپور کی خبر ہے کہ وہاں حسنِ اخلاق اور شائستگی کے موضوع پر ہونے والی ایک مجلس مذاکرہ لپاڈ کی اور گالی گلوچ پر ختم ہوئی۔ ہوا یہ کہ ایک مقرر نے عجز و اخلاق کی خوبیوں پر تقریر کرتے ہوئے کہیں دعویٰ کر دیا کہ "عجز و اخلاق میں اس خاکسار کا پہلا نمبر ہے۔ دوسرے لوگ جو عجز و اخلاق کے دعوے دار ہیں، بالکل جھوٹ بولتے ہیں۔" اس پر ایک صاحب کو اعتراض ہوا۔ وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور بولے۔

"حضرت، آپ کیا کھا کر انکساری میں میرا مقابلہ کریں گے۔ میں تو خطوں میں بھی اپنے نام کے ساتھ بندۂ عاجز اور خاکسار لکھتا ہوں۔"

پہلے مقرر نے کہا۔ "آپ تو صرف لکھتے ہیں، بندہ تو خاکسار جماعت میں شامل بھی رہا ہے اور بیلچہ لے کر پریڈ بھی کرتا رہا ہے۔" اس پر دوسرے فریق کے حامیوں کو طیش آ گیا۔ ایک نے کہا "ہت تیری خاکساری کی۔" دوسری طرف سے جواب ملا۔ "ہت تری عاجزی کی۔" ایک نے کہا۔ "تیرے باپ میں بھی انکسار نہیں تھا۔ چھاتی تان کر اکڑ اکڑ کر چلتے، اسے ہم نے دیکھا ہے۔" دوسرے نے کہا۔ "تیرا دادا تو طرّے والی پگڑی پہنتا تھا، تو کدھر سے فدوی بن رہا ہے۔" لوگوں نے بڑی مشکل سے بیچ بچاؤ کرایا اور کہا۔ تم بھی عاجز اور تم بھی خاکسار۔ لو صلح کر لو۔ غصہ تھوک دو۔

دیپالپور تو چھوٹی جگہ ہے اور اس کی محض مثال ہے۔ بڑی جگہوں پر بھی یہی ہوتا ہے۔ ایک کہتا ہے میں جمہوریت کا دلدادہ ہوں۔ میری جماعت جمہوری ہے۔ دوسرا کہتا ہے نہیں ہم جمہوری ہیں۔ ہم آزادی رائے کے حامی ہیں، اس پر پہلا فریق کہتا ہے۔ اچھا تو یہ بات ہے، ہماری جمہوریت پسندی کو نہیں مانتا۔ چل تھانے، کھا چنے کی دال، چھ ماہ کے لیے نظر بند۔ ورنہ مان، ہمیں جمہوریت پسند۔ اس پر دوسرا فریق ضمانتیں کرانے کے لیے بھاگ جاتا ہے کہ ٹھہر تو سہی، ہماری حکومت آنے دے۔ ہم بھی تجھے جمہوریت کا نخلخہ سنگھائیں گے۔ تیرا زن بچہ کولہو میں پلوائیں گے۔" ہم تو خیر کس شمار قطار میں ہیں۔ بڑی طاقتوں میں اکثر جنگیں اس بحث سے شروع ہوتی ہیں کہ کون امن کا زیادہ حامی ہے۔ الف کہتا ہے، میں ہوں، ب کہتا ہے میں ہوں۔ الف کہتا ہے، کیا ٹرٹر لگا رکھی ہے۔ یوں نہیں مانے گا۔ یہ لے گولہ بچا اپنا سر۔ ب اس کے جواب میں توپ سر کرتا ہے۔ دھائیں دھائیں ہوتی ہے اور آخر میں پانچ چھ سال کی جنگ کے بعد واقعی امن قائم ہو جاتا ہے۔

ایک زمانہ تھا جب مختلف ملکوں میں اس بات پر جنگ ہوتی تھی کہ فلاں ملک کو کون محکوم بنائے۔ ہندوستان میں پہلے انگریزوں اور پرتگیزوں کے معرکے ہوئے۔ پھر فرانسیسیوں اور انگریزوں میں لڑائی ہوئی۔ اب بڑی طاقتیں اس بات پر لڑتی ہیں کہ فلاں کو کون آزادی دلائے۔ افریقہ میں اور انگولا میں آج کل یہی ہو رہا ہے۔

روس کہتا ہے میں اس ملک کو آزاد کراؤں گا۔ امریکہ کہتا ہے میں کراؤں گا۔ میرے ہاتھوں آزاد ہوئے تو نفع میں رہو گے۔ مڑ کر کوئی نہیں دیکھتا کہ غلام بنانے والے تو کبھی کے پرتگال واپس چلے بھی گئے۔ اگر آزاد کرانے والے اپنے لاؤ لشکر اور ساز و سامان کے ساتھ وہاں نہ پہنچ جاتے اور اصرار نہ کرتے کہ۔

اگر لکھوائے کوئی اس کو خط تو ہم سے لکھوائے

تو ہمیں یقین ہے کہ انگولا والے واقعی کبھی کے آزاد ہو چکے ہوتے۔ رانڈیں تو جیتی ہیں، رنڈوے جینے بھی دیں۔

آج کل بڑی طاقتوں کے درمیان دَیتان کا بڑا شہرہ ہے یعنی صلح۔ تم اپنا منہ اُدھر کرلو ہم اپنا منہ ادھر کرلیں۔ امریکی وزیر خارجہ ہنری کسنجر صاحب کے تو اس بھاگم دوڑ میں جوتے کے تلے گھس جاتے ہیں۔ حاضری کھائیں سپاٹو میں تو لندن میں ٹفن۔ غسل کریں ماسکو میں، ناشتا پیکنگ میں، واشنگٹن میں کم ہی کسی نے ان کی صورت دیکھی ہے۔ آرٹ بخوالڈ نے ایک بار نقشہ کھینچا بھی تھا کہ ایک بار پرچہ لگا ہنری کسنجر واشنگٹن اپنے دفتر آرہے ہیں۔ چنانچہ فارن آفس کو جھنڈیوں وغیرہ سے سجایا گیا۔ چپراسی وغیرہ نئی وردیاں پہن کر آئے۔ ان کے کمرے کو جھاڑا پونچھا گیا۔ وزارت خارجہ کے افسروں کا ان سے تعارف کرایا گیا اور امید ظاہر کی گئی کہ موصوف پھر بھی کبھی وزارت خارجہ میں قدم رنجہ فرمائیں گے۔ لیکن جس قسم کی وہ صلح کراتے ہیں وہ لیپا پوتی ہوتی ہے۔ دلوں کے میل اس سے صاف نہیں ہوسکتے۔ دونوں فریق ایک دوسرے سے ہاتھ ملا کر اور مزاج شریف پوچھ کر یا ایک آدھ معاہدے پر دستخط کرکے پھر اپنے اپنے ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم اور نائٹروجن بم اور آکسیجن بم بنانے میں مصروف ہوجاتے ہیں۔ کبھی کبھار بیانات سے اس خیرسگالی کی توثیق ہوتی رہتی ہے مثلاً روس اور امریکہ میں آج کل دیتان یعنی صلاح نامہ ہے امریکہ بیان دیتا ہے کہ روس ہمارا دوست ہے اور ہمیں یقین ہے امن پسند ہے البتہ اگر جنوب مشرقی ایشیا میں اس نے اپنے اڈے قائم کرنے کی کوشش کی تو ہم اس کا سر توڑ دیں گے۔ جواباً روس کو جواب دینا پڑتا ہے کہ ہمارے دل میں امریکہ کی امن پسندی کی بڑی قدر ہے اور اس سے ہمارا دوستی کا معاہدہ پکا ہے تاہم اس نے چین چپڑ کی تو اس کا بھرکس نکال دیں گے وغیرہ۔

دیکھیے دیپالپور سے چل کر ہم کتنی دور پہنچ گئے۔ ویسے حسن اخلاق کے موضوع پر

بحث اور ایک دوسرے سے عجز وانکسار میں بازی لے جانے کی کوشش اور اس کے نتیجہ میں لپاڈکی کی کوئی واحد مثال نہیں۔ کئی سال ہوئے انسداد رشوت ستانی کے موضوع پر سرکاری اہل کاروں کا ایک مذاکرہ ہوا تھا۔ اسے وقت کے وقت ملتوی کرنا پڑا کیونکہ مذاکرے کے سیکریٹری یا کنوینر اسی روز ایک مکان کا نقشہ پاس کرنے کے سلسلے میں رشوت لیتے ہوئے پکڑے گئے تھے۔ ملاوٹ کے انسداد کے بارے میں پارسال جو مذاکرہ ہوا تھا، اس میں ایک مشہور سیٹھ صاحب بڑی فصاحت سے اپنا خطبہ ارشاد کر رہے تھے کہ ایک شخص نے ان کے کان میں کچھ کہا۔ اس پر انہوں نے گھبرا کر خطبہ ختم کردیا اور حاضرین کو سلام علیکم کہہ کر رخصت ہوگئے۔ انہیں اطلاع ملی تھی کہ ان کے خالص پنجاب کے گھی کے کارخانے پر چھاپہ مار کر پولیس نے آلو کی بوریاں اور چربی کے ڈرم قبضے میں لے لیے ہیں۔ ہمارے ایک صوبے کے ایک وزیر کے متعلق مشہور ہے کہ بات بات پر گالی دیتے ہیں۔ ان کے کانوں تک یہ بات پہنچی تو بہت خفا ہوئے اور کہا یہ بالکل جھوٹ ہے۔ کون ...زادہ یہ بات کہتا ہے، اسے میرے سامنے لاؤ۔ اس کی یہ اس کی وہ۔

(دخل در معقولات، روزنامہ جنگ مورخہ ٦-١-٧٦)

☆☆☆

کچھ اعداد و شمار کے بارے میں

ہمارا حساب ہمیشہ سے کمزور رہا ہے یوں تو اور بھی کئی چیزیں کمزور رہی ہیں۔ مثلاً مالی حالت، ایمان۔

لیکن ان کے ذکر کا یہ موقع نہیں۔ ادھر آج کی دنیا اعداد و شمار اور حساب کتاب کی دنیا ہے حتیٰ کہ ہمارے دوست طارق عزیز بھی جو ہماری طرح نرے شاعر ہوا کرتے تھے حساب کتاب لگانے اور اوسطیں نکلوانے لگے ہیں۔ نیلام گھر کے گزشتہ پروگرام میں انہوں نے پوچھا کہ وہ کون سا مہینہ ہے جس میں سب سے زیادہ جھوٹ بولا جاتا ہے۔ کسی نے بتایا، کسی نے نہ بتایا۔ طارق عزیز کی طرف سے جواب آیا کہ فروری میں کیونکہ اس مہینے میں فقط ۲۸ دن ہیں۔ ہمارا یہ خیال تھا کہ کوئی آدمی ایک ہی جھوٹ ایسا بول سکتا ہے کہ کسی دوسرے کے عمر بھر کے جھوٹوں پر بھاری پڑے۔ لیکن اعداد و شمار میں چیزوں کو گنا کرتے ہیں، تولا نہیں کرتے۔ بہر حال خوشی کی بات ہے کہ جھوٹ ناپنے کا پیمانہ دریافت ہو گیا ہے اور طارق عزیز کے ہاتھ آ گیا ہے جو ہماری طرح سوشلسٹ خیالات رکھتے ہیں۔ ہم یہ مطالبہ کرنے میں حق بہ جانب ہوں گے کہ اس کا راشن مقرر کر دیا جائے۔ اسے نیشلائز کر کے سب کو حصہ رسد تھوڑا تھوڑا حق جھوٹ بولنے کا دیا جائے۔ یہ بات ہمیں قرین انصاف معلوم نہیں ہوتی کہ بڑے لوگ تو جھوٹ بولیں،

پیسے والے تو جھوٹ کا طومار باندھیں۔ سیاست دان تو پریس کانفرنسیں تک کریں لیکن عوام سے کہا جائے کہ صرف سچ بولو۔ مساوات کا تقاضا یہ ہے کہ ایک طرف غریب غرباء کو بھی جھوٹ بولنے کا حق دیا جائے۔ دوسری طرف بڑے لوگوں کو بھی سچ کے استعمال پر راغب کیا جائے۔ جسے یہ لوگ کڑوا ہونے کی وجہ سے بالعموم تھوک دیتے ہیں۔

کسی دانا یا نادان کا مقولہ ہے کہ جھوٹ کے تین درجے ہیں۔ جھوٹ، سفید جھوٹ اور اعداد و شمار، لیکن ہم یہ نہیں مانتے۔ اعداد و شمار بڑی اچھی چیز ہیں۔ اعداد و شمار کی برکت سے اب ہم یہ جانتے ہیں کہ سورج کتنے کلومیٹر کے فاصلے پر ہے اور چاند کی روشنی کتنے سال میں ہم تک پہنچتی ہے۔ بے شک اس سے سورج کی روشنی پر چنداں اثر نہیں پڑا نہ چاند کی چاندنی متاثر ہوئی ہے۔ نہ ہم ان چیزوں میں کمی بیشی کر سکتے ہیں۔ تاہم علم خواہ کتنا ہی بے مصرف ہو آخر علم ہے اور اس کی قدر کرنی چاہیے۔ اب ہر ملک کے بارے میں ہم جانتے ہیں کہ اس کی GNP کیا ہے، اوسط آمدنی فی کس کتنی ہے۔ مہنگائی کا اعشاریہ کیا ہے۔ اس سے یہ مطلب نہیں کہ ایسا کرنے سے مہنگائی کم ہو جاتی ہے یا آمدنی بڑھ جاتی ہے یا پیداوار میں اضافہ ہو جاتا ہے، لیکن علم میں تو اضافہ ہوتا ہی ہے۔ ہم مہذب اور تعلیم یافتہ تو گنے جاتے ہی ہیں۔ ہمیں معلوم نہیں کہ پرانے حکمران، بابر، شیر شاہ، اکبر اعظم اور فیروز تغلق وغیرہ اعداد و شمار جمع کیا کرتے تھے اور اوسط نکالا کرتے تھے یا نہیں، مثلاً شیر شاہ، اکبر اعظم اور فیروز تغلق کے زمانے میں خاصی ارزانی اور خاش حالی تھی لیکن یہ ذکر نہیں ملتا کہ فی کس کتنے موٹھ مٹر آتے تھے، یا شیر شاہ کی سڑکیں فی کس کتنے گز ہر آدمی کے حصے میں آتی تھیں یا GNP کیا تھی۔

آج کل اقتصادی مُشیر اور وزیر وغیرہ ہونے کے باوجود اقتصادیات گڑبڑ رہتی ہیں۔

پُرانے زمانے میں اقتصادی مشیر نہ ہونے کے باوجود شاید اسی وجہ سے کوئی اقتصادی

خلل واقع نہیں ہوتا تھا، لیکن اس بات کی ہم تعریف نہیں کر سکتے کیونکہ انکل پچو چیز انکل پچو چیز ہوتی ہے۔لوگ تو حکمت اور ہومیوپیتھی کی دواؤں سے بھی ٹھیک ہوجاتے ہیں۔اس کا مطلب یہ تھوڑا ہی ہے کہ ہم ان کو صحیح طریقہ علاج مان لیں اور ایلوپیتھی کو جس پر انگریزوں نے اتنا روپیہ صرف کیا ہے خدائی کا درجہ نہ دیں۔

آج کل ہر چیز کے لیے کیلکولیٹر اور کمپیوٹر وغیرہ نکل آئے ہیں۔ کسی کو ۲+۲ کا جواب چاہیے تو مشین ہی پر حساب کرتا ہے۔ایک کلرک کو ہم نے دیکھا کہ اس نے ایک کیلکولیٹر خرید لیا تھا تاکہ اپنی ماہانہ آمدنی بڑھا سکے اور ایک کسان نے ایک بینک سے کہا تھا کہ میرے ہاں فی ایکڑ پیداوار کم ہوتی ہے۔اپنے کمپیوٹر سے کہیے کہ اسے بڑھا دے۔ یہ سادہ لوحی ہے۔یہ سچ ہے کہ جتنے لوگ ہمارے ہاں کمپیوٹروں کے شعبے میں کام کرتے ہیں اگر جا کر کھیت میں ہل چلائیں تو پیداوار بڑھ سکتی ہے لیکن پھر سائنٹفک اعداد و شمار کی کمی واقع ہو جائے گی جو پیداوار سے کم ضروری چیز نہیں۔اوسط کا مطلب بھی لوگ غلط سمجھتے ہیں۔ہم بھی غلط سمجھتے تھے۔جاپان میں سُنا تھا کہ ہر دوسرے آدمی کے پاس کار ہے۔ہم نے ٹوکیو میں پہلے آدمی کی بہت تلاش کی لیکن ہمیشہ دوسرا ہی آدمی ملا۔معلوم ہوا پہلے آدمی دور دراز کے دیہات میں رہتے ہیں۔حساب لگایا ہے کہ ایک امریکی سال میں اوسطاً ساڑھے گیارہ بار چھینکتا ہے۔اس کا مطلب یہ نہیں کہ بارہویں چھینک آئے تو اسے روک لیتا ہے یا آدھی روک لیتا ہے، ناک سُکیڑ کر رہ جاتا ہے۔نہ ہر خاندان کے پاس ۱/۲ ٹیلی ویژن اور ۱/۴ کار ہونے کا یہ مطلب ہے کہ ہر گھر میں ایک ٹیلی ویژن اور ایک خالی کھوکھا ہوتا ہے یا کار کا ایک پہیہ ہوتا ہے، چاہو دوازے پر لٹکا دو چاہے ہوا بھر کر لڑھکاتے پھرو۔ اور ایسا سوچنا تو اعداد و شمار کا مذاق اڑانا ہے۔ملک کی ساری کاروں اور سارے ٹیلی ویژنوں کو ساری آبادی پر تقسیم کر کے اوسط نکالی جاتی ہے۔یہ مطلب نہیں کہ کاریں اور ٹیلی ویژن سچ مچ غریب غرباء سمیت

سب کو دے دیے جاتے ہیں۔خدانخواستہ ایسی بدعتیں تو سوشلزم وغیرہ میں سنی جاتی ہیں فقط حساب کتاب کی حد تک۔

☆☆☆

تاہم اوسط نکالنے میں کچھ احتیاط ضرور چاہیے۔ایک بار ایک حساب دان نے دریا پار کرتے وقت اوسط نکالی تھی۔لوگوں نے بہت منع کیا کہ بابا ڈوب جاؤ گے لیکن اس نے بانس بنوایا۔ایک جگہ آٹھ فٹ گہرا پانی تھا، دوسری جگہ تین فٹ ایک جگہ چار فٹ۔اوسط نکلی پانچ فٹ۔سو یہ کچھ گہرائی نہ ہوئی۔ دریا میں اُتر پڑا اور لگا ڈبکیاں کھانے۔لوگوں نے مشکل سے نکالا۔پھر بھی حیران کہ اوسط پانچ فٹ کی ہے میں چھ فٹ کا ہوں گا۔ڈوبا تو کیوں ڈوبا۔

☆☆☆

ایسا ہی ایک حساب دان اصفہان کی سیر کو گیا تھا۔ وہاں بازار میں کئی جگہ ٹھٹکا۔ خریداری کی اور ہوٹل واپس آیا تو معلوم ہوا کہ چھاتا کہیں کسی دکان پر رہ گیا۔پہلی دکان پر گیا دکان دار نے کہا کہ حضرت یہاں نہیں۔دوسرے نے کہا۔آپ لے گئے تھے۔تیسرے نے کہا میں نے دیکھا ہی نہیں۔ چوتھے نے بھی انکار میں سر ہلایا۔ پانچویں دکان دار نے البتہ شکل دیکھتے ہی چھاتا نکال حوالے کیا کہ میاں جی آپ بھول گئے تھے۔اس پر اس شخص نے اہل اصفہان کے بارے میں یہ حکم لگایا کہ۔اصفہانیوں میں ہر پانچ میں سے صرف ایک آدمی ایماندار ہے۔یہ اوسط آج بھی سچ ہے ورنہ تو ہر مسافر وہاں ایک چھاتا لے کر جاتا اور پانچ چھاتے اٹھائے واپس آتا۔

☆☆☆

ایک کالم بغیر عنوان

صاحبو، آج اعلان ہوا ہے کہ پی آئی اے کے کرایے پچیس فیصدی بڑھ گئے، کل اعلان ہوا تھا کہ ریلوے کے کرایے بڑھ گئے، اس کے ساتھ ہی خبر آئی ہے کہ دودھ کا نرخ بھی بڑھ گیا ہے، پہلی اپریل سے ساڑھے تین روپے سیر ملا کرے گا۔ خالص یا ناخالص کی نہ آج تک کسی نے ذمے داری لی نہ آگے لینے کو تیار ہے، یہ دودھ دینے اور دودھ پینے والوں کا نجی معاملہ ہے، اس میں حکومت یا حکومت کا کوئی ادارہ دخل دیتا اچھا نہیں لگتا، اس معاملے میں سختی کی جائے تو لوگ چیخ اُٹھیں گے کہ اس ملک میں جمہوریت نہیں ہے۔ شہریوں کے حقوق نہیں ہیں۔

☆☆☆

گویا صاحبو اب وہ سینک سڑپے کے دن گئے جب آپ شاداں وفرحاں گاڑی سے اُترتے تھے اور دودھ پیتے ہوئے ہوائی جہاز میں جاسوار ہوتے تھے وہاں سے اُترے، پھر دودھ پیا اور گاڑی میں آن بیٹھے، گاڑی کا تو یہ ہے کہ ریل اور ہوائی جہاز نہ سہی تانگہ سہی تانگہ نہیں، گھوڑا سہی۔ گھوڑا نہیں، لیکن آگے غیر شریفانہ جانوروں کی فہرست آجاتی ہے، دودھ کا مسئلہ بھی زیادہ اہم نہیں ہے، اب ہم کوئی دودھ پیتے بچے نہیں ہیں، یہ سچ ہے ابھی چند سال پہلے تک پاکستان کو نوزائیدہ مملکت ہی کہا جاتا تھا،

اس وقت بھی جب کہ اس کی داڑھی مونچھیں نکل چکی تھیں، میٹھا برس لگ کر اتر بھی چکا تھا، دودھ کا قصہ یہ ہے کہ اس نوزائیدہ قوم کو دودھ بھی ملا تو ڈبے کا ملا اور وہ بھی امریکی ڈبے کا۔ امریکی دودھ کی خصوصیت یہ ہے کہ شروع میں اچھا معلوم ہوتا ہے لیکن پچتا نہیں ہے، بچہ شروع میں موٹا ہوتا ہے، آخر میں سوکھ کر قاق ہو جاتا ہے، اب جب کہ اس کے دودھ کے دانت بھی ٹوٹ چکے ہیں، ہماری قوم کو دودھ کی زیادہ پروا نہ کرنی چاہیے۔

☆☆☆

اصل میں مسئلہ گاڑی، ہوائی جہاز یا دودھ کا نہیں ہے ان کی تفصیل میں جانا غلط بحث کا موجب ہوگا، اصل مسئلہ محبت اور فرض، محبت اور ظالم سماج، محبت اور شادی ہماری ساری فلمیں ہر پھر کے اسی مضمون پر آتی رہی ہیں، اب وہ دن گئے جب محبت پر فرض کو یا فرض پر محبت کو قربان کیا جاتا تھا، فلم کا مکالمہ بھی اس کے گرد گھومتا تھا، دو دلوں کے ٹوٹنے پر اور جُڑنے پر، ظالم سماج سے بغاوت پر اور دنیا کے اس ٹکڑے چلنے پر آئندہ فلموں میں عاشق اور محبوب چاندنی راتوں میں یا مری کے سبزہ زاروں میں یہ گفتگو کیا کریں گے کہ آج کل شلجم کس بھاؤ ہیں؟ ہائے ری سجنی اب تو لٹھا بھی مہنگا ہو گیا، وغیرہ آٹے دال کا بھاؤ محبت کرنے والوں کو فلم میں پہلے بھی یہ خوبی معلوم ہو جایا کرتا تھا۔ اب فرق یہ پڑے گا کہ وہ لوگوں کو بھی بتایا کریں گے، ناچ کر، تھرک کر، گا کر، مکالمے بول کر۔

پچھلے مہنے بلکہ اسی مہینے کی شروع کی تاریخوں میں گھی ملنا بند ہو گیا تھا۔ افواہ یہ اڑی تھی کہ گھی کے دام فی سیر دو روپے کم ہو گئے ہیں، پس احتیاط پسند دکان داروں نے مال اُٹھایا ہی نہیں کہ کہیں سستا نہ بیچنا پڑے۔ یہ افواہ ہم نے بھی سنی اور پہلے تو خوش ہوئے کہ اب گھی ہی گھی کھایا کریں گے لیکن پھر اس کے عواقب پر نظر گئی تو من میں مندی کا

ہیلہ پڑ گیا، تشویش کی لہر دوڑ گئی کہ آج گھی کی قیمت کم ہوئی ہے، کل آٹے کی ہو جائے
گی، پرسوں دالیں سستی ہو جائیں گی، پھر ادبدا کر بسوں گاڑیوں والے اپنے ریٹ
گھٹا دیں گے، کپڑے والے بھی کپڑا سستا دینے لگیں گے، دودھ والا بھی اصرار کرے
گا کہ صاحب آئندہ میں ڈھائی روپے سیر کے بجائے دو روپے سیر دیا کروں گا۔ آپ
کو لینا ہے تو لیجیے' نہیں لینا ہے تو نہ لیجیے' قصاب بھی کہے گا کہ حضور چودہ روپے سیر کی
بات بھول جائیے، اب تو دس روپے دام دیا کیجیے گا اور اچھی بوٹی لیا کیجیے گا۔ چھیچھڑے
مانگ کر شرمندہ کرنے کی ضرورت نہیں، گویا بالکل ہی کساد بازاری کا اندیشہ پیدا ہو گیا
تھا۔ یاد رہے کہ آج کل فرد کوئی چیز نہیں ہے، ہماری آپ کی مہنگائی ذاتی مہنگائی ہے،
ملک کی G.N.P وغیرہ کو دیکھنا چاہیے آپ نے سنا ہوگا کہ مہنگائی تو ترقی پذیری کا
لازمہ ہے، جس دن مہنگائی رُک گئی، سمجھیے ہماری ترقی رُک گئی۔

روزنامہ جنگ دخل در معقولات مورخہ ۲۹/۳/۷۶

☆☆☆

بجٹ کی باتیں

اب کے بجٹ کے اعلان پر وہ ہما ہمی نظر نہیں آتی جو نظر آیا کرتی تھی' کچھ لوگ واہ
واہ سبحان اللہ کے ڈونگرے برسایا کرتے تھے۔ مبارک باد کے جلسے برپا کیا کرتے تھے'
کچھ اخباروں میں صدر مملکت کے نام اپیلیں شائع کرتے تھے کہ فریاد ہے' فریاد ہے'
فریاد ہے' فریاد ہے' یہ غم کی کہانی ہے' سن لیجیے' پریشان بیانی ہے، سن لیجیے۔ اب کے مرکز
میں ٹیکس زیادہ نہیں لگے۔ کسی کی طرف سے اس قسم کا بیان نہیں آیا جس طرح کا ہم نے
دو تین سال پہلے دیکھا تھا۔ جب ہوٹلوں اور ریستورانوں کے کھانے پر ایکسائز ٹیکس
عاید ہوا تھا۔ مالکان ریستوران یونین نے اشتہار شائع کرایا تھا۔

ہوٹل پر ڈیوٹی مبارکباد

جناب والا! نئے مرکزی بجٹ میں بڑے ہوٹلوں پر جو دس فیصد ایکسائز ڈیوٹی لگی
ہے، اس کا ہم تہ دل سے خیر مقدم کرتے ہیں۔
لیکن جناب والا! ریستوران جن کا مقصد شہریوں اور مسافروں کی بے لوث
خدمت کرنا ہے، ان پر ایکسائز ڈیوٹی لگانا ظلم کرنا ہے۔ لہٰذا ہم ملتمس ہیں کہ.....
ہم اس موقع پر اس قسم کے اشتہارات اخباروں میں دیکھنا چاہتے تھے۔

گھوڑ دوڑ پر ٹیکس بہت ضروری تھا

حضور! والا آپ نے گھوڑ دوڑ کے ٹکٹوں پر جو ایک روپیہ فی ٹکٹ ٹیکس لگایا ہے اس کا ہم فلم ڈسٹری بیوشن ایسوسی ایشن والے تہ دل سے خیر مقدم کرتے ہیں بلکہ گزارش کریں گے کہ یہ کم ہے۔ یہ ملک اس لیے نہیں بنایا گیا تھا کہ یہاں گھڑ دوڑ ہو بلکہ اس لیے کہ یہاں فلمیں بنائی جائیں اور لوگوں کو دکھائی جائیں تا کہ ان میں دشمن کو للکارنے اور بڑھک مارنے کی اہلیت پیدا ہو۔

جناب والا! آپ نے گھوڑ دوڑ کے ٹکٹوں کے ساتھ ساتھ سینما کے ٹکٹوں پر جو ٹیکس لگایا ہے' اس سے لوگوں کو یہ گمان ہو سکتا ہے کہ آپ گھوڑے گدھے میں فرق نہیں کرتے۔ سینما وقت کی اہم ضرورت ہے۔ اگر ہم لوگوں کو راتوں کی نیندیں حرام کرنے والی اور سوئے ہوؤں کو چونکانے والی خوف ناک' دہشت انگیز اور سنسنی خیز فلمیں نہ دکھاتے تو یہ قوم خوابِ غفلت میں غرق ہوتی اور ملک کا دفاع کمزور ہو جاتا۔ رومانی اور جسمانی فلموں کی عدم موجودگی میں نئی پود کو جینے کا سلیقہ بھی نہ آتا۔ پنڈت کوکا کو آنجہانی ہوئے تو صدیاں ہوئیں' ان کو عشق کے آداب کون سکھاتا۔

پس جناب والا گزارش ہے کہ.....

یہ فرض کرتے ہوئے کہ جوتوں' کپڑوں' گھی وغیرہ پر بھی ڈیوٹی لگی ہے جیسی کہ لگا کرتی تھی۔ ہم اپنے توسنِ خیال کو یوں بڑھاتے ہیں بلکہ کالم کے میدان میں بڑھاتے ہیں۔

سینما پر ٹیکس کا خیر مقدم

حضور والا! نئے بجٹ میں سینما کے ٹکٹوں پر جو ٹیکس لگایا گیا ہے' وہ ہر لحاظ سے مستحسن ہے اور موجودہ حکومت کے انقلابی اور عوامی ہونے کا نا قابل تردید ثبوت ہے۔ سینما سے اخلاق بھی خراب ہوتا ہے اور آنکھیں بھی۔ جب کہ جوتوں سے نہ اخلاق خراب ہوتا ہے نہ آنکھیں بلکہ اسکول کالج کی طالبات اس سے کبھی کبھی لوگوں کے اخلاق درست کرنے کا کام بھی لیتی ہیں۔

جناب والا! جوتے ہر شخص کے کام کی چیز ہیں۔ غریب انہیں پہنتے ہیں اور قومی خدمت گار ان میں دال بانٹتے ہیں' بس گزارش ہے کہ جوتوں پر سے ٹیکس اٹھا کر جوتا مینوفیکچررز ایسوسی ایشن کی دعائیں لی جائیں۔

جوتوں پر ٹیکس ضروری تھا

حضور والا! آپ نے جوتوں پر ٹیکس لگا کر جو جوتوں والوں کو جوتا دیا ہے' اس کے لیے آپ کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ امید ہے اب ان لوگوں کا دماغ ٹھکانے آ گیا ہوگا۔ لیکن جناب والا کاغذ پر ڈیوٹی انصاف سے سراسر بعید ہے۔ ہم تاجر ان کتب و اخبارات فروغ تعلیم کے نام پر اپیل کرتے ہیں کہ یہ نئی ڈیوٹی فوراً منسوخ کی جائے' علم پروری ہوگی۔

کاغذ پر ڈیوٹی ضروری تھی

جناب والا! ہم آپ کو کاغذ پر ڈیوٹی لگانے پر مبارکباد دیتے ہیں' یہ بہت ضروری

تھی۔ آخر کتابوں اخباروں کا کیا فائدہ ہے۔ یہ چیزیں بے کار نہ ہوتیں تو لوگ ان کو
ردی میں کیوں بیچتے۔ محض کاغذ کے سستا اور سہل الحصول ہونے کے باعث بے شمار
لوگوں نے مصنف یا اخبار نویس بن کر اپنا مستقبل تباہ کر لیا ہے البتہ جناب والا ہم
تاجران و آڑھتیاران بناسپتی گھی کو ایکسائز ڈیوٹی سے مستثنیٰ کیا جائے کیونکہ اس کا ممتا
سے گہرا تعلق ہے جو ایک مقدس جذبہ ہے۔

بناسپتی گھی پر ڈیوٹی اور بڑھائی جائے

حضور انور! آپ نے بناسپتی گھی پر ڈیوٹی عاید کر کے قوم کے دلوں کی آواز سن لی۔
ہم نے ان لوگوں کا اشتہار دیکھا ہے۔ جس میں آپ کو مکھن لگانے کی کوشش کی گئی ہے
لیکن یہ مکھن کسی طرح خالص نہیں ہے لیکن ہم جو سگریٹ پبلک کے افادے کے لیے
تیار کر کے بازار میں دیتے ہیں۔ ان میں بعض میں خالص ہاتھی کی لید ہوتی ہے، کسی
اور لید کی آمیزش نہیں کرتے۔ جناب والا، سگریٹ ایک معاشرتی ضرورت ہے جب
کہ آپ نے ٹی وی کے اشتہاروں میں دیکھا ہوگا۔ محبوب کو اپنے قدموں میں لا کر
گرانے، کا واحد نسخہ یہ ہے کہ اس کے سامنے سگریٹ پیا جائے۔ حضور والا! سگریٹ
کے اور بھی بہت سے فائدے ہیں۔ اس سے کھانسی ہوتی ہے، دمہ ہوتا ہے، دوائیں بکتی
ہیں۔ فن طب کو فروغ ہوتا ہے۔ گورکنوں کا معیار زندگی بلند ہوتا ہے۔ پس سگریٹ پر
سے یہ نیا ٹیکس ہٹایا جائے۔

سگریٹ بند کیجیے

جناب والا! سگریٹ پر جو ڈیوٹی لگائی گئی ہے، اس کا ہم خیر مقدم کرتے ہیں۔ ہمارے
کاریگر سگریٹ پیتے ہیں جس سے ہمارے کام کا حرج ہوتا ہے۔ ہم آل پاکستان مالکان

کھڈی یونین ملتمس ہیں کہ سگریٹ پر اور زیادہ ٹیکس لگایا جائے اور یہ ٹیکس آپ کھڈیوں
پر سے ہٹا کر اس پر لگا سکتے ہیں۔ آپ کو زیادہ زحمت نہیں ہوگی جناب والا یہ بھی گزارش
ہے کہ کھڈی میں کھ پر زبر پڑھی جائے، پیش نہ لگائی جائے۔ ہم پارچہ باف ہیں۔ یہ
الگ بات ہے کہ فلک کج رفتار نے ہمیں بھنگی بنا کر رکھ دیا ہے۔

کھڈیوں پر ٹیکس جائز ہے

حضور فیض گنجور، نئے بجٹ میں کھڈیوں پر جو ٹیکس لگایا ہے، وہ نہایت مستحسن ہے بلکہ
بہت کم ہے۔ اگر مراد کپڑے بننے کی کھڈیوں سے ہے تو یہ غیر ضروری ہیں۔ جب
ہمارے اسلاف درختوں کی چھالوں اور جانوروں کی کھالوں سے ستر پوشی بہ خوبی
کر لیتے تھے تو ہم کیوں نہیں کر سکتے۔ بشرطیکہ اس کی ضرورت سمجھیں۔ اگر کھڈیوں پر
ٹیکس لگایا گیا ہے تب بھی عین مناسب ہے۔ ہماری قوم کو کھلے کھیتوں میں جا کر
حاجات ضروریہ کا اہتمام کرنا چاہیے تا کہ ہمارے کھیت زرخیز ہوں، پیداوار بڑھے اور
زر مبادلہ کمایا جا سکے۔ آج کل سارا زر مبادلہ کھڈیوں کی چار دیواری میں رہ جاتا ہے۔
البتہ جناب والا! گھڑ دوڑ کے ٹکٹوں پر جو ٹیکس لگایا گیا ہے، اسے انجمن شائقین گھوڑ
دوڑ پسند نہیں کرتی۔ یہ نہ صرف قومی مفاد کے خلاف ہے بلکہ اس سے اسلام بھی خطرے
میں پڑ سکتا ہے۔ گھوڑ دوڑ ہماری پرانی اسلامی روایت ہے۔ علامہ اقبال کے کلام کا
مطالعہ آپ نے کیا ہو تو معلوم ہوگا کہ ہمارے بزرگ بحر ظلمات میں گھوڑے دوڑایا
کرتے تھے۔ ہمیں اپنے اسلاف کی کسی بات کا تو پاس کرنا چاہیے۔ بالکل ہی ناخلف
نہیں ہونا چاہیے۔ بس حضور والا.....

(روزنامہ امروز ۷۳-۶-۲۴)

☆☆☆

ہونہار طالب علموں کے درمیان

ہمارے دوست حسنین کاظمی نے کراچی ایئرپورٹ کے عین سامنے علامہ اقبال کالج قائم کر رکھا ہے۔ یہ مقام شاید انہوں نے عدیم الفرصت مسافروں کی سہولت کے لیے چنا ہے کہ شہر سے ہوائی اڈے جاتے ہوئے راستے میں تھوڑا رک کر ایف اے۔ بی اے پاس کرتے جائیں۔ ہم نے کئی لوگوں کو دیکھا کہ شہر سے چلے تو الف کے نام بے نہ آتی تھی۔ ہوائی اڈے پر سامان تلوانے لگے تو فضیلت میں بھاری بھرکم پائے گئے' اٹھائے نہیں اٹھتے تھے۔ یہ بات نہیں ہے کہ حسنین کاظمی صاحب ڈگریاں لیے کالج کے دروازے پر کھڑے رہتے ہیں جو گزرا اس کو ایک تھمادی۔ علم ان کے کالج کا خاصا مضبوط ہوتا ہے۔ ہوائی اڈے کو دیکھتے ہوئے کیا ہم مضمون کی ہوا اتنی بھی نہ باندھیں۔

☆☆

گزشتہ ہفتے انہوں نے ہمیں یاد فرمایا کہ طالبات کی بزم ادب کا افتتاح ہے۔ ہم نے کہا۔ من آنم کہ دانم۔ ہم عزت کے لائق نہیں۔ حسنین کاظمی نے ہم سے اتفاق رائے کیا اور کہا اسی لیے ہم نے زیڈ اے بخاری صاحب کو بھی بلالیا ہے اور فلاں صاحب اور فلاں صاحب کو بھی۔ آج کل کسر نفسی کرتے بھی احتیاط چاہیے۔ وہ زمانے گئے جب کوئی خود کو جتنا گراتا تھا اتنا اونچا مرتبہ پاتا تھا۔ آج آپ خود کو ننگِ اسلاف یا

آوارہ کوئے نا اہلاں وغیرہ کہیں گے تو لوگ اس کا وہی مطلب سمجھیں گے جو ڈکشنری میں ہے۔ حسنین کاظمی صاحب کا معاملہ دوسرا ہے۔ وہ آداب و تکلفات سب جانتے ہیں لیکن ہماری بدقسمتی کہ ہمیں بھی جانتے ہیں۔ بہت دنوں کی بات ہے۔ جن دنوں ہم نے نیا نیا۔ ایم۔ اے پاس کیا تھا تو ہم اور وہ ایک ہی کالج میں پڑھاتے تھے۔ جو رائے انہوں نے اس زمانے میں ہمارے متعلق قائم کی تھی، اسی پر قائم ہوں گے۔ حالانکہ ہم نے جو رائے ان کے متعلق اس وقت قائم کی تھی اس پر اب قائم نہیں۔

حسنین صاحب نے ہمیں خبردار کر دیا تھا کہ کچھ نہ کچھ بولنا ہوگا۔ صدارتیں کرتے اور مہمان خصوصی بنتے ہمیں تقریر کا ایک ڈھب آ گیا ہے۔ اور یوں بھی ہمیں معلوم تھا بخاری صاحب موجود ہیں۔ ان کی عمر ہی تقریریں کرتے کرتے گزری ہے۔ ہم تک شاید دورِ جام نہ آئے۔ حد سے حد کوئی غزل ارشاد کرنے کو کہے گا کہ آج کل منگنی ہو یا میلاد شریف۔ انجام سب کا مشاعرہ ہوتا ہے۔ سو وہ ارشاد کر دیں گے۔ پھر وہیں مرتضیٰ شفیع صاحب نظر آئے۔ وہ پروفیسر ہیں۔ علمی ادبی باتیں ہم نے ان پر چھوڑ دیں۔ پروفیسر محمد فائق صاحب بھی کہ اتوار کے اتوار ریڈیو پر صبح دم دروازۂ خاور کھولتے ہیں۔ اسٹیج پر رونق افروز نظر آ گئے۔ اب ہم بالکل پختہ ہو گئے کہ ان صاحبوں کی تقریروں کے بعد وقت ہی کہاں بچے گا۔

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔ یعنی ہمیں بولنا پڑا۔ لیکن وہ الگ حکایت ہے۔ معلوم ہوا کہ پہلے پہیلیاں بجھوائی جائیں گی۔ اس کام کے لیے فائق صاحب سے بہتر کوئی آدمی نہیں۔ یکے بعد دیگرے مختلف کالجوں کی ٹیموں کو آنا تھا۔ سوالات پرچیوں پر لکھے تھے اور پرچیاں گڈمڈ ایک ڈبے میں تھیں۔ طریقہ قرعہ اندازی کا تھا۔ ایسے موقع پر کسی معصوم بچے سے پرچیاں اٹھوائی جاتی ہیں۔ لہٰذا یہ فرض ہمارے بخاری صاحب نے انجام دیا۔ سب سے پہلی پرچی جو نکلی وہ یہ تھی کہ ''چاند نگر'' کس شاعر کا مجموعہ کلام

ہے...؟"

سب چپ۔ اتنے مشکل سوالات پوچھنے بھی نہ چاہئیں۔ خصوصاً کالج یونیورسٹی کے طلبہ سے۔ آخر فائق صاحب نے تھوڑا اشارہ دیا کہ ممکن ہے وہ شاعر اسٹیج پر ہی بیٹھا ہو اس پر ہونہار طالب علموں کی طرف سے جواب دیا۔ "بخاری صاحب کا۔" ایک ہی ہمارا مجموعہ کلام ہے... وہی ظالموں نے سمرقند و بخارا کی طرح بخاری صاحب کو بخش دیا۔ ہمارا ناخوش ہونا تو قدرتی تھا لیکن بخاری صاحب ہم سے زیادہ ناخوش نظر آئے۔ بدیں وجہ کہ اس قسم کا کلام مجھ سے کیوں منسوب کیا۔ بیٹھے بیٹھے ہمارے اور بخاری صاحب کے تعلقات کشیدہ ہو گئے۔ اتفاق سے تیسرا چوتھا سوال یہ نکلا کہ وہ کون سا شعر ہے جسے دو شاعروں نے مل کر لکھا۔ طالب علم تو کیا بتاتے۔ فائق صاحب ہی نے بتایا کہ شعر یہ ہے۔

اس زلف پہ پھبتی شب دیجور کی سوجھی
اندھے کو اندھیرے میں بہت دور کی سوجھی

یہ بھی تشریح کی کہ اس کا ایک مصرع جراتؔ کا ہے۔ ایک انشاؔ کا ہے۔ اس پر ایک صاحبہ جو ہمارے قریب بیٹھی تھیں ہمارے کان میں پوچھنے لگیں کہ ان میں پہلا مصرع آپ کا ہے یا دوسرا؟

کوئی بتلائے کہ ہم بتلاتے کیا

اس پر ہمیں پیکنگ کا واقعہ یاد آ گیا جہاں سفارت خانے کے افسروں کی بیبیوں نے ہم پاکستانی ادیبوں کے اعزاز میں دعوت دی تھی۔ ان بیبیوں کو ہم نے ہر طرح کی غزلیں سنائیں۔ عاشقانہ۔ ناصحانہ۔ فلسفیانہ متصوفانہ وغیرہ لیکن وہ دوپٹے اوڑھے احتراماً بیٹھی رہیں۔ ہم شرمندہ سے ہو کر بیٹھ گئے۔ تو پاس والی بی بی نے ترس کھا کر ہم سے بات کرنا ضروری سمجھا کہ "یہ غزلیں جو آپ نے پڑھیں، آپ کی اپنی لکھی ہوئی

تھیں؟"

خیر دیگر سوالات اتنے مشکل نہ تھے اور پھر مطالعہ ہی سب کچھ نہیں ہوتا۔ ذہانت اور قیاس آرائی بھی تو ہوتی ہے۔ فائق صاحب نے پوچھا۔ دربار اکبری کس کی تصنیف ہے۔ کسی نے کہا۔ اکبر الہ آبادی کی' فسانہ آزاد کے نام ہی سے پتا چل جاتا ہے کہ مولانا محمد حسین آزاد نے لکھا ہوگا۔ یادگار غالب کا غالب کی تصنیف ہونا بھی آسانی سے دریافت ہو جاتا ہے اور موازنہ انیس و دبیر کے متعلق یہ بتانا بھی کچھ مشکل نہیں کہ انیسؔ اور دبیرؔ دونوں نے مل کر اسے لکھا۔ یہی حال اشعار کا ہے کہ بعض اوقات شعر خود بول اٹھتا ہے کہ میں کس کی تصنیف ہوں۔ مثلاً

در و دیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں
(حسرت موہانی)

یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر
(داغ دہلوی)

دیکھیے پاتے ہیں عشاق بتوں سے کیا فیض
(فیض احمد فیض)

حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں
(جگر مراد آبادی)

ہاں ایک شعر ایسا بھی ہے کہ تنہا ایک آدمی کی تصنیف نہیں۔

غالبؔ اپنا یہ عقیدہ ہے بقول ناسخؔ
آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میرؔ نہیں

اسے غالب' ناسخ اور میر تینوں نے مل کر لکھا۔ اتنا اچھا شعر ایک شاعر تن تنہا لکھ بھی نہیں سکتا۔

☆☆

آج کل کے طالب علم صرف کتابیں نہیں پڑھتے رسالے بھی پڑھتے ہیں۔ جب فائق صاحب نے پوچھا کہ اچھا اردو کے تین ادبی رسالوں کے نام بتایئے تو ایک طرف سے کوئی بولا۔ کہ ایک تو اردو ڈائجسٹ۔ باقی بھی کچھ ایسے ہی ہیں۔ اب کے فائق صاحب نے پھر ایک مشکل سوال پوچھا کہ نیاز فتح پوری مرحوم کے پرچے کا کیا نام ہے۔ طالبات کو چہ کنم میں دیکھ کر فائق صاحب نے اشارہ بھی دیا کہ اس نام میں ن بھی ہے گ بھی ہے۔ ر بھی ہے۔ افسوس کہ الف انہوں نے اپنے پاس رکھ لیا۔ ہ بھی بتا دیتے تو کچھ عجب نہیں کوئی طالب علم بتا ہی دیتا کہ نگار کو پوچھا ہے۔

(اخبار جہاں، باتیں انشا جی کی ۲۰-۵-۷۰)

☆☆☆

ترجمہ کرا لیجیے، تقریر لکھوا لیجیے
سودا منگوا لیجیے..............

یہ زمانہ کمپیوٹر کا ہے۔ ترقی یافتہ ملکوں میں ہر کام کمپیوٹر سے لیا جانے لگا ہے۔ لوگ یہ تک کمپیوٹر سے پوچھتے ہیں کہ آج نہائیں کیا، نچوڑیں کیا، سنا ہے نہانا ہو تو کمپیوٹر صابن لگا لگا کر اور مل مل کر نہلا بھی دیتا ہے۔ گھر کی بی بیاں بھی کمپیوٹر ہی سے پوچھتی ہیں کہ آج کون سی سبزی پکائی جائے۔ بھنڈی یا کریلے، آپ کو فرصت نہ ہو تو کمپیوٹر سبزی بھی لا دیتا ہے۔ پکا ریندھ کے آپ کے سامنے بھی رکھ دیتا ہے۔ جھاڑو بہارو بھی کر دیتا ہے۔ ایک طرح سے مغربی معاشرے میں اب مردوں کی سرے سے ضرورت نہیں ہی۔ مردان ہی کاموں کے لیے تو ہوتے ہیں۔

☆☆

ہمارے ہاں فی الحال ابتدا ہے۔ ہمارے ٹیلی فون کے محکمے والے بل خود بنانے کے بجائے کمپیوٹر سے بنواتے ہیں۔ نتیجہ یہ کہ پہلے ہمارے بل میں صرف کالوں کا خرچا شامل ہوتا تھا، اب کمپیوٹر کا خرچا بھی شامل ہو گیا ہے۔ ایک صاحب کی تحقیق یہ ہے کہ کچھ کالیں ہم کرتے ہیں، زیادہ کالیں ہمارے نمبر سے خود کمپیوٹر کرتا ہے۔ لاہور کی ایک

صاحبہ نے ایک رسالے میں ایک مضمون لکھا ہے جس سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ لکھتی ہیں کہ ہم نے بلوں سے تنگ آ کر ٹیلی فون کرنا ہی چھوڑ دیا۔ پڑوس میں ایک رشتے دار خاتون رہتی ہیں اشد ضرورت کے لیے بھی ان ہی کے ہاں جا کر فون کرتے رہے لیکن بل وہی۔ ڈھائی سو روپے، تین سو روپے، شکایت کرو تو جواب یہی کہ ہماری مشین غلطی تھوڑا ہی کر سکتی ہے۔ یہ انسان تھوڑا ہی ہے۔

☆☆

کمپیوٹر جسمانی کار ہی نہیں کرتا۔ دماغی کام بھی کرتا ہے۔ اب تو اس قسم کے کمپیوٹر بھی ایجاد ہو گئے ہیں جن سے آپ ترجمہ کرا لیجیے، نظم لکھوا لیجیے، فلم کے لیے چربہ کہانی اور اخبار کے لیے چربہ کالم تک لکھ دیتے ہیں۔ انہیں کسی کالم نگار کا ایک کالم ایک بار سنگھا دو۔ اس کے بعد ایسے ہی فقرے، ویسی ہی چھوٹی بڑی لائنیں، ویسے ہی عنوانات لے لو، کھٹ کھٹ کھٹا کھٹ۔ اب رہا اصل اور نقل میں ذائقے کا فرق اور تاثر کا فرق۔ سو آج کل زمانے کا مذاق یہ چل رہا ہے کہ بچے کو اصل گھی کھلاؤ تو یہ مامتا کے منافی سمجھا جاتا ہے۔ سچ مچ کی مامتا کا ثبوت دینے کے لیے کسی نہ کسی بناسپتی گھی کی سند لاتے ہیں۔

☆☆

مشہور امریکی مزاح نگار آرٹ بخوالڈ کا کہنا ہے کہ امریکہ کے صدر نکسن بھی اپنی تقریریں خود تھوڑی لکھتے ہیں۔ کمپیوٹر سے لکھواتے ہیں۔ پچھلے دنوں کمبوڈیا میں فوجیں بھیجیں تو ضرورت پڑی کہ لوگوں کو سمجھانے کے لیے ایک مدلل بیان دینا چاہیے۔ کمپیوٹر کو اس قسم کے بیانات کا پرانا تجربہ ہے۔ ویت نام میں مداخلت کے وقت بیان دیے گئے۔ کیوبا میں مداخلت کے وقت دیے گئے۔ ڈومینکن ری پبلک میں مداخلت کے وقت دیے گئے۔ پس صدر نکسن کے سیکریٹری نے کمپیوٹر کا بٹن دبایا اور جوابات رقم

ہونے شروع ہو گئے۔

سوال کیا گیا کہ ہم امریکہ سے ہزاروں میل دور فوجیں کیوں بھیجا کرتے ہیں؟

ترنت جواب آیا۔ ''اپنی نظریاتی سرحدوں کی حفاظت کے لیے۔''

سوال: ''کمبوڈیا میں ہم نے مداخلت کیوں کی ہے؟''

جواب: ''جنوبی ویت نام میں جمہوری راج قائم کرنے لیے۔''

سوال: ''شمالی ویت نام نے کس چیز کی خلاف ورزی کی ہے؟''

جواب: 'کمبوڈیا کی غیر جانبداری کی۔''

سوال: ''امریکی عوام کو کیا کہہ کر پرچایا جائے؟''

جواب: ''یہ کہ یہ موقع امریکی عوام کی حب الوطنی اور عزم و ہمت کے امتحان کا ہے۔''

سوال: ''مزید کچھ ارشاد ہو؟''

جواب: ''ہاں' یہ اضافہ کر دیجیے کہ ہم جارحیت کا ڈٹ کر مقابلہ کریں گے۔ امریکی عوام سیسہ پلائی دیوار بن جائیں گے۔ ہم ہر محاذ پر آگے بڑھ رہے ہیں۔ آزادی اور جمہوریت۔''

''بس بس کافی ہے۔''

☆☆

کمپیوٹر کے متعلق یہ بات ہمارے قارئین کرام کو معلوم ہو گی کہ اس میں جو کچھ ڈالو وہی موقع محل کے لحاظ سے نکلتا ہے، تقریریں لکھوانے والے کمپیوٹروں میں ہر موقع کی سیاسی تقریریں، سیاسی بیانات، ادبی تقریریں، معاشرتی تقریریں، تجارتی تقریریں وغیرہ بھری رہتی ہیں۔ آپ کو اگر تجارتی تقریر کرنی ہے جس میں سامعین صرف بنیے اور آڑھتی ہیں اور ساڑھے چار منٹ کی تقریر چاہیے تو مطلوبہ بٹن دبا دیجیے۔ آپ کی دلی

مراد کھٹ سے پوری ہو جائے گی۔ ادبی تقریروں کا بٹن دوسرا ہے۔ ہمیں معلوم ہوا ہے کہ اس قسم کے کمپیوٹر ہمارے ملک میں بھی آ گئے ہیں اور اس کی ضرورت بھی تھی کیونکہ ہم مسلسل ترقی کر رہے ہیں۔ پیچھے مڑ کر دیکھنے کی بھی مہلت نہیں' قباحت صرف یہ ہے کہ...... خیر ہم بات کو مثال دے کر واضح کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

☆☆

پچھلے ہفتے انجمن عرائض نویسیاں ضلع کچہری کی سالانہ کانفرنس تھی۔ ہمیں صدارت کرنے کی دعوت دی گئی۔ ہمیں مختصر طور پر یہ تو معلوم تھا کہ ان لوگوں کے کچھ مسائل اور مطالبے ہیں لیکن ان کا حل کیا تجویز کریں' یہ نہیں معلوم تھا' آخر ایک صاحب نے کمپیوٹر کی سجھائی- یہ کمپیوٹر تقریریں لکھوانے والا سب سے بڑا کمپیوٹر ہے۔ آج کل جتنی بھی تقریریں آپ جلسوں میں سنتے ہیں' اخباروں میں دیکھتے ہیں' اسی کمپیوٹر کی لکھی ہوئی ہیں۔ ہم نے بٹن دبا کر کہا۔

''میاں کمپیوٹر! السلام علیکم۔ مزاج شریف؟''

جواب آیا۔'فضول باتیں مت کیجیے۔ سوال کیجیے۔''

ہم نے کہا۔''عرائض نویسوں کی حالت کیسے بہتر ہو سکتی ہے؟''

جواب:''نظریہ پاکستان کی حفاظت کیجیے۔''

سوال:''یہ لوگ دھوپ میں بیٹھتے ہیں' کچہری میں سایہ دار جگہ نہیں۔ اس کا حل؟''

جواب:''پاکستان میں کوئی ازم نہیں چلے گا۔''

سوال:'' کارپوریشن والے عرائض نویسیوں کو تنگ کرتے رہتے ہیں ان کو روکنے کی کوئی سبیل۔''

جواب:''نظریاتی سرحدوں کی حفاظت۔''

سوال:''اے میاں کمپیوٹر' سوال از آسمان جواب از ریسماں۔''

جواب:(قطع کلام کرتے ہوئے۔)''میں فارسی کا کمپیوٹر نہیں ہوں' اردو بولیے۔''

سوال:''آخر عرائض نویس کیا کریں' کہاں جائیں؟''

جواب:''تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں''

سوال:''میاں کمپیوٹر' یہ تم نے پہلی بار برمحل جواب دیا ہے۔ لیکن اس سے آگے کیا لکھیں۔ خاصی لمبی تقریر کرنی ہے ہمیں؟''

جواب:''دلکھیے۔ ہم طاغوتی طاقتوں کے خلاف سر دھڑ کی بازی لگا دیں گے۔ سر سے کفن باندھ کر نکلیں گے۔ کشتوں کے پُش پُش پُش پُش۔''

معلوم ہوا کہ کوئی اسپرنگ ٹوٹ گیا۔ بات ادھوری رہ گئی۔ جوش میں آنے کا نتیجہ یہ ہی ہوتا ہے۔

(باتیں انشاء جی ۷۰۔۶۔۱۳ اخبار جہاں)

☆☆☆

آنا ہمارا

اتنے الیکشن ہوئے۔ قومی اسمبلی کے صوبائی اسمبلی کے‘ میونسپل کارپوریشن کے اور بی ڈی کے۔ یہ پہلی بار ہے کہ ہمارا ووٹ بنا ہے۔ یہ گمان نہ کیا جائے کہ حق رائے دہندگی بالغان کی وجہ سے بنا ہے کیونکہ بالغ تو ہم عمر کے لحاظ سے ایک زمانے سے چلے آ رہے ہیں۔ بس نہیں بنا۔ کوئی نہیں آیا ہمارا نام لکھنے اور ہمارا نام ووٹروں میں آ جاتا تو لوگ شاید ہماری بے لوث قومی خدمات پر نظر کرتے ہوئے ہم سے اصرار کرتے کہ ممبر بن جایئے قومی اسمبلی کے نہ سہی۔ صوبائی کے سہی۔ صوبائی کے نہیں تو میونسپل کارپوریشن کے سہی۔ وہ بھی نہیں تو بی ڈی کے سہی۔ کھڑے ہوتے تو یقیناً ضمانت ضبط کراتے۔ حریف کی نہیں اپنی کیونکہ ہمارے ملک میں جو ہر قابل کی قدر نہیں۔ گویا ہمارا نام فہرستوں میں جو نہیں آیا تو یہ بھی اچھا ہوا‘ برا نہ ہوا۔ ہر بات میں کوئی نہ کوئی مصلحتِ خداوندی ہوتی ہے۔

بارے الیکشن کمیشن کی شائع کردہ نئی فہرست شائع ہوئی - اس میں ہم نے اپنا نام شامل دیکھا۔ لیکن بایں طور کہ ہم آپ بھی شرمسار ہیں اور مرزا اظفر الحسن کو بھی شرمسار کر رہے ہیں۔ ڈالنے والے نے ہمیں عورتوں کے کھاتے میں ڈال دیا ہے۔ عمر ہم نے یوں بھی ایک دو سال کم کر کے لکھی تھی۔ فہرست بنانے والے نے بھی عورتوں کو

روایتی کم عمری کی رعایت سے اور چھوٹا کر دیا۔ اور پچیس سال کا بنا دیا۔ معلوم ہوتا ہے فہرست بنانے والوں کی نظر سے ان دو خواتین کی گفتگو کا لطیفہ گزر چکا ہے۔ جن میں سے ایک کہہ رہی تھی کہ ”میں اس وقت تک شادی نہیں کروں گی جب تک پچیس سال کی نہیں ہو جاتی۔“

دوسری نے کہا۔ ”بی بی‘ میں تو اس وقت تک پچیس سال کی نہیں ہوں گی جب تک میری شادی نہیں ہو جاتی“ فہرست بنانے والوں میں بیبیاں بھی شامل تھیں۔ ہمارے ساتھ یہ رعایت کسی بی بی نے برتی ہو گی کہ عمر مناسب رکھی۔ اوورایج نہیں ہونے دیا۔ شکریہ آپ کی عنایت کا۔

آج کل عورتوں مردوں کے درمیان سے ناموں کا پردہ بھی اٹھ گیا ہے۔ عصمت‘ مسرت‘ نعیم‘ نسیم‘ شمیم‘ طلعت‘ رفعت وغیرہ ادھر بھی ہیں‘ ادھر بھی۔ دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی۔ وہ دن گئے جب عورتیں سکینہ‘ فاطمہ‘ زلیخا وغیرہ ہوتی تھیں اور مرد گھسیٹے خان‘ عبداللہ‘ الٰہی بخش‘ ابراہیم بیگ وغیرہ ہوا کرتے تھے جہاں عورتوں‘ مردوں میں تعلیم۔ پوشش ہار سنگار کے فرق مٹے‘ یہ فرق بھی نہ رہا۔ لیکن ابن انشاء کے نام پر ہمیں کبھی گمان نہ ہوا تھا کہ ہمیں عورتوں کی صف میں رکھا جا سکتا ہے‘ جو ہر چند کہ ہماری عزت افزائی ہے۔ لیکن ہمیں منظور نہیں۔ ہم ایک زمانے میں عورتوں کے ایک اخبار میں کالم لکھا کرتے تھے۔ لیکن اس خیال سے کہ کان نمک ہونے کی وجہ سے لوگ نمک نہ سمجھنے لگیں‘ اپنی تصویر ساتھ چھاپ دیا کرتے تھے۔ کچھ عجب نہیں کہ ہمارے محلے کے ناموں کی فہرست بنانے والا یا بنانے والی اسی اخبار کی قاری رہ چکی ہو یا رہ چکا ہو۔

ع یاروں کو تجھ سے حالی کیا بدگمانیاں ہیں

مشکل یہ ہے کہ ہم کسی خاتون کے لیے ووٹ ڈالنے جائیں گے تو پکڑے جائیں گے۔ مرد کو ڈالنے جائیں گے تب بھی پکڑے جائیں گے۔ اس جمہوریت نے تو ہمیں

کہیں کا نہیں رکھا۔ ہم نے فہرست پر نظر ڈالی تو معلوم ہوا کہ ہماری والدہ عمر میں ہم سے دو سال چھوٹی ہیں۔ اور ہماری سب سے چھوٹی بہن ہم سے تین سال بڑی ہیں۔ اس لحاظ سے ہماری والدہ ہماری چھوٹی بہن سے پانچ سال چھوٹی ہوگئیں۔ لکھنے والوں نے بس اتنی احتیاط رکھی ہے کہ ان کو بالغ رہنے دیا ہے۔ ورنہ اپنی اولاد سے تو گئی تھیں، ووٹ سے بھی جاتیں۔

☆☆

ہمیں یاد ہے لاہور میں ایک زمانے میں ووٹروں کی فہرستیں چھاپنے کا کام ایک ایسے ٹھیکیدار کو دیا تھا جو کاتبوں کے پیسے بچانا چاہتے تھے۔ کچھ ضرورت مند ادیبوں نے اس سے قطع نظر کہ ان کا خط کیسا تھا بطور کاتب اپنی خدمات پیش کر دیں۔ قمیص اتار کر بیٹھ گئے اور پہلے کاغذ پر لکھنا شروع کر دیا۔ اجرت کارگزاری کے لحاظ سے تھی۔ شاید چار آنے صفحہ۔

دریا کو اپنی موج کی طغیانیوں سے کام
کشتی کسی کی پار ہو یا درمیاں رہے

نتیجہ یہ ہوا کہ اکثر کشتیاں درمیان ہی میں رہیں۔ بیٹا بالغ ہے باپ نابالغ ہے۔ نہ ولدیت کا پتا نہ سکونت کا سراغ۔ نہ نام صحیح نہ مقام صحیح۔ فہرستیں چھپ کر آئیں تو چھاپنے اور چھپوانے والوں نے سر پیٹ لیا اور الیکشن ملتوی ہوگئے۔ ہم یہ تو نہیں کہتے کہ اب کے بھی کسی نے الیکشن کو ملتوی کرانے کے لیے ہمارے ساتھ یہ وارداتیں کی ہیں لیکن اصل وجہ اس تذکیر و تانیث کے پھیر کی ہماری سمجھ میں نہیں آئی۔

ہم نے پوری فہرست کا مطالعہ نہیں کیا ہوسکتا ہے تمام ادیبوں، صحافیوں کو اس طرح عورتوں کے خانے میں ڈال دیا گیا ہو جس طرح ایک زمانے میں ارباب نشاط کے خانے میں ڈالا گیا تھا۔

ع یاروں کو تجھ سے حالی کیا بدگمانیاں ہیں

ممکن ہے زینب بی بی یا یاسمین خانم کو مردوں میں شامل کر کے حساب پورا کر دیا گیا ہو۔ ہمارے خیال میں تو آئندہ عورتوں مردوں کی علیحدہ صفت بندی کا جھنجٹ نہیں ہونا چاہیے۔ جب زندگی میں جھنجٹ نہیں تو فہرستوں میں کیوں۔ آپ نے سنا ہوگا۔ کہیں کھیل ہو رہا تھا کسی تماشائی نے کہا۔

"بھئی یہ لڑکی بہت اچھا کھیلتی ہے۔" پاس سے آواز آئی۔ "یہ لڑکی نہیں ہے، لڑکا ہے۔ میرا بیٹا ہے۔"

پوچھنے والے نے کہا۔

"تو گویا آپ اس کے باپ ہیں؟"

مخاطب نے بہت احتجاج کیا اور کہا۔

"بدتمیز کہیں کے۔ میں اس کا باپ نہیں، ماں ہوں۔"

(اخبار جہاں، باتیں انشا جی کی ۱۱-۲-۷۰)

☆☆☆

چٹ چوری پٹ فیصلہ

لاہور کی خبر ہے کہ یہاں پچھلے دنوں سائیکل چوری کے ایک مقدمے کا فیصلہ سنا دیا گیا۔ ۱۷ مئی ۱۹۵۲ء کو ایک شخص عبدالحمید کی سائیکل چوری کرنے کے الزام میں دو افراد کے خلاف رپورٹ درج کرائی گئی تھی جن کے نام خبر میں مسمیان عبدالحمید اور جاوید اقبال بتائے گئے ہیں۔ مجسٹریٹ نے اکتوبر ۱۹۷۶ء میں حتمی فیصلہ سنا دیا اور ملزموں کو بری کر دیا۔ رپورٹ درج کرانے اور فیصلہ سنانے کے درمیان فقط چوبیس سال ہوتے ہیں۔

چوبیس سال قوموں کی زندگی میں کوئی معنی نہیں رکھتے۔ سکندر اعظم کی آمد بظاہر کل کا واقعہ معلوم ہوتی ہے اور محمود غزنوی کے ہندوستان پر حملے بھی۔ ممکن ہے کچھ چشم دید گواہ بھی ان واقعات کے نکل آئیں۔ کیا آپ یقین کریں گے کہ ان دونوں واقعات پر صدیاں گزر چکی ہیں۔ دور کیوں جایئے دیدہ ور کا پیدا ہونا کوئی ایسی بڑی بات معلوم نہیں ہوتی۔ بعض لوگ تو یہاں تک دعوے کرتے ہیں کہ آپ آج آرڈر دیجیے ہم کل دس دیدہ ور پیدا کر دیں گے جن کی بغل میں یوم اقبالؒ کے جلسوں میں پڑھے جانے کے لائق زناٹے کے مقالے بھی ہوں گے۔ حالانکہ خود حضرت اقبالؒ نے جو پیہم رواں، پیہم دواں قسم کی باتیں کیا کرتے تھے اس کے لیے ہزاروں سال نرگس کے رونے کی

شرط رکھی تھی۔ یہاں ہم فٹ نوٹ کے طور پر عرض کر دیں کہ اقبال کے ایک شارع نے شعر کی شرح کرتے ہوئے نرگس راج کپور کا نام لکھا ہے۔ وہ صحیح نہیں ہے۔ نرگس سلمہا کی عمر علامہ اقبال کے انتقال کے وقت اتنی زیادہ نہ تھی۔ کم از کم ہزاروں برس تو ہرگز نہ تھی۔ پھر نرگس راج کپور کا بے نوری سے کچھ تعلق نہیں۔ وہ تو نورٌ علیٰ نور ہیں یا کچھ سال پہلے تک تھیں۔ علامہ اقبال کا اشارہ کسی اور نرگس کی طرف رہا ہوگا۔

☆☆

خیر ذکر سائیکل کا ہو رہا تھا جو بوجہ ہماری علمیت کے علامہ اقبال کی طرف نکل گیا بلکہ زمان و مکان کے مسائل میں جا الجھا۔ ہمارا کہنا یہ ہے کہ دو پہیے کی سائیکل کے مقدمے کا فیصلہ اتنی جلدی یعنی ۲۴ سال میں ہو جانا بڑی حیرت کی بات ہے جس سے امید بندھتی ہے کہ آئندہ کوئی چار پہیے کی موٹر چوری ہو تو اس کا فیصلہ ہونے اور چوری کے ملزموں کے بری ہونے میں نصف صدی سے زیادہ وقت نہ لگے گا۔ علامہ اقبال ۱۹۳۸ء میں انتقال کر گئے۔ انہیں کہاں اندازہ ہوگا کہ دنیا میں کم از کم ان کے خوابوں کے پاکستان میں انصاف کی رفتار اتنی تیز ہو جائے گی کہ اِدھر کوئی چیز چوری ہوئی اُدھر چٹکی بجاتے میں ربع صدی سے بھی کم میں اس کا مقدمہ فیصل۔ یہ سچ ہے کہ جہانگیر وغیرہ کے زمانے میں بھی فیصلے زیادہ دیر نہ لیتے تھے۔ اِدھر فریادی نے گھنٹہ بجایا۔ اُدھر جہانگیر نے جھروکے میں آ کر فیصلہ سنا دیا۔ موڈ اچھا ہوا تو فریادی کے حق میں، نہ اچھا ہوا تو فریادی کے خلاف کہ لے جاؤ نابکار کو۔ ہماری نیند میں خواہ مخواہ کو خلل ڈالتا ہے۔ اس تعمیل کو ہم سند اس لیے نہیں بناتے کہ جہانگیر کے زمانے میں تحریری کارروائی نہ ہوتی تھی۔ ایف آئی آر نہ کٹتی تھی۔ تفتیش کنندگان نہ تھے۔ اسٹامپ فروش نہ تھے۔ اپیلیں نہ تھیں۔ اسٹے آرڈر نہ تھے۔ رِٹ کا دستور نہ تھا۔ یہ سب چیزیں ہوئیں تو ہم دیکھتے کہ جہانگیر یا نوشیرواں یا بکرماجیت جن کے نام تاریخ میں ناحق مشہور ہیں کیسے انصاف

سے عہدہ برآ ہوتے ہیں۔

☆☆

اس مقدمے میں خوشی اور حیرت کی بات یہ ہے کہ دونوں ملزم بحمد اللہ حیات ہیں۔ اس دوران میں فوت نہیں ہوئے۔ یہ ان کی خوش قسمتی ہے کہ نوعمری ہی میں ان کے خلاف مقدمہ درج ہو گیا تھا۔ اُس وقت جاوید اقبال کی عمر بارہ سال تھی۔ اب ۳۶ سال ہے اور عبدالحمید ۱۴ برس کا تھا۔ اب ۳۸ سال کا ہے اور دونوں کھڑ بڑی داڑھی رکھے پھرتے ہیں۔ افسوس خبر میں سائیکل اور مالک کا ذکر نہیں۔ غالباً یہ دونوں فوت ہو چکے ہیں۔ یہ بھی پتا نہیں چلتا کہ رپورٹ درج کراتے وقت سائیکل کی اور اس کے مالک کی عمر کیا تھی۔ کچھ نہ کچھ تو رہی ہو گی۔

عبدالحمید اور جاوید اقبال دونوں ملزموں کی صرف داڑھی ہی نہیں بڑھی بلکہ لیاقت بھی اس دوران میں بہت بڑھی ہو گی کیوں کہ اس مقدمے کی اب تک پانچ سو پیشیاں ہوئی ہیں۔ یعنی سائیکل میں پہیوں کے اسپوکس سمیت جتنے پرزے ہوتے ہیں ان سے کوئی تین گنا گئی۔ جو آدمی پانچ سو بار عدالت میں پیش ہو گا خواہ کسی حیثیت میں بھی ہو اس کا قانون پر عبور حاصل کرنا یقینی امر ہے۔ مجسٹریٹ صاحب نے ان دونوں کو بری تو کر دیا ہے لیکن اس کے ساتھ وکالت کی ڈگری بھی دے دیتے تو اچھا ہوتا۔ ویسے اگر ان صاحبوں کو مزید علم حاصل کرنا ہے تو اس کی گنجائش ابھی موجود ہے۔ ۳۶ یا ۳۸ برس کوئی ایسی عمر نہیں ہوتی۔ ابھی یہ لوگ اپنی طبعی زندگی کے حساب میں ایک سائیکل اور چرا سکتے ہیں۔ دوبارہ بری ہونے کے وقت ایک ان میں ساٹھ سال کے ہوں گے دوسرے باسٹھ برس کے۔ لیکن فائدہ یہ ہو گا کہ پھر ایک ہزار پیشیوں اور نصف صدی کا عدالتی تجربہ ان کی پشت پر ہو گا۔ جو اس زندگی میں نہ سہی آئندہ زندگی میں ضرور ان کے کام آئے گا۔

سائیکل کے مالک کا نام اس خبر کے موجب عبدالحمید تھا۔ ملزموں میں سے ایک کا نام بھی عبدالحمید ہے جس سے شبہ ہوتا ہے کہ کہیں اس نے یعنی سائیکل کے مالک ہی نے تو جاوید اقبال کے ساتھ سازش کر کے خود ہی اپنی سائیکل نہیں چرالی تاکہ مقدمے کو طول دے کر ہمارے نظام عدالت اور اس کی طوالت کو بدنام کر سکے اور پھر پولیس نے اس کی بدنیتی کو بھانپ کر اسے شامل تفتیش بلکہ ملزموں میں شامل کر لیا ہو۔ اگر یہ ہم نامی اتفاقی ہے تو آئندہ یہ قانونی پابندی ہونی چاہیے کہ مستغیث اور ملزم ایک نام کے نہ ہوا کریں تاکہ ہم جیسے پڑھنے والوں کو اشتباہ نہ ہو۔ ایک قصہ ہم نے پڑھا تھا کہ ایک ملزم جس پر ایک کمبل چرانے کا الزام تھا عدالت سے بری ہو گیا۔ اس نے فیصلہ سننے کے بعد دست بستہ جج سے پوچھا کہ حضور آپ کی مہربانی۔ تو کیا اب وہ کمبل میں اپنے پاس ہی رکھ سکتا ہوں....؟ ہمارے خیال میں ہمارے فاضل مجسٹریٹ کو بھی دونوں ملزموں کو بری کرنے کے ساتھ اس امر کی اجازت دے دینی چاہیے تھی کہ وہ سائیکل اپنے پاس رکھ لیں کیونکہ ۲۴ سال پیشیاں بھگتنے' تھانے' حوالات جانے' وکیل وغیرہ کرنے پر ان کا جو خرچ ہوا ہو گا' اس سے وہ اور کچھ اور نہیں تو ایک مرسیڈیز کار تو خرید ہی سکتے تھے۔

ایک دلچسپ بات اس مقدمے میں یہ ہے کہ مقدمے کے تفتیشی افسر اے۔ ایس۔ آئی منظور احمد ان چوبیس سال میں ایک بار بھی عدالت میں پیش نہیں ہوئے۔ عدالت نے پولیس کے افسران اعلا کو کئی بار ہدایت کی کہ منظور احمد کو پیدا کریں اور اگر وہ پیدا ہو چکا ہے تو عدالت میں پیش کریں۔ لیکن یہ لوگ جو دنیا کی ہر چیز پیدا کرنے اور پیش کرنے پر قادر ہیں، شاعروں کی جیب سے بیاض کی جگہ بم اور کوکین تک برآمد کر سکتے ہیں، ایک ذرا سے اے۔ ایس آئی کو برآمد نہ کر سکے۔ ہم نے ایک بار پولیس کے ہر چیز برآمد کر لینے پر خوش ہو کر حکومت سے سفارش کی تھی کہ ملک کی برآمدات بڑھانے کا

ٹھیکہ بھی پولیس کو دے دیا جائے۔ اب اس تجویز پر نظر ثانی کرنی ہوگی۔

دوسری چیز جو منظور احمد کے علاوہ مفقود الخبر ہے وہ سائیکل ہے۔ مالک کے پاس وہ نہیں ہے ورنہ وہ رپورٹ درج کیوں کراتا۔ ملزموں کے پاس وہ نہیں ہے ورنہ بری کیوں ہوتے۔ پھر ہے تو کہاں ہے؟ وہ قصہ آپ نے سنا ہوگا کہ ایک صاحب سیر بھر قیمہ لائے تھے۔ نوکر کو بھوک لگی تو وہ اسے تل کر چٹ کر گیا۔ مالک نے پوچھا تو اس نے کہا کہ حضور بلی کھا گئی۔ مالک نے بلی کو پکڑ منگوایا اور تولا تو وہ سیر بھر نکلی۔ مالک نے کہا کہ "اے شخص، اگر یہ بلی ہے تو قیمہ کہاں ہے اور اگر یہ قیمہ ہے تو بلی کہاں ہے؟" کہیں ایسا تو نہیں کہ مذکورہ اے۔ ایس۔ آئی اسی سائیکل پر سوار ہو کر تفتیش کرتے کرتے دور بہت دور افق کے پار نکل گیا ہو۔ ہماری دانست میں ایک مقدمہ اس سلسلے میں بھی درج ہونا چاہیے۔ مسمی منظور احمد بری تو اس میں ہو جائے گا لیکن کب؟ ۲۰۰۰ء میں۔

اگر ملزمان مذکورہ عبدالحمید اور جاوید اقبال کسی کو قتل کر دیتے اور بالفرض محال بری نہ ہوتے تو اغلب ہے کہ ان کو چودہ سال کی قید کی سزا ہوتی یعنی آج سے دس سال پہلے وہ مقدمے اور عدالتوں کے چکر سے آزاد ہو چکے ہوتے۔ ثابت یہ ہوا کہ کبھی کوئی چھوٹا جرم مثلاً سائیکل وغیرہ کی چوری نہ کرنا چاہیے بلکہ..... آگے ہم وضاحت نہیں کرتے۔ کیا عجب قتل کی ترغیب اور اعانت وغیرہ کی دفعہ میں خود بھی ماخوذ نہ ہو جائیں اور ۲۴ سال بعد جا کر بری ہوں۔ نہ صاحب نہ، ہم کوئی مشورہ نہیں دیتے۔

(جنگ، دخل در معقولات۔ ۷۶۔۱۱۔۸)

☆☆☆

کچھ اخباروں کے بارے میں

ہمارے اخباروں نے بھی ہمارے دیکھتے دیکھتے کتنی ترقی کی ہے۔ اور کیا کیا رنگ بدلے ہیں، پہلے اردو اخبار لیتھو میں چھپتے تھے یعنی کاتب پیلے کاغذ پر ذرا زیادہ پیلی روشنائی سے لکھتا تھا۔ پروف ریڈر اسے پڑھنے کے لیے آنکھوں کا تیل ٹپکاتا تھا اور چکی کے پاٹوں والی عینک لگاتا تھا۔ کبھی کبھی تصویر کا چربہ لگا کر اخبار کو باتصویر بنانے کی بھی کوشش کی جاتی تھی۔ تصویر بہت صاف آ جائے تو صاحب تصویر کا کوٹ اور سر کے بال کچھ دکھائی دے جاتے تھے۔ باقی حلیہ قاری کے قیاس پر چھوڑ دیا جاتا تھا۔ کئی بار ایسا ہوا کہ چرچل کی جگہ سرسید احمد خان کی داڑھی والی تصویر لگ گئی۔ بلکہ ایک بار تو گاندھی جی کے ایک بیان کے ساتھ گاندھی جی کے بجائے ایک گینڈے کی تصویر چسپاں کر دی گئی، کیونکہ اس وقت اسٹاک میں وہی میسر تھی، دیدہ ور قارئین کرام کو آنکھوں آنکھ پتا نہ چلا۔ اسی سے ہمارے مایہ ناز مزاح نگار مشتاق احمد یوسفی نے ایک محاورہ بھی نکالا۔ "ٹھہر ذرا ابھی تیرا لیتھو بناتا ہوں۔" یعنی ایسی درگت بناؤں گا کہ شکل نہ پہچانی جائے گی۔

☆☆

انصاف کی بات یہ ہے کہ باکمال کاریگروں نے لیتھو میں بھی ایسی ایسی کتابیں

چھاپ دکھائیں کہ آنکھیں روشن ہوں۔ اور کاتب بھی ایسے باکمال گزرے ہیں کہ پلیٹ پر سے عبارت اڑ جائے (جو الٹی لکھی ہوتی ہے) تو صفحوں کے صفحے الٹے لکھ جاتے تھے۔ خیر اخباروں کی حد تک وہ دور اب ماضی ہوا۔ اب تو بیس بیس صفحے کا جہازی سائز پر روزانہ اخبار نکلتا ہے اور رنگ برنگی تصویریں آتی ہیں۔ یہ سب آفسٹ کا کمال ہے، ظاہری صورت کے ساتھ خبروں، اداریوں اور کالموں کا اسلوب بھی بدلا۔
لیکن صوری سے معنوی تبدیلیوں کے ذکر کی طرف آنا خطرے سے خالی نہیں۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ پرانے زمانے کے اخبار نویس مولانا محمد علی ظفر علی خان اور حسرت موہانی، اسی غریب لیتھو میں حق کی بات کر جاتے تھے، خواہ اس کی پاداش میں اپنا پریس ضبط کراتے تھے اور جیل کی ہوا کھاتے تھے۔ اس آفسٹ کے ترقی یافتہ زمانے میں جب کہ اخبار حق کے پرچار کے لیے نہیں بلکہ اشتہار کے لیے نکالا جاتا ہے۔ اخبار والا فقط وہ بات کہتا ہے جس میں اس کی جان و مال کو خطرہ نہ ہو۔ ورنہ چپ رہتا ہے جیل نہیں جاتا۔ اکڑوں بیٹھ کر چنے کی دال نہیں کھاتا۔ اپنا آفسٹ مشینوں والا پریس ضبط نہیں کراتا۔

☆☆

لاہور سے ہمارے بعض عزیز دوستوں نے اخبار نکالا ہے۔ اور سرخیوں کا انداز یکسر بدل ڈالا ہے۔ پچھلے مرکزی الیکشنوں کے نتائج کا اعلان ہوا تو اس اخبار نے ایک ڈیڑھ فٹ اونچے حروف میں سرخی دی۔

پھر آ گیا

یعنی شیر آیا۔ شیر آیا۔ دوڑنا۔ اسی اخبار نے اپنے حریفوں کے لیے ٹھاہ کا لفظ ایجاد کیا۔ اپنوں کے لیے واہ۔ دوسروں کے لیے ٹھاہ۔ فلاں ٹھاہ۔ ڈھمکا ٹھاہ۔ دیکھتے دیکھتے

دوسرے اخباروں نے بھی یہ نسخہ کیمیا اُچک لیا۔ ہر طرف ٹھاہ ٹھاہ ہونے لگی، پورا ملک چاند ماری کا میدان بن گیا۔
اتنے میں نیوز پرنٹ کی قلت ہو گئی۔ صفحے سکڑنے لگے۔ یہ ضروری ہو گیا کہ سرخیاں بھی مختصر کی جائیں۔ تین تین لفظوں کی سرخی دینا عیاشی معلوم ہونے لگا۔ ایک روز ہم نے اس اخبار میں یہ بڑی سرخی دیکھی۔

صفایا

معلوم ہوا اس روز پاکستانی فوج نے کسی مقام پر دراندازوں کا صفایا کر دیا تھا۔ ہم سمجھے اب اس سے زیادہ اختصار ممکن نہیں، لیکن سابق صدر ایوب جواب کے پردیس گئے اور لگا کر ٹھیس گئے تو اس اخبار نے تصویر اور خبر کے درمیان یہ یک لفظی سرخی دی۔

گیا

کون گیا، کہاں گیا اور کیوں گیا اور کب گیا؟ یہ تو خبر پڑھنے سے معلوم ہو ہی جاتا ہے۔ سرخی میں یہ تفصیل دینے کی ضرورت نہیں لیکن کراچی کے اخبار اب تک پرانی وضع کی لمبی لمبی سرخیاں دیے جا رہے ہیں حتیٰ کہ متن میں دینے کے لیے کچھ نہیں بچتا۔ بھلا یہ بھی کوئی سرخی ہوئی۔

''ماؤزے تنگ نے نکسن کو بلایا اور نکسن نے کہا۔ میں آیا۔''

غور کیجیے تو کون سا سمندر ہے جسے آپ کوزے میں نہیں بند کر سکتے۔ آخر کسی نے حضرت یوسف علیہ السلام کے قصے کا خلاصہ کیا ہی تھا۔ پدرے بود پسرے داشت، گم کرد، باز یافت۔'' انہی چند دن کے اخباروں میں سے بعض خبریں ہمارے سامنے ہیں، جن کی سرخیوں پر اختصار کا عمل کر کے ہم کافی نیوز پرنٹ بچا سکتے تھے، مثلاً۔

آ

پیکنگ۔ چین کے بطلِ عظیم ماؤزے تنگ نے امریکہ کے صدر نکسن کو دعوت دی ہے کہ وہ چین تشریف لائیں، یہاں ان کا ہر طرح سے خیر مقدم کیا جائے گا۔

اچھا

واشنگٹن۔ ماؤزے تنگ نے صدر نکسن کو جو دعوت دی تھی کہ ہماری گلی آنا، صدر نکسن نے اس کے جواب میں کہا۔ اچھا جی۔ لیکن میں چین کب جاؤں گا یہ ابھی نہیں کہہ سکتا۔

جا

ماسکو۔ روس نے ماسکو کے برطانوی سفارت خانے کے ایک ڈپلومیٹ کی سرگرمیوں پر سخت اعتراض کیا ہے، اور ہدایت کی ہے کہ چوبیس گھنٹے کے اندر روس کی حدود سے نکل جائے۔

کیا؟

لندن۔ برطانیہ کی حکومت نے روسیوں کے اس اقدام پر کہ ایک برطانوی سفارتی افسر کو روس سے نکال دیا گیا ہے، کہا ہے کہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا، اس اخراج کی کیا وجہ ہے، افسر مذکور وہاں کسی کا کیا لیتا تھا بس! جاسوسی ہی تو کرتا تھا۔

دے

تل ابیب۔ اسرائیل کی وزیر اعظم گولڈا میئر نے صدر نکسن کو پیغام بھیجا ہے کہ "دے جا

خدا کے نام پر بابا ہمت ہے گر دینے کی۔ ہاتھی نہیں مانگتی، گھوڑا نہیں مانگتی۔ بس سو پچاس ہوائی جہاز اور کچھ جیب خرچ وغیرہ تا کہ عربوں کے علاقے ہاتھ سے نہ نکلنے پائیں۔"

لے

واشنگٹن۔ صدر نکسن نے وزیر اعظم اسرائیل کی اپیل پر اسے چالیس فنیٹم جیٹ طیارے دیے ہیں، اور چالیس ارب ڈالر بطور نان و نفقہ منی آرڈر کر دیے ہیں اور کہا ہے لے تو بھی کیا یاد کرے گی کسی رئیس سے پالا پڑا تھا۔ مرا پیار یاد رکھنا۔

کھا

کراچی۔ کل مسٹر ابن انشا نے جاپان کے مشہور پبلشر مسٹر نوما کو ایک پر تکلف لنچ دیا۔ اس کے بعد مشہور شاعر جمیل الدین عالی کو فلم "شیراں دے پتر شیر" دکھائی اور انٹرول کے دوران جیب سے مٹھی بھر مونگ پھلی نکال کر پیش کی اور کہا۔ کھا۔ کھا جا۔ اس میں وٹامن ڈی ہوتی ہے۔

پی

کراچی۔ کے ڈی اے کے ایک ترجمان نے لوگوں کی شکایتوں کے جواب میں کہا ہے کہ آج کل جو پانی شہریوں کو دیا جا رہا ہے وہ ہرگز مضر صحت نہیں ہے۔ جیسا کہ اس کے ذائقے سے معلوم ہوگا۔ سپلائی کرنے سے پہلے اسے ایک دن حقے میں استعمال کیا جاتا ہے۔ تمباکو کا دھواں بار بار گزرنے سے اس کے جراثیم مر جاتے ہیں۔ بالفرض یہ مضر صحت ہے بھی تو ہم کیا کریں۔ کراچی کے شہریوں کو ہماری طرف سے اجازت ہے

کہ سوڈا واٹر پیئیں۔ گرائپ واٹر پیئیں۔

سرخیوں میں اختصار کا یہی رجحان رہا تو بات ایک حرف پر آ کر ٹھہرے گی ملاحظہ ہو۔

لاہور۔ صوبے کے وزیر اعظم خان بہادر محمد فاضل نے اعلان کیا ہے کہ عن قریب صوبے میں تعلیم بالکل عام کر دی جائے گی۔

محمد فاضل صاحب نے حضرت بلھے شاہ کے ایک قول کا حوالہ دیا۔

علموں بس کریں او یار ☆ اِکو الف تجھے درکار

یعنی تعلیم الف پر شروع ہو کر الف پر ختم ہو جانی چاہیے۔ وزیر تعلیم نے کہا۔ بعض لوگ میرے نام اور ایک مشہور محاورے کی وجہ سے خیال کرتے ہیں کہ میں پڑھا لکھا نہیں حالانکہ میں الف پڑھ بھی سکتا ہوں اور لکھ کر بھی دکھا سکتا ہوں۔

اس کے بعد وزیر تعلیم نے (ا) لکھ کر دکھایا۔ حاضرین نے تالیاں بھی بجائیں اور الف زندہ باد کے نعرے لگائے۔

☆☆☆

ویسے تو ہم خیریت سے ہیں

ایک شخص کے پاؤں کے انگوٹھے پر ایک گومڑ سا نکل آیا تھا۔ کسی نے کہا اسپتال جا کر اسے کٹوا دو۔ معمولی سا آپریشن ہوگا۔ پس وہ اسپتال چلا گیا۔ آپریشن کے لیے اسے بے ہوش کرنے کی دوا دی گئی جس سے اس کو دل کا دورہ پڑ گیا۔ اسے آکسیجن ٹینٹ میں رکھا گیا جس میں ہڈیوں کی سوزش کے جراثیم پہلے سے موجود تھے چنانچہ اسے وہ بیماری لگ گئی۔ اسے اسٹریچر پر لیے جا رہے تھے کہ اسٹریچر الٹ گیا جس سے اس کی ایک ٹانگ اور ہنسلی کی ہڈی ٹوٹ گئی اور اس ضرب سے اس کو دل کا ایک اور دورہ پڑ گیا۔ دم تحریر وہ اس عالم میں ہے کہ اس کے ایک نلکی سانس لینے کے لیے لگی ہے۔ ایک نلکی پیشاب خارج کرنے کے لیے۔ ٹانگ پلاسٹر میں جکڑی ہے اور بازو پٹی میں بندھا گلے کا ہار ہو رہا ہے۔ اب رہا وہ گومڑا۔ اسے سب بھول گئے ہیں۔ وہ جہاں تھا وہیں ہے۔

☆☆

یہ خبر ارجنٹائن کی ہے اور کسی اور کے بارے میں ہے لیکن یہ یہاں کی بھی ہو سکتی ہے اور ہم خوش قسمت نہ ہوتے تو ہمارے بارے میں بھی ہو سکتی تھی کیونکہ اپنی ٹانگ کو لیے لیے ہم ایک مقامی اسپتال میں بھی ہو آئے ہیں جہاں ہر کوئی ہر کسی سے شاکی تھا۔

زیادہ تفصیل میں اس لیے نہیں جاتے کہ ہمیں تجربے نے بتا دیا ہے کہ کبھی اسپتالوں
کے بارے میں نہ لکھنا چاہیے۔ کبھی پولیس اور تھانے کے بارے میں نہ لکھنا چاہیے۔
بلکہ جیسا کہ قدرت اللہ شہاب کے مشہور افسانے 'رپورٹ پٹواری مفصل ہے' میں ہے
کسی پٹواری کے بارے میں بھی لکھنے کی حماقت نہیں کرنی چاہیے کیونکہ ہر پھر کر واسطہ
انہی لوگوں سے پڑنا ہوتا ہے۔ شہاب صاحب کے سائل نے جس کی زمین پٹواری نے
کسی اور کے کھاتے میں ڈال دی تھی۔ شکایت تو گورنر کے نام بھیجی تھی' انہوں نے اپنے
سیکریٹری کو برائے ضروری کارروائی بھیج دی۔ سیکریٹری نے کمشنر کو کمشنر نے ڈپٹی کمشنر کو'
ڈپٹی کمشنر نے تحصیل دار کو اور تحصیل دار نے اسی پٹواری کو منتقل کر دی کہ اس پر ضروری
کارروائی کی جائے۔ پٹواری نے درخواست دہندہ کو بلایا۔ ایک جوتا لگاتا تھا اور ایک
درخواست دکھاتا تھا۔ درخواست دکھاتا تھا اور ایک جوتا لگاتا تھا کہ اور دے درخواست
گورنر کو۔ بڑا آیا ہماری شکایتیں کرنے والا۔ اس ''ضروری کارروائی'' کے بعد
درخواست یہ لکھ کر گورنر صاحب کو لوٹا دی کہ مناسب تحقیق کی گئی۔ مدعی جھوٹا ہے۔ جھوٹی
درخواستیں دینے کا عادی ہے۔ شکایت داخل دفتر کی جائے۔

ہم کوئی دس دن سے اپنی ٹانگ سمیت بستر پر پڑے ہیں۔ ہمارے دوست ڈاکٹر منیر
الحق ہمیں دیکھ جاتے ہیں اور دلاسا دیتے ہیں کہ چند روز اور مری جان فقط چند ہی روز
انہوں نے نصیحت بھی کی کہ پرائے پھٹے میں ٹانگ نہیں اڑانی چاہیے۔ ہم نے کہا ڈاکٹر
صاحب ہم نے نہیں اڑائی لیکن اگر پرایا پھٹہ خود آ کر ہماری ٹانگ میں اڑ جائے تو کیا
کر سکتے ہیں۔ ایک اور دوست نے فرمایا کہ یہ جو تم دعوے کرتے پھرتے ہو کہ تم کو
دولت مل رہی تھی۔ تم نے اس پر لات ماردی' کوئی بڑا عہدہ مل رہا تھا اس پر لات ماردی'
تو ایسے کاموں کا تو یہی نتیجہ ہوتا ہے۔ ہم نے کہا نہیں صاحب یہ بات نہیں۔ زبان سے
کہنے کی بات اور ہے۔ ہم عزت' شہرت یا عہدے پر لات مارنے والے آدمی نہیں

ہیں۔ بات فقط اتنی ہے کہ ۳۱ جنوری کو ریڈیو پاکستان کے سامنے ٹیکسی لینے کے لیے ہم
سڑک پار کر رہے تھے کہ غلط سائیڈ سے آ کر ٹیلی فون کے محکمے کی ایک جیپ نے
ہمیں ٹکر ماردی اور دور اچھال دیا۔ رپورٹ ہم نے اس لیے نہیں کی کہ اس مقام پر
جہاں پانچ طرف سے ٹریفک آتا ہے اور سڑک عبور کرنے میں پندرہ منٹ لگتے ہیں نہ
کوئی زیبرا کراسنگ ہے نہ کوئی ٹریفک کا آدمی ہوتا ہے۔ ہوتا بھی تو رپورٹ کا کچھ
مقام نہ تھا۔ قصور ہمارا تھا۔ ہم کیوں گھر سے باہر نکلتے ہیں۔ الٹا ہم نے جیپ والے کا
شکریہ ادا کیا کہ ہمیں زندہ رہنے دیا۔ خبر اس واردات کی اس لیے کسی کو نہ ہوئی کہ
ہمارے شہر میں اگر کوئی گاڑی کسی آدمی کو ٹکر مار دے تو یہ خبر نہیں ہے۔ ہاں کوئی آدمی کسی
گاڑی کو ٹکر مارے تو خبر بنتی ہے۔

عباسی شہید اسپتال بہت بڑا عالیشان اسپتال ہے۔ وہاں کے ڈاکٹروں نے ہمیں
پہچان کر ہماری طرف خاطر خواہ توجہ دی۔ لیکن اسپتال صرف سنگ و خشت نہیں ہوتا۔
ایکسرے کرنے والا آدمی پون گھنٹے کی تلاش کے بعد ملا۔ اور ملا تو ہم سے ایمرجنسی کی
فیس چارج کی۔ لیبارٹری کا نظام جیسا اس اسپتال میں ہونا چاہیے ویسا نہیں ہے۔ ماہر
ڈاکٹروں کی بھی کمی ہے۔ ہمارا خیال تھا کہ اتنے بڑے علاقے کے لیے اتنا بڑا اسپتال
بنا ہے تو کچھ ماہرین جناح اسپتال اور سول اسپتال سے یہاں منتقل کر دیے جائیں
گے۔ لیکن معلوم ہوا کہ جناح اسپتال مرکزی حکومت کا ہے۔ سول اسپتال صوبائی
حکومت کا اور عباسی اسپتال میونسپل کارپوریشن کا۔ یہاں اکثر ڈاکٹر نئے ہیں۔ بعض تو
شاید اسی سال فارغ التحصیل ہوئے ہیں۔ تجربہ کم رکھتے ہیں لیکن ایک صاحب نے کہا
کہ چند سال چیر پھاڑ کرتے رہیں گے اور دوائیں آزماتے رہیں گے تو ان کو بھی تجربہ
ہو جائے گا۔ انسان گاتے گاتے ہی کلاوت ہوتا ہے۔ ویسے ان طالب علم نما ڈاکٹروں
کو دیکھ کر ہمیں وہ مریض یاد آیا جو آپریشن ٹیبل پر لیٹا تو کہنے لگا ڈاکٹر صاحب مجھے

گھبراہٹ ہو رہی ہے کیونکہ یہ میرا پہلا آپریشن ہے۔ ڈاکٹر نے کہا۔ "گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔ میرا بھی تو یہ پہلا آپریشن ہے۔ میں کوئی گھبرا رہا ہوں۔"

ویسے تو ہم خیریت سے ہیں لیکن اس تقریب سے بستر پر پڑے سارا سارا دن یہ سوچتے رہتے ہیں کہ ہم اپنے اہل وطن کی کس طرح خدمت کر سکتے ہیں اور ہمارے اہل وطن ہماری کیا خدمت کر سکتے ہیں۔ چونکہ ہم مشرقی تہذیب کے آدمی ہیں "پہلے آپ" کے قائل ہیں لہٰذا اس معاملے میں بھی پہل کرنے کا موقع اہل وطن ہی کو دینا چاہتے ہیں۔ قومی خدمت کا جذبہ ہم میں ایک تو فراغت کی وجہ سے پیدا ہوا ہے' کچھ یارعزیز الحاج جمیل الدین عالیؔ کی صحبت سے جو ہمیں برابر دیکھنے آتے رہے ہیں۔ حج کرنے کے بعد سے ہم ان میں نمایاں فرق دیکھ رہے ہیں۔ لہو ولعب کی طرف ان کو رغبت مطلق نہیں رہی۔ خیالاتِ فاسدہ ان میں پہلے بھی نہیں تھے' اب تو اور بھی نہیں رہے۔ غزلوں دوہوں کو لاحاصل قرار دے کر انہوں نے عزم کیا ہے کہ آئندہ صرف قوالوں کی فرمائش پر گراموفون کمپنیوں کے لیے لکھا کریں گے۔ ایک ایسی کتاب لکھنے کا ارادہ رکھتے ہیں جس سے دنیا بالکل ٹھیک ہو جائے۔ ہر طرف عربی ہی عربی رائج ہو جائے اور مسلمانوں میں کسی قسم کی کوئی خرابی باقی نہ رہے۔ تبلیغی تقریریں اس جذبے سے کرتے ہیں کہ بے اختیار جی چاہتا ہے ان کے ہاتھ پر اسلام قبول کر لیں۔ پھر خیال آتا ہے ہم تو پہلے سے مسلمان ہیں۔ اگر آپ کو کوئی شخص عربی لباس میں رجز پڑھتا ہوا' ننگی شمشیر ہاتھ میں لیے گھوڑے پر سوار بحرِ ظلمات کا راستہ پوچھتا نظر آئے تو نام پوچھنے کی ضرورت نہیں۔ اور کون ہو سکتا ہے۔

(۱۱ فروری ۱۹۷۴ء۔ روزنامہ جنگ)

ایک دو کہانیاں مکرّر ارشاد ہیں

جو شخص سیدھی بات نہ کہہ سکے یا سیدھی بات کو موثر نہ پائے وہ کہانیاں کہتا ہے' چنانچہ ان دو سال میں ہمارا منصب بھی داستان گو کا رہا ہے' ہم نے مختلف اوقات میں کتنی ہی کہانیاں کہیں جو اے پیارے طالب علمو..... ہر عمر کے طالب علمو' آپ لوگوں نے دلچسپی سے سنیں۔ یہ کہانیاں بھی جو آج آپ کی پُر زور فرمائش کے بغیر ہی ہم مکرر ارشاد کر رہے ہیں' کچھ نئی نہیں ہیں۔ بلکہ چربہ کہانیاں ہیں لیکن۔

مرا معنیٔ تازہ مدعا ست

امید ہے آپ لوگ انہیں دلچسپی سے پڑھیں گے اور دعائے خیر سے یاد کریں گے۔

چڑا اور چڑیا

ایک تھی چڑیا' ایک تھا چڑا۔ چڑیا لائی دال کا دانا۔ چڑا لایا چاول کا دانا۔ اس سے کھچڑی پکائی دونوں نے پیٹ بھر کر کھائی۔ آپس میں اتفاق ہو تو ایک ایک دانے کی کھچڑی بھی بہت ہو جاتی ہے۔

چڑا بیٹھا اونگھ رہا تھا کہ اس کے دل میں وسوسا آیا کہ چاول کا دانا بڑا ہوتا ہے' دال کا دانا چھوٹا ہوتا ہے۔ پس دوسرے روز کھچڑی پکی تو چڑے نے کہا۔ "اس میں سے چھپن

حصے مجھے دے، چوالیس حصے تو لے۔ اے بھاگوان... پسند کر یا ناپسند کر۔ حقائق سے آنکھ مت بند کر، چڑے نے اپنی چونچ میں سے چند نکات بھی نکالے اور اس بی بی کے آگے ڈالے، بی بی حیران بلکہ رو رو کر ہلکان ہوتی کہ اس کے ساتھ میرا جنم کا ساتھ تھا۔ لیکن کیا کر سکتی تھی۔

دوسرے دن پھر چڑیا دال کا دانا لائی اور چڑا چاول کا دانا۔ دونوں نے الگ الگ ہنڈیا چڑھائی، کھچڑی پکائی کیا دیکھتے ہیں کہ دونوں ہنڈیاؤں میں بس ایک ہی ایک دانا ہے، چڑے نے چاول کا دانا کھایا۔ چڑیا نے دال کا دانا اٹھایا۔ چڑے کو خالی چاول سے پیچش ہوگئی، چڑیا کو خالی دال سے قبض ہوگئی۔ دونوں ایک حکیم کے پاس گئے جو ایک بلا تھا۔ اس نے دونوں کے سروں پر شفقت کا ہاتھ پھیرا اور پھیرتا ہی چلا گیا۔

دیکھا تو تھے دو مُشت پَر

یہ کہانی بہت پرانے زمانے کی ہے۔ آج کل تو چاول ایکسپورٹ ہو جاتا ہے اور دال مہنگی ہے۔ اتنی کہ وہ لڑکیاں جو مولوی اسماعیل میرٹھی کے زمانے میں دال بگھارا کرتی تھیں آج کل فقط شیخی بھگارتی ہیں۔

ایک گورو کے دو چیلے

ایک تھا گورو، بڑا نیک، دھرماتما تھا۔ دو اس کے چیلے تھے وفادار، جان نثار، گورو کے خون کی جگہ اپنا پسینہ بہانے کو تیار، ایک کا شبھ نام پور بول تھا۔ دوسرے کا پچھمی چند گورو جی جب لوگوں کو اپدیش دیتے اور ان کی مرادیں پوری کرنے کے بعد.... آرام کرنے کو لیٹتے تو چیلا پور بول ان کی داہنی ٹانگ دباتا اور پچھمی چند بائیں ٹانگ کی ٹہل سیوا کرتا۔ دونوں اپنے اپنے حصے کی ٹانگ کی مٹھی چاپی کرتے، جھنڈیاں اور گھنگرو باندھ کر اسے سجاتے، اس کے جیکارے بلاتے، اس پر مکھی بھی نہ بیٹھنے دیتے تھے، ایک روز کرنا پرماتما

کا کیا ہوا کہ گرو جی ایک کروٹ لیٹ گئے، اور ان کی داہنی ٹانگ بائیں ٹانگ کے اوپر جا پڑی۔ چیلے پور بول کو بہت غصہ آیا۔ اس نے فوراً ایک ڈنڈا اٹھایا اور بائیں ٹانگ کے رسید کیا۔ گورو جی نے بلبلا کر داہنی ٹانگ اوپر کر لی۔ اب پچھمی چند کی غیرت نے جوش مارا اس نے اپنی لٹھیا اٹھائی اور بائیں ٹانگ کی خوب ہی مرمت کی۔ گورو جی بہت چلائے کہ ظالمو، کیوں مارے ڈالتے ہو، ہائے۔ لیکن چیلے کہ علاقائی خودمختاری کے سرور میں تھے، کب مانتے تھے، دونوں نے پریس کانفرنسیں کیں۔ اور زیادتی، میں پہل کرنے کا الزام ایک دوسرے کو دیا۔ گورو جی کی ٹانگیں سوج کر کپا ہوگئیں، مدتوں ہلدی چونا لگانا پڑا۔

اب آئے چیلے۔ کہانی ابھی ختم نہیں ہوئی، لالہ پچھمی چند کے کئی بیٹے تھے، بڑے ہونہار اور ہوشیار، پشاوری مل، لاہوری مل، سندھو رام اور بلوچ رائے، جب لالہ پچھمی چند کا دیہانت ہوا تو یہ ٹانگ انہوں نے ورثے میں پائی۔ وہ گورو جی کی ٹانگ تو دباتے تھے، لیکن کوئی ران کا حصہ زیادہ دباتا تھا۔ کوئی پنڈلی پر زیادہ زور دیتا تھا۔ آخر ایک زبردست جھگڑا ہوا اور سب نے طے کیا کہ ہم اپنا حصہ الگ کر لیں گے۔ لالہ پور بول نے کہا۔ ہاں ہاں ٹھیک کر رہے ہو۔ میں تو اپنے حصے کی پوری ٹانگ کاٹ کر لیے جا رہا ہوں۔ اب ان برخورداروں نے گنڈاسا منگایا۔ ایک نے ران سنبھالی، بوری میں ڈالی۔ دوسرے نے پنڈلی لی، تیسرے نے گھٹنا اٹھایا۔ چوتھے نے باقی کو سمیٹا اور گھر کی راہ لی، اور اس کے بعد سبھی ہنسی خوشی زندگی بسر کرنے لگے۔

گورو جی کا کیا ہوا؟ مرے یا جیے؟ جیے تو کتنے دن تک جیے؟ اس کا کہانی میں ذکر نہیں۔

(جنگ، دخل در معقولات ۱۷-۱-۳)

☆☆☆

لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو

ہم نے لکھنے کا آغاز امروز ہی سے کیا تھا۔ جی چاہتا ہے کہ پھر لکھا جائے۔ گرچہ مطلب کچھ نہ ہو۔ یوں تو اس زمانے میں بھی کچھ مطلب نہ ہوتا تھا لیکن بعد میں تو ہم نے بے مطلب لکھنے میں ایک طرح کا کمال حاصل کرلیا۔ اب ہم آٹھویں یا دسویں جماعت کے طالبعلم تو ہیں نہیں کہ جواب مضمون لکھنے بیٹھیں تو تمہید باندھیں' پھر دلیلیں دیں بعد ازاں نتیجہ نکالیں۔ نتیجہ نکالنے کی ہدایت تو ہمیں چوتھی یا پانچویں جماعت میں ہی کردی گئی تھی، ہمیں یاد ہے ایک بار ہم دسہرے کے میلے میں گئے تھے بڑی رونق تھی۔ طرح طرح کے دیہاتی آئے ہوئے تھے۔ بعضوں نے عذر مستی رکھ کر دھول دھپا بھی کیا۔ انتہائے سرخوشی میں باہم لاٹھی چارج سے بھی باز نہ آئے۔ رام لچھمن کا قصہ تو ہمارے کچھ پلے نہ پڑا۔ ہم نے دسہرے پر مضمون جو لکھا تو بہت سوچ سوچ کر یہ نتیجہ نکالا کہ میلے میں شراب پی کر نہ جانا چاہیے' پولیس پکڑ کرلے جاتی ہے۔'' ماسٹر جی نے بعد میں بتایا کہ ''رام لچھمن کے قصے کا یہ نتیجہ زیادہ صحیح نہیں' ہمیں بھائی کی محبت اور ایثار کے جذبے وغیرہ کا ذکر کرنا چاہیے تھا اور ظالم کے کیفر کردار کو پہنچنے کی بات کرنی چاہیے تھی۔ غلط نتیجہ نکالنے سے یہ زیادہ اچھا ہے کہ سرے سے کوئی نتیجہ نہ نکالا جائے۔'' اس دن کے بعد سے ہم نے اپنے کسی مضمون سے کوئی نتیجہ نہیں نکالا۔ بس پڑھنے

والے نکالتے ہیں اور حساب تک ہمیں معلوم ہے' وہ زیادہ اچھا نہیں ہوتا (ہمارے حق میں) دلیل بازی میں بھی ہم کبھی مشہور نہیں رہے اور تمہید باندھنے سے ہمیں ہمیشہ سے چڑ رہی ہے۔ اب کسی شخصیت پر مضمون لکھو تو ماسٹر جی کا نسخہ یہ تھا کہ پہلے بتاؤ کب پیدا ہوا تھا۔ پھر حالاتِ زندگی۔ پھر کارنامے۔ پھر فاتح ہے تو فتوحات اور مصنف ہے تو تصنیفات کا حوالہ لاؤ اور آخر میں اسے مار کر یعنی سن وفات لکھ کر یا تو مرحوم کو چال چلن کا سرٹیفکیٹ دو کہ ہاں اچھا آدمی تھا یا اس کی حکمتِ عملی پر دو پیرے لکھ کر نتیجہ نکالو۔ اب یہ رواج نہیں ہے۔ لکھنے والے کو اس سے کچھ غرض نہیں ہوتی کہ اس کا ممدوح کب پیدا ہوا اور پیدا ہوا بھی تھا یا نہیں۔ ہم ذاتی طور پر کسی شخص کے پیدا ہونے یا مرنے کو اس کا ذاتی معاملہ سمجھتے ہیں۔ دخل نہیں دیتے۔ لازمہ شرافت بھی یہی ہے۔ ہندوستان میں ہوتے تو اور بات تھی۔ وہاں دوسروں کے معاملوں میں دخل نہ دینا۔ غیر مستحسن بات سمجھی جاتی ہے۔

☆☆

ہم تین آدمی ایک ہی روز امروز کے ادارے میں شامل ہوئے تھے۔ آدمی کے لفظ سے فقط حیوانات کی قسم واضح کرنا مقصود ہے۔ آدمیت وغیرہ کی بحث یہاں بے محل ہے خیر افراد کو لیجیے' انتظار حسین' امجد حسین اور ہم۔ زمانہ یہ اللہ بخشے چراغ حسن حسرت کا تھا کہ کالم نگاری میں کسی کا چراغ ان کے آگے نہ جلا۔ اہل زبان نہ تھے مگر اہل زبان کے لیے بھی زبان پر سند تھے۔ شگفتہ نگاری میں ان کا اسلوب بے ساختہ اور بے تکان تھا۔ فرمائشی مزاح اور لطیفہ نگاری ان کے ہاں نہ تھی۔ یوں تو ہر اخبار میں ہر طرح کا کام ہونا ضروری تھا اور ہمارے مرحوم مخدوم مولانا عبدالمجید سالک کے ہاں بھی عجیب چاشنی تھی لیکن ان کا رنگ الگ تھا۔ حاجی لق لق مرحوم کو بھی لوگ شوق سے پڑھتے تھے اور تقسیم سے پہلے لاہور کے ہندو اخباروں نے بھی اپنے اپنے سالک اور حسرت پیدا کر۔

رکھے تھے۔ تورکھا' نیپالی' نانک چند ناز وغیرہ' یہ ناز صاحب بالخصوص دلچسپ آدمی تھے۔ مولانا ظفرعلی خان سے بھی ٹکر لیتے تھے۔ لیکن لکھتے کیا تھے' پکوڑے تلتے تھے۔ ہمارے سالک صاحب کو تو اپنے لکھنے کا مسالہ زیادہ تر انہی سے ملتا تھا۔

☆☆

ہم تو امروز سے فارغ ہوئے شتابی سے۔ انتظار اور امجد رہ گئے تھے۔ یہ اپنی اپنی باری پر گئے۔ ہم نے کراچی کو ہجرت کی اور امروز کراچی میں لکھتے رہے۔ اس زمانے میں کالموں میں اپنے نام سے لکھنے کا رواج نہ تھا۔ حسرت صاحب سندباد جہازی کے نام سے لکھا کرتے تھے۔ سالک صاحب بھی ''افکار و حوادث'' پر اپنا نام نہ دیتے تھے۔ ہم نے جانے کن کن ناموں سے مضمون نگاری کی۔ دمشقی' نانا فرنویس' علی بابا' پہلا درویش' پانچواں درویش' حاجی بابا اصفہانی وغیرہ' درویشوں کی سرگزشت یوں ہے کہ ہم گنڈے دار کالم لکھتے تھے۔ (یہی حرف و حکایت) تو اس پر فقط درویش' لکھتے تھے۔ پھر ہمارے دوست طفیل احمد جمالی نے ہمارا ہاتھ بٹانا شروع کیا تو کہا بھئی تم پہلے درویش بن جاؤ' ہم دوسرا درویش بنتے ہیں۔ یہ سلسلہ بہت دن جاری رہا۔ مشتاق احمد یوسفی کہتے ہیں میں ان دنوں بھی تم کو پڑھا کرتا تھا لیکن اس زمانے میں کراچی کے امروز کو فقط خواص پڑھتے تھے یعنی سنجیدہ اور باشعور لوگ' دوسرے لفظوں میں یہ بات یوں کہی جاسکتی ہے کہ اس کی اشاعت بہت محدود ہوتی تھی۔ ہم اپنی دانست میں اچھے سے اچھا کالم لکھتے تھے لیکن داد کے منتظر ہی رہتے تھے خود ذکر کریں تو لوگ پوچھتے تھے امروز؟ کیا کراچی سے بھی نکلتا ہے؟ جمالی صاحب ان دنوں لطیفہ کہا کرتے تھے۔ ''اگر کسی بات کو راز رکھنا ہو۔ ایسے کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو تو امروز میں چھاپ دو۔'' یہ تذکرہ ہم ہارون سعد صاحب سے معذرت کے ساتھ کرتے ہیں' کیونکہ امروز کراچی کے انچارج ایک طرح سے وہی تھے لیکن اس میں ان کا قصور نہیں۔ زمانے کی بدمذاقی کی

طرف اشارہ مقصود ہے۔

پھر ہم نے کالم لکھنا چھوڑا اور اخبارات نے یکایک ترقی کرنی شروع کی۔ یہ ہم واقعات کی زبانی ترتیب بیان کر رہے ہیں۔ اس میں علت و معلول کا رشتہ نہ ڈھونڈا جائے۔ خط بڑھا' زلفیں بڑھیں' کاکل بڑھے' گیسو بڑھے یعنی اشاعتیں بڑھیں۔ صفحے بڑھے' اشتہارات بڑھے' کالم بڑھے اور کالم نگار بڑھے۔ یہ عورتوں کا صفحہ ہے جس میں کشیدہ کاری اور مہاسے دور کرنے سے لے کر ہنڈیا بھوننے تک کا طریقہ بتایا جاتا ہے۔ یہ فلمی صفحہ ہے' گلے میں بب باندھ کر تصویریں دیکھیے اور رال ٹپکایئے۔ یہ علمی صفحہ ہے' یہ صحت کا صفحہ ہے۔ جسے ڈاکٹر' حکیم' ایلوپیتھ اپنی اپنی باری پر تختہ مشق بناتے تھے اور یہ طالب علموں کا صفحہ ہے۔ بازیچہ اطفال کہہ لیجیے۔ ہمارے زمانے میں طالب علم پہلے تختی لکھا کرتے تھے۔ اسے گاچنی سے لیپ کر پھر لکھا کرتے تھے۔ پھر چار سطر لائنوں پر لکھنے کا نمبر آتا تھا پھر رولدار کاپی اور جواب مضمونوں کی مشق وغیرہ لیکن اب اخباروں کی ریل پیل کے ساتھ یہ ہوا کہ جسے چار لائنوں والی کاپی پر لکھنا چاہیے' وہ بھی اخبار میں لکھ رہا ہے یا لکھ رہی ہے اور جسے تختہ پر گاچنی پھیر کر مشق کرنی چاہیے' اس کے مضامین اور نام بھی پکی سیاہی سے زیور طبع سے آراستہ ہو رہے ہیں۔ جب ہم اخبار میں نوکر ہوئے تو اس زمانے میں اخبار لیتھو میں چھپتے تھے۔ تصویروں کا رواج نہ تھا' کبھی کبھی ضرورت ہوتی تو چربہ لگا دیتے تھے۔ یہ چربے کی عادت فلم والوں نے اخبار والوں ہی سے لی ہے اس میں دیکھنے والا تصویر کے نیچے نام پڑھ کر مطمئن ہو جاتا تھا کہ ہاں فلاں صاحب کی تصویر ہے یا ہوگی۔ ایک بار ہمیں سرسید احمد خان کی تصویر چھاپنی تھی۔ وہ تو نہ ملی ہاں چرچل کی تصویر کا چربہ مل گیا۔ وہی لگا دیا.... آج تک تو کسی کو معلوم نہیں ہو سکا۔ آج پہلی بار اپنی زبانی بتا رہے ہیں۔

ہاں آفسٹ پر چھپنے کے بعد تصویریں چھاپنا آسان ہو گیا تو تصویر کو مقدم اور تحریر کو

موخر رکھنے لگے کہیں کوئی جرم ہوتا تھا بلکہ ہوتا ہے کہنا چاہیے کیونکہ آج کل بھی یہی کیفیت ہے تو نہ صرف مجرم اور قتل یا اغوا ہونے والے کی تصویر چھپتی ہے بلکہ ان کے پھوپھی زاد بھائیوں کی' محلے والوں کی ان کو پکڑنے والے کانسٹیبل کی' اس شیر فروش کی جو محلے کے نکڑ پر رہتا ہے بلکہ تصویر کے نیچے ہم نے لکھا دیکھا' محمد بخش ٹین ساز جو واردات کے روز ڈیرہ غازی خان گیا ہوا تھا اور جس کو واردات کے بارے میں کچھ معلوم نہیں۔ ہنڈیا بھوننے والوں اور اچار کے نسخے بتانے والوں کی تصویریں تو بالالتزام اور اکثر اوقات رنگین چھپنے لگیں۔ ایک بار ایک صاحبہ نے انڈے تلنے کی ترکیب بھیجی۔ ایڈیٹر نے واپس ڈاک سے لکھا کہ اپنی تصویر بھی بھیجیں کیونکہ ہم تصویر کے بغیر کچھ نہیں چھاپتے۔ اس طرح وہ ساحل سمندر پر گئیں اور غرارہ پہن کر اور پورے سولہ سترہ سنگھار کرکے اور جڑاؤ زیور پہن کر تصویر کھنچوائی اور وہ آب و تاب کے ساتھ اخبار کے آدھے صفحے پر چھپی نیچے لکھا تھا۔ انڈے تلنے کی مشہور ماہر۔ رشیدہ فاطمہ۔

انگریزی کے مشہور مصنف سوفٹ (Swift) کی تعریف میں لکھنے والوں نے لکھا ہے کہ وہ جھاڑو کے تنکے پر بھی مضمون لکھ سکتا تھا۔ ہمارے خیال میں یہ کوئی ایسا کمال نہیں۔ ہم لوگ لکھنے کے لیے جھاڑو کے تنکے کے بھی محتاج نہیں۔ ہاں جھاڑو کا تنکا ہمارا محتاج ہو تو ہو۔ وضاحت اس کی یوں ہے کہ اگر ہم مضمون نہ لکھیں اور لوگ اسے پھاڑ پھاڑ کر نہ پھینکیں تو جھاڑو کو کوئی نہ پوچھے۔ اس کا کوئی مصرف نہ رہے۔

(بقلم خود۔ روزنامہ امروز لاہور ۱۷۔۶۔۶)

☆☆☆

پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے

آج کل شہر میں جسے دیکھو' پوچھتا پھر رہا ہے کہ غالب کون ہے؟ اس کی ولدیت' سکونت اور پیشے کے متعلق تفتیش ہو رہی ہے۔ ہم نے بھی اپنی سی جستجو کی۔ ٹیلی فون ڈائریکٹری کو کھولا۔ اس میں غالب آرٹ اسٹوڈیو تو تھا لیکن یہ لوگ مہ رخوں کے لیے مصوری سیکھنے اور سکھانے والے نکلے۔ ایک صاحب غالب مصطفیٰ ہیں جن کے نام کے ساتھ ڈپٹی ڈائریکٹر فوڈ لکھا ہے۔ انہیں آٹے دال کے بھاؤ اور دوسرے مسائل سے کہاں فرصت ہوگی کہ شعر کہیں' غالب نور اللہ خاں کا نام بھی ڈائریکٹری میں ہے لیکن ہمارے موکل کا نام تو اسد اللہ خاں تھا جیسا کہ خود فرمایا ہے۔

اسد اللہ خاں تمام ہوا ☆ اے دریغا وہ رندِ شاہد باز

بے شک بعض لوگ اس شعر کو غالب کا نہیں گنتے۔ ایک بزرگ کے نزدیک یہ اسد اللہ خاں تمام کوئی دوسرے شاعر تھے۔ ایک اور محقق نے اسے غالب کے ایک گمنام شاگرد دریغا دہلوی سے منسوب کیا ہے لیکن ہمیں یہ دیوان غالب ہی میں ملا ہے۔ ٹیلی فون ڈائریکٹری بند کرکے ہم نے تھانے والوں کو فون کرنے شروع کیے کہ اس قسم کا کوئی شخص تمہارے روزنامچے یا حوالات میں ہو تو مطلع فرماؤ کیونکہ اتنا ہم نے سن رکھا ہے

کہ کچھ مرزا صاحب کو اک گونہ بیخودی کے ذرائع شراب اور جوئے وغیرہ سے دلچسپی تھی اور کچھ کوتوال ان کا دشمن تھا۔ بہرحال پولیس والوں نے بھی کان پر ہاتھ رکھا کہ ہم آشنا نہیں، نہ ملزموں میں ان کا نام ہے نہ مفروروں میں، نہ ڈیفنس رولز کے نظر بندوں میں، نہ اخلاقی قیدیوں میں، نہ تین میں نہ تیرہ میں۔

مرزا ظفرالحسن ہمارے دوست نے مرزا رسوا کو رسوائی کے مقدمے سے بری کرانے کے بعد اب مرزا غالب کی یاد کا بیڑا اٹھایا ہے۔

مرزا کو مرزا مِلے کرکر لمبے ہاتھ

پچھلے دنوں انہوں نے ایک ہوٹل میں ادارہ یادگارِ غالب کا جلسہ کیا تو ہم بھی کچے دھاگے میں بندھے پہنچ گئے۔ ظفرالحسن صاحب کی تعارفی تقریر کے بعد صہبا لکھنوی نے تھوڑا اساتندی صہبا سے موضوع کے آبگینے کو پگھلایا۔

اس کے بعد لوگوں نے مرزا جمیل الدین عالؔی سے اصرار کیا کہ کچھ تو کہیے کہ لوگ کہتے ہیں۔ وہ نہ نہ کرتے رہے کہ ہے ادب شرطِ منہ نہ کھلواؤ لیکن پھر تابِ سخن نہ کر سکے اور منہ سے گھنگنیاں نکال کر گویا ہوئے۔ غالبؔ ہرچند کہ اس بندے کے عزیزوں میں تھا لیکن اچھا شاعر تھا۔ لوگ تو اسے اردو کا سب سے اونچا شاعر کہتے ہیں۔ مرزا ظفر الحسن قابل مبارک باد ہیں کہ اس کے نام پر منظوم جلسہ یعنی بیت بازی کا مقابلہ کرا رہے ہیں اور اسے کسوٹی پر بھی پرکھ رہے ہیں لیکن اس عظیم شاعر کی شایانِ شان دھوم دھامی صد سالہ برسی کے لیے ہندوستان میں لاکھوں روپے کے صرف کا اہتمام دیکھتے ہوئے ہم بھی ایک بڑے آدمی کے پاس پہنچے کہ خزانے کے سانپ ہیں اور ان سے کہا کہ گلُ پھینکے ہے اوروں کی طرف بلکہ ثمر بھی۔ کچھ غالبِؔ نام آور کے لیے بھی ہونا چاہیے ورنہ!

طعنہ دیں گے بُت کہ غالب کا خدا کوئی نہیں ہے

ان صاحب نے کہا۔ ''آپ غالب کا ڈومی سائل سرٹیفیکٹ لائے؟''

یہ بولے ''نہیں۔''

فرمایا۔ ''پھر کس بات کے روپے مانگتے ہو؟ وہ تو کہیں آگرے، دلی میں پیدا ہوا، وہیں مرکھپ گیا۔ پاکستان میں شاعروں کا کال ہے۔''

عالی صاحب نے کہا۔ ''اچھا پھر کسی پاکستانی شاعر کا نام ہی بتا دیجیے کہ غالبؔ کا سا ہو۔''

بولے۔ ''میں زبانی تھوڑا ہی یاد رکھتا ہوں۔ شاعروں کے نام، اچھا اب لمبے ہو جایئے، مجھے بجٹ بنانا ہے۔''

☆☆

خیر ہندوستان کے شاعر تو ہندوستانیوں ہی کو مبارک ہوں خواہ وہ میرؔ ہوں یا انیس ہوں یا امیر خسرو ساکن پٹیالی واقع یوپی لیکن غالب کے متعلق ایک اطلاع حال میں ہمیں مِلی ہے جس کی روشنی میں ان سے تھوڑی رعایت برتی جا سکتی ہے۔ ہفت روزہ قندیل لاہور کے تماشائی نے ریڈیو پاکستان لاہور سے ایک اعلان سنا کہ اب اردن کے مشہور شاعر غالب کا کلام سُنیے۔ یہ بھی تھا کہ ''اردن کو مرزا غالبؔ پر ہمیشہ ناز رہے گا۔'' تو گویا یہ ہمارے دوست ملک اُردن کے رہنے والے تھے۔ تبھی ہم کہیں کہ ان کا ابتدائی کلام ہماری سمجھ میں کیوں نہیں آتا اور عربی فارسی سے اتنا بھرپور کیوں ہے اور کسی رعایت سے نہیں تو اقربا پروری کے تحت ہی ہمیں یومِ غالب کے لیے روپے کا بندوبست کرنا چاہیے کہ اُردن سے ہماری حال ہی میں رشتے داری بھی ہو گئی ہے۔ لیکن یاد رہے کہ صد سالہ برسی فروری میں ہے۔ فردوسی کی طرح نہ ہو کہ اُدھر اُس کا جنازہ نکل رہا تھا۔ ہاتھ خالی کفن سے باہر تھا اور اُدھر خدامِ ادب اشرفیوں کے توڑوں کا ریڑھا دھکیلتے غزنی کے دروازے میں داخل ہو رہے تھے۔

☆☆

عالی صاحب کا اشارہ تو خدا جانے کس کی طرف تھا۔ کسی سیٹھ کی طرف یا کسی اہل کار کی طرف۔ لیکن مرزا ظفر الحسن صاحب نے دوسرے روز بیان چھپوا دیا کہ ہم نے حکومت سے کچھ نہیں مانگا نہ اس کی شکایت کرتے ہیں، جو دے اس کا بھلا جو نہ دے اس کا بھی بھلا۔ یہ شکوہ شکایت ادارہ یادگارِ غالب کے حساب میں نہیں، مرزا جمیل الدین عالی کے حساب میں لکھا جائے، ہم تو پنسلیں بیچ کر یومِ غالب منائیں گے۔"

ہم نے پہلے یہ خبر پڑھی تو "پنسلین" سمجھے اور خیال کیا کہ کہیں سے مرزا صاحب کو "پنسلین" کے ٹیکوں کا ذخیرہ ہاتھ آ گیا ہے۔ بعد ازاں پتا چلا کہ نہیں۔ وہ پنسلیں مراد ہیں جن سے ہم پاجاموں میں ازار بند ڈالتے ہیں اور سگھڑ بیبیاں دھوبی کا حساب لکھتی ہیں۔ خیر مرزا ظفر الحسن صاحب کا جذبہ قابلِ تعریف ہے لیکن دو مرزاؤں میں تیسرے مرزا کو حرام ہوتے ہم نہیں دیکھ سکتے۔ حکومت سے غالب یا کسی اور شاعر کے نام پر کچھ مانگنا یا شکوہ کرنا کوئی جرم تو نہیں، آخر یہ کسی راجے یا نواب کی شخصی حکومت تھوڑا ہی ہے۔ خزانہ عامرہ کا پیسہ ہمارے ہی ٹیکسوں کا پیسہ ہے۔ اب یہ تو ٹھیک ہے کہ انجمن ترقی اردو والے یا ڈاکٹر حمید احمد خان اس موقع پر کچھ کتابیں چھاپ رہے ہیں اور مرزا ظفر الحسن صاحب منظوم جلسے کا اہتمام کر رہے ہیں یا غالب کو کسوٹی پر پرکھ رہے ہیں۔ لیکن یہ تو کچھ بھی نہیں۔ چار کتابوں کا چھپنا اور منظوم جلسے میں ہم ایسے شاعروں کا غالب کی زمینوں میں ہل چلانا حق سے ادا ہونا تو نہ ہوا۔ وہ مرحوم تو بڑی اونچی نفیس طبیعت کے مالک تھے۔

منزل اِک بلندی پر اور ہم بنا لیتے
عرش سے پرے ہوتا کاش کہ مکان اپنا

اخبار جہاں۔ باتیں انشا جی کی (۶۹-۱-۱۵)

☆☆☆

اِس لیے تصویرِ جاناں ہم نے کھنچوائی نہیں

ایک زمانہ تھا کہ لوگ مضمون کے ساتھ تصویر تو بڑی چیز ہے نام تک نہ دیا کرتے تھے بلکہ سندباد جہازی وغیرہ لکھ کر کام چلاتے تھے۔ مرحوم مولانا عبدالمجید سالک کو تو قلمی نام دینا بھی پسند نہ تھا۔ ہم نے انؒ کے مشہور و مقبول کالم "افکار و حوادث" پر کبھی ان کا نام نہیں دیکھا۔ ہاں۔ پڑھنے والے جانتے تھے۔ یعنی شدہ شدہ جاننے لگے تھے اور چونکہ ان دِنوں پیری مریدی کا رواج تک ایسا تھا کہ شاعروں میں استادی شاگردی جاں نشینی وغیرہ کے مسائل پر سر پھٹول ہو جاتی تھی۔ لہٰذا لوگوں نے پیرِ افکار کا نام دے رکھا تھا۔ لوگ دعا کراتے تھے تعویذ مانگتے تھے۔

اور پھر آفسٹ کی چھپائی کی برکت سے تصویر کا رواج نکلا۔ اب مضمون ہو نہ ہو تصویر ہونا ضروری ہے۔ ایک روز تو ہم نے ایک صاحب کی تصویر چھپی دیکھی جس کے ساتھ فقط ایک معذرتی نوٹ تھا کہ آج حضرت حمام شکر قندی اپنی علالت کی وجہ سے کالم نہیں لکھ سکے۔ اب یہ ہونے لگا کہ کالم نگار یا مضمون نگار اپنی تصویر دے کر بھول جانے لگے۔ جو مونچھوں والا تھا وہ داڑھی والا ہو گیا اور جو داڑھی والا تھا اس نے چار ابرو کا صفایا کرا دیا۔

لیکن تصویر وہی رہی کہ جو تھی۔ ہمارے دوست انتظار حسین نئی تصویر کھنچوانا شرعاً ممنوع تو نہیں مکروہ ضرور سمجھتے ہیں۔ اس لیے مدتوں ان کی ایک ہی تصویر چلتی رہی۔ انہی دِنوں ہمارے مہربان اور مخدوم' م۔ش نے داڑھی رکھی اور چونکہ اپ ٹو ڈیٹ آدمی ہیں۔ تصویر بھی اپنے کالم پر داڑھی والی دی۔ اس قلب ماہیت کا پتا نہ تھا اس لیے شکایتاً لکھ گئے کہ عجب ماجرا ہے۔ انتظار حسین اپنے کالم پر اپنے بیٹے کی تصویر چھاپے جا رہے ہیں اور م۔ش صاحب اپنے والد کی تصویر لگا دیتے ہیں۔ بعد میں ہم یہ جان کر شرمندہ ہوئے کہ دونوں اپنی اپنی تصویریں لگا رہے تھے۔ قصور فہم ہمارا تھا۔ بعد میں پھر سنا کہ م۔ش نے داڑھی منڈوالی اور انتظار حسین نے رکھ لی۔ لیکن تصدیق نہ ہوسکی۔

ہم نے جب کراچی کے ایک اخبار میں وقتاً فوقتاً لکھنا شروع کیا تو ہم سے تصویر کا تقاضا ہوا۔ تصویر تو بڑی چیز ہے ہم نے نام کی بھی بڑی مشکل سے اجازت دی۔ لیکن خیر اس چیز کے زیر اثر جسے پبلک کا پرزور اصرار کہتے ہیں' لیکن اصل میں پبلک سے شخص مذکور کا اصرار ہوتا ہے۔ تصویر پر بھی راضی ہو گئے اور پھر ایسے راضی ہوئے کہ بس۔ لیکن وہ الگ قصہ ہے۔

کراچی کا وہ اخبار بند ہو چکا ہے۔ لوگ اس کے بند ہونے کی وجوہ میں ہمارا نام بھی لیتے ہیں۔ لیکن یہ بات نہیں۔ بے شک اشاعت اس کی ہمارے کالم کے زمانے ہی میں گر گئی تھی۔ اور دن دونی رات چوگنی گھٹ رہی تھی۔ لیکن اس میں علت و معلول کا رشتہ تلاش نہ کرنا چاہیے۔ یہ بات اپنی جگہ ہے کہ اخبار مذکور (انجام) ہمارے لکھنا چھوڑنے کے بعد بند ہوا تھا۔ جس میں ہم زور و شور اور ذوق وشوق سے لکھا کرتے تھے' وہ امروز کراچی تھا لیکن اس کے بند ہونے کی وجوہ بھی دوسری تھیں۔ ہمارا ان دنوں اس کا مضمون نگار ہونا امر اتفاقی تھا۔ ہمیں اپنی تحریر کے متعلق کبھی یہ خوش گمانی نہیں ہوئی کہ وہ اتنی موثر ہے آخر اور پرچے جن میں ہم لکھتے ہیں چل ہی رہے ہیں۔

ہاں تو ذکر انجام میں لکھنے اور تصویر چھپوانے کا تھا جس کے انجام کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے۔ فوری فائدہ اس کا یہ ہوا کہ اگلے مہینے جو مالک مکان کرایہ مانگنے آیا تو اس کا لہجہ بہت شریفانہ تھا بلکہ اس نے یہ کہا کہ اس مکان کو آپ اپنا ہی مکان تصور فرمایئے ہاں کرایہ ماہ بہ ماہ پابندی سے دیتے رہیے اور یہ میرے بیٹے کے ولیمے کی تصویر چھپوا دیجیے۔ علاقے کے بی۔ ڈی ممبر نے بھی اس جمعرات کو محتاجوں' مسکینوں میں تقسیم کرنے کے لیے ختم دلایا۔ اس میں سے زردے کی لبالب بھری ہوئی ایک پلیٹ ہمارے لیے بھیجی۔ ان دنوں بی ڈی کے الیکشن پھر ہونے والے تھے لہذا پلیٹ کے ساتھ یہ رقعہ بھی شامل تھا کہ اگر آپ آئندہ بھی مجھے قوم کی بے لوث خدمت کرنے کا موقع دلانے میں مدد کریں تو بے دام غلام رہوں گا بلکہ آپ کے اخبار کے لیے خریدار بھی فراہم کروں گا۔ اگر لوگ برضا ورغبت خریداری بھی قبول نہ کریں گے تو دیگر ذرائع بھی استعمال کرنے میں عار نہ ہوگا۔ ایک پڑوسی نے اپنے لڑکے کو بھیجا کہ پوچھ کے آؤ مسئلہ کشمیر کا اب کیا ہوگا۔ ایک صاحب نے اپنا سلیمانی منجن اخبار میں ریویو کے لیے ہمارے پاس بھیج دیا جس کے مسلسل استعمال کے بعد دانت نکلوانے کے لیے کسی دندان ساز کے پاس جانے کی ضرورت نہیں رہتی۔ مضبوط سے مضبوط دانت بلا تکلیف اور زنبور کے خود ہی نکل جاتے ہیں۔ پھر ایک بزرگ نے اپنی چھڑی سے پھاٹک پر آ' دستک دی اور کہا کہ یہ جو کوڑے کا ڈرم گلی کے موڑ پر پڑا ہے بہت بو دیتا ہے اسے اُٹھوایئے۔ ہم نے کہا۔ قبلہ یہ ہم نے نہیں رکھا۔ نہ اس کی صفائی کی میونسپلٹی کی طرف سے ہمیں تنخواہ ملتی ہے۔ جمعدار جھنڈا مسیح سے کہیے۔ بولے۔ میں کیوں کہوں۔ آپ اخبار والے ہیں آپ کارپوریشن کے چیئرمین سے کہیے وہ ہیلتھ آفیسر سے کہے گا۔ ہیلتھ آفیسر داروغہ سے کہے گا اور داروغہ جمعدار جھنڈا مسیح سے کہیں گے۔ آخر ہر کام کا ایک طریقہ ہوتا ہے۔ ہمارے ملک میں یہی طریقہ ہے۔ ہم نے وہ کوڑے کا ڈرم تو

اٹھوادیا لیکن پھر جمعدار لوگ سارے محلے کا کوڑا ہمارے دروازے پر لا کر ڈالتے تھے۔ اور تادم تحریر یہی کیفیت رہی۔

ایک روز تو ایک وفد بھی ہم سے ملنے آیا کہ انشاء صاحب آپ ہی ہیں جن کی یہ تصویر چھپی ہے۔ ہم نے کہا من آنم کہ من دانم لیکن فرمائیے۔ بولے ہم رکشا والے ہیں اور یہ ہمارا مطالبہ ہے جسے آپ نے اپنے اخبار میں نہ چھاپا تو کوئی رکشا والا آپ کو نہیں بٹھائے گا۔ مختصر یہ تھا کہ پولیس جو آئے دن ہمارے میٹر چیک کرتی ہے یہ ہمارے شہری حقوق پر حملہ ہے۔ اس کا مداوا فقط یوں ہوسکتا ہے کہ بھارت کی طرح ہمارے ہاں بھی ایک رکشا وزیر ہو۔ ہم نے کہا ہمیں معلوم نہیں۔ وہاں ایسا کوئی وزیر ہے۔ اس پر وفد کے سربراہ نے ہمیں اخبار دکھایا جس میں ایک تصویر تھی اور تصویر کے نیچے لکھا تھا۔ شری چاون۔ رکشا منتری بھارت'' ہم نے بہت ٹالنے کی کوشش کی یہاں رکشا کا مطلب موٹر رکشا نہیں بلکہ دفاع ہے لیکن وفد کو قائل نہ کر سکے۔ ان کی دلیل بھی محکم تھی اور وہ یہ کہ دفاع کا سوال وہاں پیدا ہوتا ہے جہاں باہر سے کوئی حملہ ہو یا حملے کا امکان ہو۔ بھارت کو تو ہمیشہ کسی پر خود حملہ کرنا ہوتا ہے خواہ وہ گوا ہو یا چین ہو۔ حیدرآباد ہو کہ جوناگڑھ ہو۔ لہٰذا چاون جی وزیر دفاع نہیں ہوں گے۔ ضرور وزیر امور موٹر رکشا ہوں گے۔ وفد کے سربراہ نے یہ بھی واضح کر دیا کہ اس کام کے لیے ملک میں موزوں آدمیوں کی کمی نہیں انہوں نے اپنی مثال بھی پیش کی۔

یہ تو بات خوامخواہ لمبی ہوگئی۔ کہنا یہ ہے کہ اپنی تصویر دینے سے ہم معذرت چاہتے ہیں۔ صرف اپنی تصویر کی بات نہیں کر رہے ہم تو ڈائجسٹوں پر چھپنے والی ایسی تمام تصویروں کے خلاف ہیں جن کو دیکھ کر بچے چپ بیٹھے ہوں تو رونے لگتے ہیں اور رو رہے ہوں تو چپ ہو جاتے ہیں۔

روزنامہ امروز.... بقلم خود (۱۷-۱۰-۲۴)

☆☆☆

اَب ہَماری قُربانی شرعاً جائز نہیں رہی

ہمارا ایک دانت تھا جس پر ملک بھر کے ڈاکٹروں کے ایک مدت سے دانت تھے، اسے ہم ان لوگوں کی دست برد سے دس سال تک تو بچاتے رہے لیکن آخر جاں بحق ہوا، اِنا للہ وانا الیہ راجعون۔ اس سے ہمارے حُسن خداداد میں تو چنداں فرق نہیں پڑا۔ کیونکہ یہ دکھانے کا دانت نہ تھا۔ کھانے کا تھا، یعنی بہت پیچھے کی ایک داڑھ۔ تاہم اس کی مفارقت کا افسوس ضرور ہوا۔

ہمارے اس داڑھ کے نکلوانے میں ہچر مچر کی ایک وجہ یہ بھی تھی، کہ ایک دوست نے کہا تھا کہ یہ عقل داڑھ ہے' اگرچہ اس کے ہونے سے عملاً کچھ فائدہ کبھی نہیں پہنچا۔ لیکن اس کے نکلوانے سے تو بھرم بھی جاتا رہے گا۔ ہمارے ایک ماہر ڈاکٹر نے یہ شک رفع کیا اور کہا کہ یہ عقل داڑھ نہیں اور اس کے نکلنے کی تمہارے نظامِ جسمانی میں گنجائش بھی نہیں۔ اب رہا علاج۔ اس کے لیے ایک وٹرنری ہسپتال تو ہم بے شک نہیں گئے حالانکہ بعض مہربانوں نے اس کا مشورہ بھی دیا تھا اور اس کے ڈاکٹر کی شہرت بھی سُنی تھی۔ ہاں کوئی اور معالج ہم نے نہیں چھوڑا۔ ''بنا کر مریضوں کا ہم بھیس غالب نکلتے تھے۔'' تو سائیں چنن دین سنیاسی سے لے کر پروفیسر اے آر (اللہ رکھا) چشتی عاملِ کامل اور عزرائیل الاطبا حکیم فضل مولیٰ تک کے درِ دولت پر جادستک دیتے تھے۔

فقیری منجن بھی استعمال کیا۔ ایک پیر صاحب نے کچھ پڑھ کر معمولی ہدیہ لے کر ایک مسواک بھی ہمیں دی، اور ایک بزرگ نے تو تعویذ بھی باندھنے کو دیا اور کالا مرغا بھی ہم سے چوراہے میں چُھڑا دیا۔ لیکن درد نے برابر ترقی ہی کی۔ عشرہ ترقیات منا کر دم لیا۔ بعض لوگوں نے چینی دندان سازوں سے رجوع کرنے کا مشورہ بھی دیا تھا۔ چین سے ہماری ہمدردیاں ڈھکی چھپی نہیں لیکن خطرہ یہ تھا کہ ان میں کوئی کومن تانگ کا ہمدرد نکلا تو پورا جبڑا نکال لے گا۔ یہ احتیاط مقامی لوگوں کے باب میں بھی ضروری معلوم ہوئی۔ کیونکہ خود ہمارے ملک میں بعض سیاسی جماعتیں کومن تانگ سے رشتہ رکھتی ہیں۔ بلکہ سوشلزم اور ماؤزے تنگ کے نام پر چیانگ کائی شیک سے بھی زیادہ بدکتی ہیں۔ دانت نکلواتے وقت دیکھ لینا چاہیے کہ ڈاکٹر کا کس جماعت سے تعلق ہے۔

☆☆☆

ہمارے ملک میں بے ڈگری کے ڈاکٹروں کی کمی نہیں۔ سبزے کی طرح انہیں کہیں جگہ نہ ملی تو فٹ پاتھوں پر ہی کائی بن کر جم گئے ہیں۔ بعض تو ان میں سے ایسے باکمال ہیں کہ منہ میں (مریض کے منہ میں) انگلی ڈال کر انجکشن دیے بغیر دانت نکال لیتے ہیں اور اس میں اس کی تخصیص نہیں کہ دانت بیمار تھا یا تندرست۔ ہمارے ایک دوست نے ایک بار ایسے ہی ایک ڈاکٹر سے نکلوایا تھا۔ اس نے زنبور ڈالا اور دانت نکال کر ہمارے دوست کے ہاتھ میں دے دیا۔ دانت ہی نہیں اس کا چھلا اور پلیٹ بھی۔ یہ وہ مصنوعی دانت تھا جو بیمار دانت کے پڑوس میں واقع تھا، سچ ہے "صحبت طالح ترا طالح کند۔" ہمارے دوست نے احتجاج کیا تو وہ ڈاکٹر صاحب بتیسی نکال کر بولے۔ "اسے بھی بدلوا لیجیے۔ آج کل مصنوعی دانتوں میں بھی کیڑا لگ جاتا ہے۔"

☆☆☆

بارے پھر پھرا کر دنیا بھر کے چکّر لگا کر ہم اپنے دوست ڈاکٹر طیّب محمود کے پاس

آئے کہ اے طبیب جملہ علتہائے ما۔ اس بدذات کو نکال۔ اب انہوں نے پس وپیش کی۔ ہم نے کہا آج کل لوگوں کے دل اور گُردے بدلے جا رہے ہیں، آپ اسے نکال کر کسی بکری کا دانت ڈال دیجیے تو مانوں۔ لیکن وہ راضی نہ ہوئے اور بولے۔ دانتوں کی سائنس نے ابھی اتنی ترقی نہیں کی، اور جب انہوں نے ہمارا دانت نکالنے کی ہامی بھر لی تو ہم پر رقت طاری ہو گئی اور ہم نے دیوانی مقدموں کی طرح تاریخیں ڈالنی شروع کیں۔ ذرا یہ ملک کے حالات تو ٹھیک ہو لیں۔ بالغ حق رائے دہندگی کا مطالبہ منظور ہو لے۔ ایمرجنسی ختم ہو۔ طالب علم رہنما چھوٹیں تو بے شک نکال دیجیے گا۔ آخر ایک روز انہوں نے کہا۔ ایمرجنسی ختم ہوئی۔ باقی مطالبات بھی پورے ہونے والے ہیں۔ اب میرا مطالبہ یہ ہے، کہ اس داڑھ کو نکلوا دیجیے۔ اس پر ہم نے کہا آج نہیں۔ آج تو بارش کے سے آثار ہیں اور ایسے عالم میں دانت نکلوانا اچھا نہیں ہوتا۔ یوں بھی منگل کا دن ہے۔ اس پر وہ بولے، اچھا صفائی کر دوں، اور پھر واقعی انہوں نے صفائی کر دی۔ داڑھ نکال کر ہمارے ہاتھ میں دے دی۔ کانوں کان بلکہ دانتوں دانت خبر نہ ہونے دی۔

☆☆☆

اب وہ دن گئے جب لوگ ہم سے کہا کرتے تھے کہ۔ دندانِ تو جملہ در دہانند۔ لوگ ہنستے میں بتیسی نکالتے ہیں۔ ہم اکتیسی نکال کر ہنسا کریں گے۔ عاقبت کا بھی خیال آتا ہے، جس کے باب میں ایک پرانے شاعر نے لکھا ہے کہ سوال و جواب ہوں گے۔

جہاں سے عاقبت کے واسطے توشہ لیا کیا ہے؟
بتا کے دانت ہیں منہ میں تیرے، کھایا پیا کیا ہے؟

باقی حساب تو ہم دے لیں گے، لیکن دانتوں کے معاملے میں دانتا کِل کِل ضرور ہوگی، ویسے ہر چیز کا ایک روشن پہلو بھی ہوتا ہے۔ ہم سے مختلف اوقات میں مطالبہ کیا

جاتا رہا ہے کہ ملک پر جان قربان کر دو۔قوم کے سر چڑھ کر مر جاؤ، یا سر کو کسی محبوب کے زیرِ پائے رکھ کر اللہ اکبر اذان دو کہ اردو شاعری میں محبوب عموماً قصاب کے معنوں ہی میں آتا ہے۔لیکن ہم مصروفیت یا کسی ناگزیر وجہ کا بہانا بنا کر طرح دیتے رہے، اب ہم سیدھے سیدھے چھاتی نکال کر کہہ سکتے ہیں کہ کیسی قربانی اور کہاں کی قربانی۔ ہماری تو قربانی ہی شرعاً جائز نہیں۔ ہمارا تو ایک دانت ٹوٹا ہوا ہے۔ احتیاطاً ہم فتاوائے عالمگیری کی ایک جلد بھی ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتے ہیں، خصوصاً بقرعید کے دنوں میں۔

☆☆☆

منّو بھائی

مائی ڈیئر منّو بھائی! یار تمہارا نام بڑا گڑ بڑ ہے۔اس کے ساتھ القاب و آداب لکھنے میں بڑی الجھن ہوتی ہے۔اگر برادرم منّو بھائی لکھیں یا میرے بھائی منّو بھائی تو تکرار لفظی ہے اور تم جانتے ہو' حشو و زوائد کچھ اچھی چیز نہیں ہیں۔خدا جانے تم نے اندرونِ خانہ اس مشکل کا حل کیا نکالا ہوگا اور وہ عفیفہ کہ ہماری بھابھی ہیں' تمہارے بھائی پن سے کیسے نکلتی ہوں گی۔تمہارے اس نام سے بلانے سے تو اُن کے لیے کئی فقہی مسئلے پیدا ہو سکتے ہیں۔

☆☆☆

ایک زمانے میں ہم تم کو منّو موٹروں والے سمجھا کرتے تھے کہ اس قوم کا ایک آدمی موٹر کے بجائے ادب کے اسٹیئرنگ پر آ بیٹھا ہے۔شاعری کلچ دبا رہا ہے اور صحافت کو دھکّا دے رہا ہے۔ بھائی بھی گجراتی دولت مندوں کے نام کا لاحقہ ہے۔ روپیہ بھائی پیسہ بھائی، کھوٹا بھائی، کھرا بھائی۔ چھوٹا بھائی' بڑا بھائی۔ یہ بھائی وہ بھائی۔ یہاں کراچی میں جتنے اس قسم کے بھائی ہیں کروڑ پتی ہیں۔ہم غریب غربا تو ان کو بھائی سمجھتے ہیں اور کہتے بھی ہیں، کہنے پر مجبور بھی ہیں، اُن پر کوئی پابندی نہیں کہ ہمیں بھائی سمجھیں یا بھائی کہہ کر بُلائیں۔

☆☆☆

ایک بھائی اور ہوتے ہیں' جیسے بھائی چھیلا پٹیالے والا، یا منّو بھائی امروز والا۔ ایک بھائی سکھوں کے ہوتے ہیں بلکہ وہاں بھائی سے وہی مطلب لیا جاتا ہے جو ہمارے ہاں مولوی یا مولانا سے لیا جاتا ہے۔ ہم نہیں کہتے تم میں سکھوں والی کوئی بات ہے وہ لوگ تو بڑی خوبیوں کے ہوتے ہیں۔

ع جہاں پر گئے داستان چھوڑ آئے

تاہم نام کی تاثیر ہوتی ہے۔ باپ پہ پوت اور پتا پر گھوڑا کی طرح۔ بہت نہیں تو تھوڑا تھوڑا' چونکہ ہمارے ہاں اکہری اور دوچشمی ہائے میں بھی لکھنے میں کوئی امتیاز نہیں برتا جاتا۔ لوگ آنکھوں کو آنکھوں' چہرہ کو چھرا اور اس کے برعکس ہاتھی کو ہاتہی اور جھاڑو کو جہاڑو لکھ دیتے ہیں' اس لیے بعض لوگ سمجھتے ہیں' تمہارا تعلق بہائی فرقے سے ہے کیونکہ تم جیسا اچھا لکھنے والے اس مُلک میں کم ہیں۔ یعنی تم ایک طرح کی اقلیت ہو' اس لیے اس فرقے کی طرح لوگوں کا دھیان جانا قدرتی ہے۔ دوچشمی ھ اور دوسری ہ میں جسے نہ جانے کیا کہتے ہیں، خود ہمیں دھوکا ہوا۔ پچھلے دنوں مسعود مفتی کی کتاب دیکھی 'چھرے' چونکہ مضمون اس کا مشرقی پاکستان کے آخری ایّام ہے لہٰذا ہم اسے چُھرے ہی سمجھے۔ برادرانِ ملّت کے چھرے۔ اندر پڑھا تو معلوم ہوا مُراد ہے ''چہرے''۔ اس سلسلے میں ایک شعر بھی سُناؤں، ڈرو نہیں، میرا نہیں، کسی اُستاد کا ہے۔

ے ہائے یہ حسرتِ دیدار مری ہائے کو بھی
ہائے دوچشمی سے لکھتے ہیں کتابیں والے

☆☆☆

ہمارے ایک دوست ہیں یوسف صدیقی۔ ہم کبھی رواداری میں ان کے نام کے رقعے میں یوسف بھائی لکھ جائیں تو کاٹنا پڑتا ہے' جس کی وجہ ظاہر ہے کہ اگر یوسف

ہمارے بھائی ہوئے تو ہم یوسف کے بھائی ہوئے اور برادرانِ یوسف میں اپنا شمار کرانا کون پسند کرے گا۔ شاید تم نے بھی اپنا نام اس زمانے میں رکھا ہوگا جب ابھی حالی کا یہ شعر تمہاری نظر سے نہیں گزرا تھا۔

ے آرہی ہے چاہ یوسف سے صدا
دوست یاں ملتے ہیں کم، بھائی بہت

البتہ میں نہیں کہوں گا کہ اب تم نام کو بدل لو۔ تم اس نام سے مشہور ہو چکے ہو۔ ایک مشہور ادیب کسی محفل میں کہہ رہے تھے کہ پندرہ سال تک لکھنے کے بعد مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ میں کبھی ادیب نہیں بن سکتا۔ ایک شخص نے کہا۔ ''تو پھر آپ نے لکھنا چھوڑ دیا ہوتا۔'' موصوف نے فرمایا۔ قباحت یہ ہوئی کہ اس وقت تک میں مشہور ہو چکا تھا۔

☆☆☆

اب یہ دیکھو! مائی ڈیر کتنا اچھا لقب ہے' اس کا مطلب ہوا میرے پیارے منّو۔ یہ لقب مردوں کو خط لکھنے میں بھی استعمال کیا جاسکتا ہے۔ عورتوں سے خط وکتابت میں بھی، لیکن ان کے معاملے میں اس کا ترجمہ نہیں کیا جاسکتا۔ بڑی قباحتیں پیدا ہونے کا اندیشہ ہے، جوتم پیزار تک ہوسکتی ہے۔ بہرحال آپ کسی دوشیزہ کو مائی ڈیر لکھتے ہوئے دل ہی دل میں تو اس کا ترجمہ کر ہی سکتے ہیں، جس طرح اور بہت سی باتیں دل ہی دل میں کرنے کا ہمارے ہاں رواج ہے۔ دراصل ہمارا معاشرہ ابھی پسماندہ ہے۔ ابھی کل ہی کہیں مَیں پڑھ رہا تھا کہ امریکہ میں ایک پاکستانی افسر اعلا کی امریکن سیکرٹری مستعفی ہوکر چلی گئیں۔ کسی نے پوچھا کہ اس شخص نے کیا کیا، جو تم نے ناراض ہوکر استعفیٰ دیا۔ بولیں یہی تو شکایت ہے کہ کچھ بھی نہیں کیا۔ میں ایک ہفتے سے اس بھلے آدمی کی سیکرٹری ہوں۔ اُس نے ایک بار بھی تو مجھے چُومنے کی کوشش نہیں کی، کیا میں ایسی ہی گئی

گزری ہوں۔"

☆☆

تمہید کچھ لمبی ہوگئی، لیکن آج کل چالیس صفحے کی کتاب پر چار سو صفحے کا دیباچہ لکھنے کا دستور ہے۔ بلکہ بعض کتابوں پر تو صرف دیباچہ یا مقدمہ ہی ہوتا ہے۔ کتاب ہوتی ہی نہیں۔ مقدمہ ابن خلدون کو سب جانتے ہیں لیکن اگر کوئی ایسی تحریر یا کتاب ہے یا تھی جس کا یہ مقدمہ ہے تو اسے کوئی نہیں جانتا۔ آج کل بی۔اے۔ ایم۔اے میں طالب علموں کو حالی کا مقدمہ شعروشاعری تو پڑھاتے ہیں۔ حالی کی شاعری کوئی نہیں پڑھاتا۔ یہ بھائی اور بھائی پنے کی بحث میں تو میں ناحق الجھ گیا۔ قصہ یہ ہے کہ میں نے تمہارا وہ کالم پڑھا تھا جس میں یہ ذکر ہے کہ کوئی قرارداد رائٹرز گلڈ کے خلاف خاطر غزنوی نے لاہور کے سیمینار میں پیش کی تھی، جو میری صدارت میں منظور ہوئی۔ اس کا فائدہ اٹھا کر تم نے آگے چل کر مجھے اور خاطر دونوں کو گلڈ کا کھڑپینچ بھی لکھ دیا۔

☆☆

نہ میں گلڈ کا پنچ نہ کھڑپینچ۔ ایک نسبت سے اس کا کچھ کام کرتا بھی تھا تو اس سے مستعفی ہوئے بھی بہت دن ہوئے۔ خاطر غزنوی کا تو اتنا تعلق بھی نہیں رہا۔ وہ تو اکثر و بیشتر گلڈ سے ناخوش رہتے ہیں۔ بایں ہمہ یہ بات حقیقت نہیں کہ کوئی قرارداد میری صدارت میں گلڈ کے خلاف منظور ہوئی ہے۔ اس سلسلے میں، میں تم کو معاف کرتا ہوں کہ تم اس سیمینار کے کسی اجلاس میں آئے ہی نہیں۔ ایک بار مولانا عبدالمجید سالک نے روزنامہ انقلاب میں ایک جلسے کی روداد پوری تفصیل کے ساتھ مع مقرروں کی تقریروں کے چھاپ دی تھی۔ یہ سوچ کر کہ جلسے کا اعلان ہو چکا ہے، اس میں یہی کچھ تو ہوگا۔ اگلی صبح اخبار چھپ کر آیا تو لوگوں نے فون کیے کہ مولانا شام کو آندھی آجانے کی وجہ سے وہ جلسہ تو ہوا ہی نہیں۔ اب رہا لائبریریوں میں غلط کتابیں جانے کا معاملہ۔ وہ

دوسرا معاملہ ہے اور بڑا اہم معاملہ ہے۔

☆☆

تفصیل اس کی لاہور کے پبلشروں سے سنو۔ لاہور میں کئی طرح کے پبلشر ہیں۔ ایک تو اچھے پبلشر، دوسرے چور پبلشر، تیسرے چوروں کے مور پبلشر۔ ہوتا یہ ہے کہ محکمہ تعلیم والے سرکلر نکالتے ہیں کہ فلاں فلاں کتاب لائبریریوں میں خریدنے کے لیے منظور کی جاتی ہے۔ مشہور کتابوں کے فقط نام لکھے جاتے ہیں۔ شعرالعجم، بانگِ درا، نقشِ فریادی وغیرہ۔ یہ چوروں کے مور ان ناموں کے ٹائٹل چھپوا لیتے ہیں اور اندر کچھ اوٹ پٹانگ چھپوا کر جوڑ دیتے ہیں۔ قیمت وہی ہوتی ہے جو اصل شعرالعجم، اصلی بانگِ درا اور اصلی نقشِ فریادی کی۔ رجسٹر میں قانون کے تقاضے پورے ہو جاتے ہیں اور کاروبار میں ہیڈ ماسٹر کے کمیشن کی تقسیم میں لاقانونیت کے۔ پوچھیے تو ڈھٹائی سے حجت کرتے ہیں کہ کیوں صاحب شعرالعجم صرف شبلی نعمانی لکھ سکتے ہیں۔ کوئی اور نہیں لکھ سکتا۔ بانگِ درا صرف اقبال کی شاعری کی کتاب ہو سکتی ہے۔ مرغی خانے کی نہیں اور نقشِ فریادی کے نام پر فیض احمد فیض کا کوئی اجارہ ہے۔ انہوں نے بھی تو یہ غالب کے ہاں سے اُڑایا ہے۔

بقلم خود، روزنامہ امروز، لاہور۔

☆☆☆

ہفتۂ ٹریفک کیوں شروع کیا

ہم کوئی ہفتۂ بھر کے لیے کراچی سے باہر چلے گئے تھے۔ یہ سوچ کر کہ اب کراچی والے عاقل و بالغ ہیں۔ ان کی ایسی بھی کیا نگرانی کی ضرورت ہے۔ لیکن ہمارا جانا تھا کہ یہاں طرح طرح کی وارداتیں ہونا شروع ہو گئیں۔ ہمارے گھر کے سامنے جو پارک کی زمین ہے اور جس میں ایک زمانے سے کتّوں کا چوپال یا جمخانہ کلب چلا آتا تھا جہاں وہ ٹائلٹ بھی کرتے تھے اور استراحت بھی اور اکثر راتوں کو زندہ ناچ گانے کا پروگرام بھی، اس کو فلک نے لوٹ کے ویران کر دیا۔ یعنی کے ڈی۔ اے والوں نے اس میں گدھوں سے ہل پھروا دیے اور زمین کو ہموار کر دیا ہے۔ ابھی یہ تحقیق نہیں ہوا کہ وہاں سبزہ لگے گا یا پٹرول پمپ بنے گا۔ بہر حال کچھ نہ کچھ ہوا ضرور ہے۔ سبزہ لگا تو اس پر ٹہلنے کے لیے ہماری خدمات غیر مشروط طور پر حاضر ہیں البتہ پٹرول پمپ بننے میں یہ قباحت ہے کہ پٹرول سے چلنے والی کوئی نہ کوئی چیز خریدنی پڑے گی۔ کار وغیرہ۔ اسکوٹر وغیرہ۔ سگریٹ لائٹر وغیرہ۔ سیکنڈ ہینڈ کاروں اسکوٹروں، سگریٹ لائٹروں والے متوجہ ہوں۔

☆☆☆

کچھ ایسا ہی فائدہ پولیس والوں نے بھی اٹھایا یعنی ہمارے کراچی سے روانہ ہوتے ہی ہفتۂ ٹریفک کا اعلان کر دیا۔ حالانکہ یہ امر کسی سے پوشیدہ نہیں کہ ہماری غیر موجودگی میں ٹریفک کا ہفتہ منانا ایسا ہی ہے جیسا بلا کسی بیمار کے ہسپتال جانا یا بلا کسی دولہا کے بارات لے کر جانا۔ یہ نہ سمجھا جائے کہ ہم ٹریفک کے عادی خلاف ورزی کرنے والے ہیں۔ ہاں ٹریفک اکثر ہماری خلاف ورزی کا مرتکب ہوتا ہے اور اس کے ہم ہمیشہ سے شاکی ہیں۔ کئی بار ایسا ہوا کہ ہم عین وکٹوریہ روڈ یا بندر روڈ کے بیچوں بیچ جا رہے ہیں۔ پان کلّے میں ہے اور زیرِ تحریر غزل کا مصرعہ لب پر۔ غیب سے مضامین خیال میں آ رہے ہیں جا رہے ہیں۔ اتنے میں یکلخت کوئی زور سے کار کے بریک لگا کر ہٹو بچو کا شور مچا کر ساری کیفیت کو غارت کر دیتا ہے اور لُطف کی بات یہ ہے کہ ایسے میں لوگ باگ بھی موٹر نشین کی حمایت کرتے ہیں اور بجائے اس کے کہ اس کو سمجھائیں کہ بھائی تو اپنی موٹر فٹ پاتھ پر کیوں نہیں چلاتا اور کھمبے پر کیوں نہیں چڑھاتا کہ بجلی کمپنی والوں نے از راہِ رفاہِ عامّہ اسی مقصد کے لیے کھڑے کیے ہیں۔ سب اپنا غصّہ غریب مسافر پر نکالتے ہیں۔ کیونکہ یہ دور سرمایہ داری کا ہے۔ جس کے پاس پیسہ ہے سب اسی کی پچ کرتے ہیں۔

☆☆☆

ٹریفک کی طرف سے ہماری خلاف ورزی کی یہی ایک مثال نہیں۔ کئی بار ایسا ہوا کہ ہم ٹیکسی میں یا کسی دوست کی گاڑی میں بیٹھے ہیں اور بندر روڈ سے الفنسٹن اسٹریٹ کی طرف مڑنا چاہا۔ یک لخت کسی نے ٹوکا کہ ادھر جانا منع ہے۔ بھائی کیوں منع ہے؟ کیوں پاکستان کے آزاد شہریوں کی راہ روکتے ہو؟ اس کا کوئی جواب نہیں۔ خیر کسی صورت صدر پہنچ کر وکٹوریہ روڈ کے راستے بندر روڈ آنا چاہیں تو پھر ٹریفک کا سنتری روکتا ہے کہ صاحب آپ دیکھتے نہیں۔ صاف لکھا ہے کہ ''بند ہے'' اور آپ درّاتے

چلے جا رہے ہیں۔ مشکل یہ ہے کہ ٹریفک سنتریوں کو منطق نہیں پڑھائی نہیں جاتی جس طرح ہمارے نصابِ تعلیم میں ٹریفک کے قواعد نہیں تھے۔ ورنہ ہم پوچھیں کہ خالی ''بند ہے'' سے یہ مطلب کہاں نکلا۔ ادھار بند ہے بھی تو کہتے ہیں اور ''ناطقہ بند ہے'' بھی تو ایک محاورہ ہے۔

☆☆☆

ہم نے ایک بار تجویز پیش کی تھی کہ اگر کراچی کی تمام سڑکیں لارنس روڈ، فریئر روڈ اور میکلوڈ روڈ کی طرح مستقل طور پر کھود دی جائیں تو ٹریفک کا مسئلہ فی الفور حل ہو جائے نہ سڑکیں ہوں نہ ان پر سواریاں چلیں نہ ٹریفک ہو نہ ٹریفک کا ہفتہ۔ آج تک مذکورہ بالا سڑکوں کے متعلق کبھی نہ سُنا کہ وہاں موٹریں لڑ گئیں یا کسی ٹرک نے کسی رکشہ پر مجرمانہ حملہ کیا۔ لوگ بالخصوص کے۔ ڈی۔ اے اور گیس والوں کے جمعدار اور بیلدار بڑی دلجمعی سے عین سڑک کے بیچوں بیچ بیٹھ کر لیٹ کر گڑگڑی پیتے ہیں۔ چوسر کھیلتے ہیں۔ وہ کبھی کبھی قوالی کی محفل بھی برپا کرتے ہیں۔ ٹریفک ان کو دُور ہی سے دیکھتا، بے چارگی سے دانت پیتا گزر جاتا ہے ضرب خرابی کی بنیاد پر لگائی جائے۔ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔

☆☆☆

کراچی میں آج کل گیس کی شکایت عام ہے۔ جس کو دیکھو پیٹ پکڑے پھرتا ہے۔ ایک روز ہمارے ایک دوست ناظم آباد کی چورنگی پر بھاگم بھاگ جاتے مل گئے۔ ہم نے پوچھا کہ اے جانِ قیس تیرا ارادہ کدھر ہے آج۔ بولے۔ ''گیس کی شکایت لے کر جا رہا ہوں۔'' ہم نے کہا۔ ''دیکھو۔ ہڑ کا مربّہ نہار منہ کھاؤ اور کلونجی اور شہد ہم وزن لے کر کسی بوتل میں ڈال لو اور دن میں تین بار عرق گاؤزبان کے ساتھ استعمال کرو۔ گیس کے لیے اکسیر ہے۔'' بولے ''جناب یہ دوسری گیس ہے جسے سوئی گیس

کہتے ہیں۔ ہمارا پائپ کچھ لیک کرنے لگا ہے۔'' یہ ہمارا سوئی گیس والوں سے پہلا تعارف ہوا تھا۔ دوسرا اس وقت ہوا جب انہوں نے عین ناظم آباد کے چوراہے میں سڑک کھودی اور ٹریفک کو روکنے کے لیے رنگا رنگ بورڈ لگائے تھے۔ یہ بات اس موقع پر یوں یاد آئی کہ یہ بورڈ اُردو میں تھے اور خاصی مہذب زبان میں۔ جس میں ایک فقرہ اِس قسم کا بھی تھا کہ ٹریفک کی دِقت کے لیے جو ہماری وجہ سے پیدا ہوئی ہے ہم معذرت خواہ تو ہیں لیکن یہ کام آپ ہی کا ہے، یہ پائپ وغیرہ ہم آپ ہی کے لیے ڈال رہے ہیں۔ تب ہمیں پہلی بار معلوم ہوا کہ یہ محکمہ کارِ خیر کا محکمہ ہے۔ اس میں ان کا کوئی مالی یا تجارتی مفاد نہیں ورنہ اس وقت تک ہمارا یہ خیال تھا کہ شاید گیس کمپنی والے بھی دوسروں کی طرح پیسوں ہی کے میت ہیں۔ گیس فراہم کرتے ہیں تو بل بھی بھیجتے ہوں گے۔ پیسے بھی وصول کرتے ہوں گے۔

ڈاک خانے والو پانی چھوڑ دو

ایک مقامی اخبار میں ایک مراسلہ چھپا ہے، جس کا عنوان ہے ''ڈاک خانے والے توجہ کریں'' اس سُرخی کے نیچے مضمون یہ ہے کہ ناظم آباد میں پانی کی قلت ہے۔ آتا ہے تو قطرہ قطرہ ٹپ ٹپ آتا ہے۔ اس کا اُپائے کیا جائے، تدارک کیا جائے۔ ڈاک خانے والے اور کسی شکایت یا مراسلے کا جواب دیں یا نہ دیں۔ اس کا جواب انہوں نے ترنت دیا ہے کہ مکرمی! آپ کو کچھ غلط فہمی ہوئی ہے۔ گھروں میں پانی چھوڑنا نہ چھوڑنا ڈاک کے محکمے کی ذمّے داری نہیں۔

ڈاک خانے کے اس مستعد افسر نے یہ تو وضاحت کردی کہ پانی بند کرنا، چھوڑنا ہم ڈاک خانے والوں کا کام نہیں ہے' لیکن یہ نہیں بتایا کہ ان کا اپنا کام ہے کیا۔ اگر ڈاک بانٹنا کام ہے تو وہ تو پہلے ہی ہو رہا ہے۔

ایک صاحب نے ایک بار فرمایا تھا۔ ''سورج رات کو نکلنا چاہیے، اس کی اصل ضرورت رات کو ہے، دن کو تو ویسے ہی روشنی ہوتی ہے۔'' ہم بھی یہی کہیں گے کہ اگر ڈاک خانے والے پانی کی قلت دُور نہیں کر سکتے تو سمجھیے کچھ بھی نہیں کر سکتے کیونکہ نامہ بری۔ تو کبوتر بھی بہ خوبی کر لیتے ہیں۔ آخر کیا ہی کرتے تھے۔ ٹکٹ لگانے کی ضرورت بھی نہ تھی۔ رجسٹری کرانے کا جھنجٹ بھی نہ تھا۔ بس کوٹھے پر انتظار میں کھڑے ہونا

پڑتا تھا۔ بہت ہوا کبوتروں کو چوگا دے دیا، دانہ ڈال دیا۔ سو وہ ڈالنے اور کبوتر کو کھلانے ہی کی چیز ہے۔ نہ ڈالیں تو خاک میں مل کر گل و گلزار ہو جاتا ہے۔ اس سے بڑی قباحتیں پیدا ہوتی ہے۔ باغ ہوگا تو اس میں مگس ضرور آئے گی اور اس سے ناحق پروانے کی جان جائے گی۔

☆☆☆

قصہ یہ ہے کہ لوگ پانی کی شکایت پانی کے محکمے کو لکھتے لکھتے تنگ آ گئے تھے۔ شکایت دُور کرنا تو ایک طرف، وہ لوگ رسید تک نہ دیتے تھے۔ پانی تو خیر ڈاک خانے والوں نے بھی نہ دیا لیکن جواب تو دیا اور جواب میں اسی طرح آدھا پانی یعنی آب موجود ہے، جس طرح کسی نے فرمایا ہے۔

''جس کو کہتے ہیں بشر اس میں ہے شر دو بٹا تین۔'' اس اصول پر ڈاک وقت پر نہ ملنے اور رسالے چوری کیے جانے کی شکایت بھی ڈاک خانے کو بھیجنے کا فائدہ نہیں۔ وہ محکمہ آب رسانی کو بھیجنی چاہیے۔ ہم یقین دلاتے ہیں کہ ڈاک کی شکایت کا ازالہ وہ لوگ کریں یا نہ کریں' ان کا افسر رابطہ جواب ضرور دے گا کہ حضرات۔ رسالے چوری کرنا ہم آب رسانی والوں کا کام نہیں ہے۔ ہم بہو بیٹیاں یہ کیا جانیں۔

☆☆☆

کسی کا کام ہونا تو قسمت کی بات ہے، جواب ملنے کو بھی کام ہی سمجھنا چاہیے۔ فی زمانہ کوئی آدمی وہ کام تو کرتا نہیں جو اُس کے سپرد ہے یا جس کی اسے تنخواہ ملتی ہے۔ دوسرے کاموں کے لیے مستعد رہتا ہے۔ مثلاً ادیب سائیکل کا پنکچر لگاتا ہے اور سائیکل کا پنکچر لگانے والا شاعری کرتا ہے۔ ادبی جلسوں کی صدارت بنیے اور موسیقی کی محفلوں کی سرپرستی آڑھتیے کرتے ہیں۔ گویا جوتا پالش کرتا ہے۔ جوتا پالش کرنے والا گاتا ہے، گویا جس کا کام اُسی کو نہ ساجھے، وہ خود کرے تو ٹھینگا ہی باجے۔

کابل میں ایک بار ہمیں خط پوسٹ کرنا تھا۔ سارے شہر میں کاغذ لفافے اور ٹکٹ کی تلاش میں گھوم لیے۔ لیکن جہاں نقشے میں ڈاک خانہ لکھا ہوتا وہاں سبزی کی دکان ملتی یا تنور ملتا۔ ڈنمارک کے ایک سیاح ہمارے ساتھ تھے۔ بے چارے بہت دن تصویری کارڈ اپنے ساتھ ساتھ لیے پھرتے رہے۔ ڈاک خانہ ملا تو دستی، ان کارڈوں کو گھر واپس لے گئے، جناب ظفر حسن ایبک نے اپنی آپ بیتی میں جلال آباد افغانستان کا ذکر کیا ہے کہ اتنے بڑے شہر میں اسٹیشنری یعنی قلم، دوات، پنسل کی کوئی دُکان نہ تھی۔ کاغذ البتہ قصاب کی دُکان سے ملتا تھا۔ اعتراض کرنے والے یہ رمز نہیں سمجھتے کہ قلم دوات، کاغذ آسانی سے ملنے لگے تو لوگ پڑھنے لگتے ہیں۔ شورش کرنے لگتے ہیں، حقوق مانگتے ہیں، آئین مانگتے ہیں۔ افغانستان میں تھوڑی سی قلم دوات کی دُکانیں کُھلی تھیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ سر کو آ گئے ہیں۔ نہ قلم دوات ہو نہ کوئی محضر لکھے، نہ اخباروں کو مراسلے بھیجے، نہ کالم نگاری کرے۔ یہاں بھی مگس باغ اور پروانے کا قصہ ہے لیکن بات کابل کی بیچ میں رہی جاتی ہے۔ کاغذ تو قصاب کی دُکان سے ملتا تھا، گوشت کہاں سے ملتا تھا؟ ہمارے ایک مہربان نے جو اِن دنوں کابل میں ہوتے تھے اور گدھے پالا کرتے تھے، جواب دیا کہ درزی کے ہاں۔

☆☆☆

ڈاک خانے اور پانی کا مضمون ہمارے دوست نصراللہ خان کے ہاتھ آیا ہے اور انہوں نے اسے اچھا نبھایا ہے۔ اتنا تو ہم بھی کہیں گے کہ یہ تعلق اتنا دُور کا بھی نہیں ہے بعض لوگ بوتل میں خط بند کر کے سمندر میں ڈال دیتے ہیں اور وہ خط ڈوبتا تیرتا بھٹکتا کبھی ساحل مراد پر آ بھی لگتا ہے۔ مکتوب الیہ کو پہنچ جاتا ہے۔ اگر پانی وافر نہ ہوگا تو خط بھیجنے والا خط کی بوتل کہاں ڈالے گا۔

☆☆☆

ہمارا تمہارا خدا بادشاہ

کسی ملک میں ایک تھا بادشاہ۔ بڑا دانش مند مہربان اور انصاف پسند۔ اس کے زمانے میں ملک نے بہت ترقی کی اور رعایا اس کو بہت پسند کرتی تھی۔ اس بات کی شہادت نہ صرف اس زمانے کے محکمہ اطلاعات کے کتابچوں اور پریس نوٹوں سے ملتی ہے بلکہ بادشاہ کی خودنوشت سوانح عمری سے بھی۔

شاہ جمجاہ کے زمانے میں ہر طرف آزادی کا دُور دورہ تھا۔ لوگ آزاد تھے اور اخبار آزاد تھے۔ کہ جو چاہیں کہیں، جو چاہیں لکھیں۔ بشرطیکہ وہ بادشاہ کی تعریف میں ہو، خلاف نہ ہو۔

اس بادشاہ کا زمانہ ترقی اور فتوحات کے لیے مشہور ہے۔ ہر طرف خوشحالی ہی خوشحالی نظر آتی تھی، کہیں تل دھرنے کو جگہ باقی نہ تھی۔ جو لوگ لکھ پتی تھے، دیکھتے دیکھتے کروڑ پتی ہو گئے۔ حُسنِ انتظام ایسا تھا کہ امیر لوگ سونا اُچھالتے اُچھالتے ملک کے اس سرے سے اُس سرے تک، بلکہ بعض اوقات بیرون ملک بھی چلے جاتے تھے۔ کسی کی مجال نہ تھی کہ پوچھے اتنا سونا کہاں سے آیا اور کہاں لیے جا رہے ہو۔

روحانیت سے شغف تھا۔ کئی درویش ہوائی اڈے پر لینے چھوڑنے جاتے تھے یا اُس کی کامرانی کے لیے چلّے کاٹتے تھے۔ طبیعت میں عفو اور درگزر کا مادّہ از حد تھا۔ اگر کوئی آ کر شکایت کرتا تھا کہ فلاں شخص نے میری فلاں جائداد ہتھیا لی ہے یا فلاں کارخانے پر قبضہ کر لیا ہے، تو مجرم خواہ بادشاہ کا کتنا ہی قریبی عزیز کیوں نہ ہو، وہ کمال سیر چشمی سے اسے معاف کر دیتے تھے بلکہ شکایت کرنے والوں پر خفا ہوتے تھے کہ عیب جُوئی بُری بات ہے۔

جب بادشاہ کا دل حکومت سے بھر گیا تو وہ اپنی چیک بُکیں لے کر تارکِ الدنیا ہو گیا اور پہاڑوں کی طرف نکل گیا۔ کچھ لوگ کہتے ہیں اب بھی زندہ ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

☆☆☆

چند غیر ضرُوری اعلانات

بس مسافروں کے لیے مژدہ

کراچی بس مالک ایسوی ایشن بڑے فخر اور مسرّت سے اعلان کرتی ہے کہ آج سے شہر میں تمام بسوں کے کرائے دُگنے کر دیئے گئے ہیں۔ اُمید ہے محبّ وطن حلقوں میں اس فیصلے کا عام طور پر خیر مقدم کیا جائے گا کیونکہ اس سے بس مالکان کی آمدنی پر ہی نہیں، مسافروں کے معیارِ زندگی پر بھی خوشگوار اثر پڑے گا۔

ایسوی ایشن ہذا کرایوں میں اضافے کے علاوہ مسافروں کے لیے کچھ اور سہولتوں کا بھی اعلان کرتی ہے۔ مثلاً ہر بس میں جہاں فقط چالیس سواریوں کی گنجائش ہوتی تھی۔ اب اس سے تین گنا مسافروں کو جگہ دی جایا کرے گی۔ اس مقصد سے ہر بس کی چھت میں کُنڈوں، اور تسموں کا اضافہ کر دیا گیا ہے اور سیٹیں نکال دی گئی ہیں جو خواہ مخواہ کھڑے ہونے والوں کے گھٹنوں سے ٹکراتی تھیں۔

پبلک کی مزید آسانی کے لیے ہر بس کی چھت پر، پائیدانوں پر، مڈگارڈوں پر، انجن پر حتیٰ کہ سائلنسر تک پر مسافروں کے بیٹھنے اور کھڑے ہوئے کی گنجائش نکالی گئی ہے۔ ان خصوصی جگہوں کا کرایہ بھی کچھ زائد نہیں ہوگا۔ شرح ٹکٹ وہی رہے گی جو اندر بیٹھنے

یعنی کھڑے ہونے اور لٹکنے والے مسافروں سے وصول کی جائے گی۔ آئندہ سے سب مسافروں کے حقوق بھی مساوی ہوں گے۔ یعنی ہر مسافر کو بس کو دھکا لگانے کا یکساں حق ہوگا حتیٰ کہ آدھا ٹکٹ لینے والے بچوں اور بغیر ٹکٹ سفر کرنے والے معذوروں کو بھی بس میں یتیم خانوں کے لیے چندہ اکٹھا کرنے والوں اور کھٹی میٹھی گولیاں بیچنے والوں کو بھی یہ حق دینے پر اس میٹنگ میں غور کیا جا رہا ہے جو کراچی کا ٹرانسپورٹ کا مسئلہ حل کرنے کے لیے کمشنر صاحب کے دفتر میں اگلے ہفتے ہو رہی ہے۔

پانی بند رہے گا

ناظم آباد اور نارتھ ناظم آباد کے باشندوں کو مژدہ ہو کہ جمعہ اور ہفتے کو ان کے گھروں کا پانی بند رہا کرے گا۔ یہ سہولت روزانہ تئیس گھنٹے پانی بند رہنے کی سہولت کے علاوہ ہے۔ بعض مجبوریوں کی وجہ سے فی الحال ہفتے میں دو دن سے زیادہ پانی مکمل طور پر بند رکھنا ممکن نہیں۔ ناغے کے دنوں کی تعداد رفتہ رفتہ بڑھائی جائے گی۔ اُمید کی جاتی ہے کہ ماہ محرم کی آمد تک ہم ہفتے کے ساتوں دن پانی بند رکھنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

اس کے ساتھ ساتھ بلدیہ کراچی اور کے ڈی اے نہایت مسرت سے اعلان کرتی ہیں کہ اہل ناظم آباد کے ایک دیرینہ مطالبے کو تسلیم کرتے ہوئے اس علاقے کے واٹر ٹیکس میں فوری طور پر تین سو فیصدی اضافہ کیا جا رہا ہے۔ آگے چل کر اس میں اور بھی اضافہ کرنے کی کوشش کی جائے گی لیکن کے ڈی اے اور بلدیہ کے روز افزوں مسائل اور محدود اخراجات کو دیکھتے ہوئے فی الحال اس کی قطعی طور پر ضمانت نہیں دی جا سکتی۔

علامہ اقبال ٹاؤن نارتھ ناظم آباد کے پارک میں کامیاب تجربے کے بعد شہر کے دوسرے پارکوں کا پانی بھی بند کیا جا رہا ہے تاکہ زمین بھربھری ہو جائے اور کتے آسانی

سے اس میں لوٹ لگا سکیں۔

آپ کا اپنا اسکول

انٹرنیشنل انگلش آکسفورڈ اسکول آپ کا اپنا اسکول ہے جو تعلیم کے جدید ترین اصولوں پر کھولا گیا ہے۔ چند خصوصیات۔

۱۔ فیس کا معیار نہایت اعلا:

شہر کا کوئی اور اسکول فیس کے معاملے میں ہمارے اسکول کا مقابلہ نہیں کرتا۔ انواع و اقسام کے چندے اس کے علاوہ ہیں جن کی تفصیل پرنسپل صاحب کے دفتر سے معلوم کی جا سکتی ہے۔

۲۔ اساتذہ:

نہایت محنتی، ایماندار اور قناعت پسند جن کو بیش قرار تنخواہوں پر رکھا گیا ہے۔ عام ٹیچر کی تنخواہ بھی ہمارے ہاں میونسپل کارپوریشن کے تعداد سے کم نہیں اور پرنسپل کا مشاہرہ تو کسی بڑی سے بڑی غیر ملکی کمپنی کے چوکیدار کی تنخواہ سے بھی زیادہ ہے۔

۳۔ چھٹیاں:

چھٹیوں کے معاملے میں بھی ہمارا اسکول دوسرے تمام اسکولوں پر فوقیت رکھتا ہے۔ ہر ماہ فیس جمع کرانے کے دن کے علاوہ قریب قریب پورا سال چھٹی رہتی ہے۔ جو والدین سال بھر کی فیس اکٹھی جمع کرا دیں، ان کے بچوں کو فیس کے دن بھی حاضری دینے کی ضرورت نہیں۔

۴۔ ماحول:

اسکول نہایت مرکزی اور پر رونق جگہ پر واقع ہے اور شہر کا سب سے قدیم

اوپن ایئر اسکول ہے۔ یہاں طلبا کو مناظر فطرت سے محبت کرنا سکھایا جاتا ہے۔ بالکل سامنے ایک سینما ہے اور ایک سرکس۔ ایک بغل میں موٹر گیراج ہے اور دوسری طرف گٹر باغیچہ جس کی کھاد سارے شہر کو ہرا بھرا رکھنے کی ضامن ہے۔ پروفیسر کیوی کے اصول کے مطابق یہاں پڑھائی کتابوں سے نہیں کرائی جاتی بلکہ کسی اور طرح بھی نہیں کرائی جاتی تاکہ طالب علم کے ذہن پر ناروا بوجھ نہ پڑے۔

۵۔ نتیجہ۔ اسکول کا نتیجہ کم از کم سو فیصد رہتا ہے۔ کئی بار تو دوسو ڈھائی فیصد بھی ہو جاتا ہے۔ کوئی شخص خواہ وہ طالب علم ہو یا غیر طالب علم اس اسکول کے پاس سے بھی گزر جائے تو پاس ہوئے بنا نہیں رہ سکتا۔ طالب علموں پر امتحان میں بیٹھنے کی کوئی پابندی نہیں۔ سب کو گھر بیٹھے کامیابی کی سندیں بھیج دی جاتی ہیں۔

☆☆☆

نظرثانی کے بعد

ایک مضمون نگار ایڈیٹر قومی ادب کے دفتر میں داخل ہوتا ہے۔ ڈرتے ڈرتے جھجکتے جھجکتے۔

"جی، معاف فرمایئے گا مجھے علامہ اُستاد جگت پوری سے ملنا ہے جو "قومی ادب" کے ایڈیٹر ہیں۔"

ایڈیٹر: "آیئے تشریف لایئے۔ اسم شریف؟"

مضمون نگار (م) "جی ہاں میرا نام محمد شریف ہی ہے۔ آپ کو کیسے معلوم ہوا؟ عاجز تخلص کرتا ہوں۔ شاعری ورثے میں ملی ہے، ادب گھٹی میں پڑا ہے۔ میرے پردادا کے لکڑ دادا شیر شاہ سوری کے زمانے میں اصفہان جنت نشان سے آئے تھے۔ میری والدہ کی خالہ کے پھوپھا شاداں ناشاد پوری بھی صاحب دیوان شاعر تھے۔"

ایڈیٹر (ا) "آپ کیا لکھتے ہیں؟"

(م) "جی ایک افسانہ لایا ہوں۔ بالکل اچھوتا موضوع ہے آپ دیکھیں گے تو....!"

(ا) "چھوڑ جایئے افسانہ، اس کے ساتھ ٹکٹ لگا جوابی لفافہ ضرور ہونا چاہیے۔ آپ کو چھ مہینے کے اندر اندر اپنی رائے سے مطلع کردوں گا۔"

(م) لجاجت سے۔ جی اگر گستاخی نہ ہو تو عرض کروں کہ چھوٹا سا تو افسانہ ہے آپ

ابھی سُن لیں اور اپنی رائے مجھے بتادیں۔ بس تین چار منٹ کی بات ہے۔ آپ اجازت دیں تو...!''

(ا) (گھڑی دیکھتے ہوئے) ''اچھا خیر پڑھیے۔ کیا عنوان ہے؟''

(م) ''عنوان بھی اچھوتا رکھا ہے میں نے۔'' کارِ خیر'' اس کا عنوان ہے۔'' بہادر اللہ دتا بھی ہوسکتا تھا، لیکن وہ پُرانے فیشن کا ہے۔''

(ا) ''اچھا اچھا پڑھیے۔''

(م) پڑھتا ہے۔

''رات کے تین بجے ہوں گے۔ ہر کوئی خوابِ خرگوش کے مزے لُوٹ رہا تھا۔ کہیں کوئی روشنی نظر نہ آ رہی تھی۔ یکا یک ایک پُرانی حویلی کی تیسری منزل سے آگ کی لپٹیں آ اٹھیں۔ پھر کسی کے چلاّنے کی آواز آئی ۔ آگ......آگ بچاؤ ......بچاؤ..... معلوم ہوتا تھا کوئی لاپرواکرایہ دار انگیٹھی بُجھائے بغیر سو گیا تھا۔ اس کی چنگاری کپڑوں پر پڑی اور آگ بھڑک اُٹھی۔ اب وہ شخص غریب آگے آگے تھا اور آگ پیچھے پیچھے۔ دفعتاً آگ بُجھانے والے انجن کا گھگھو سنائی دیا۔ فائر مین اللہ دتا جو منجھلی عمر اور گٹھے ہوئے جسم کا جہلم کی طرف کا سابق سپاہی تھا۔ دروازے کے سامنے رُکا۔ تھوڑی دیر سوچتا رہا۔ پھر درآتا ہوا کمرے میں گُھس گیا اور اس حواس باختہ شخص کو شعلوں میں سے باہر نکال لایا۔ اب اُس نے شست باندھ کر پانی کا تریڑا دیا اور آگ بُجھ گئی۔ آگ بُجھانے کے دستے کا جمعدار مولا بخش آگے بڑھا اور بولا۔'' آفرین ہے تری بہادری پر۔ محکمے کو تجھ سے یہی توقع تھی۔'' اس کے بعد مسکرا کر بولا۔'' ذرا دیکھنا تمہاری داہنی مونچھ جل رہی ہے۔'' بہادر اللہ دتا مُسکرایا اور پانی کا ایک تریڑا اپنی داہنی مونچھ پر بھی دیا۔ دُور مشرق میں سپیدہ سحری نمودار ہو رہا تھا۔''

(ا) ''افسانہ بُرا نہیں، عنوان کیا بتایا تھا؟ کارِ خیر! یہ بھی اس پر عین چسپاں ہوتا ہے۔

تاہم بعض جگہ نظرِ ثانی کی ضرورت پڑے گی تاکہ جھول نکل جائے۔ ذرا شروع سے پڑھیے دیکھیں اس کا کیا ہوسکتا ہے۔''

(م) ''سُنیے۔''

''رات کے تین بجے ہوں گے۔ ہر کوئی خوابِ خرگوش کے مزے لوٹ رہا تھا۔''

(ا) ''(سر ہلاتے ہوئے) یہ تو نہیں چلے گا۔ ہر کوئی مطلب ہے' پولیس والے بھی سو رہے تھے یعنی اپنی ڈیوٹی سے غافل تھے......نہ نہ یہ ٹھیک نہیں۔ لوگ سمجھیں گے اس مُلک میں چوکی پہرے کا انتظام درست نہیں ہے.....اسے بدل کر یوں کر دیجیے۔

''رات کے تین بجے ہوں گے۔ کوئی آدمی خوابِ خرگوش کے مزے نہیں لُوٹ رہا تھا۔''

(م) (نیم احتجاجی لہجے میں) ''یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ رات کا منظر ہے، ایسے میں تو لوگ سو ہی رہے ہوتے ہیں۔''

(ا) ''ہاں' آپ بھی ٹھیک کہتے ہیں۔ اچھا تو یوں سہی۔

''شہر میں ہر کوئی خوابِ خرگوش کے مزے لوٹ رہا تھا، لیکن ہوشیار اور چوکس تھا۔''

(م) (منمناتے ہوئے) ''کیا فرمایا؟ سو رہا تھا اور چوکس بھی تھا؟''

(ا) ''ہاں' یہ بھی کچھ بے معنی سی بات ہوگی۔ اچھا یوں تو کر سکتے ہیں۔

''کچھ لوگ خوابِ خرگوش کے مزے لُوٹ رہے تھے، کچھ ہوشیار اور چوکس تھے۔''

''چلیے آگے چلیے۔''

(م) (کھنکھارتے ہوئے) ''کہیں کوئی روشنی نظر نہ آ رہی تھی۔''

(ا) ''رُکیے! کیا مطلب ہے آپ کا؟ کیا آپ استعارے میں یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ہمارے مُلک میں اندھیر مچا ہوا ہے؟''

(م) ''جی نہیں' یہ بات نہیں۔ رات میں بلب بجھا دیے جاتے ہیں۔''

(ا) ''عزیزمن! سب لوگ اتنے سمجھدار نہیں ہوئے کہ یہ نکتہ سمجھ جائیں۔ بہت سے

تو یہ سمجھیں گے کہ ہمارا ملک اندھیر نگری ہے۔ میری مانو تو اسے کاٹ ہی دو۔ اگر بلب جل نہیں رہے تھے تو اِن کے ذکر سے فائدہ؟''

(م) (کسمساتے ہوئے آگے بڑھتا ہے)۔

''یکا یک ایک پُرانی حویلی کی تیسری منزل سے آگ کی لپٹیں اُٹھیں، پھر کسی کے چلّانے کی آواز آئی آگ..... آگ..... بچاؤ...... بچاؤ۔''

(ا) گویا بھگدڑ مچ گئی؟''

(م) ''جی ہاں۔''

(ا) ''گویا ہم اپنے پرچے میں اس بات کو شہرت دیں کہ ہمارے عوام میں ذرا سی بات پر بھگدڑ مچ جاتی ہے۔ یعنی وہ اوسان کھو بیٹھتے ہیں...... نہ صاحب یہ نہیں چلے گا۔ یہ قومی ادب، کا دفتر ہے۔ ''سُرخ سویرا'' کا نہیں۔

(م) ''جی یہ تو محض افسانہ ہے، ایک تخلیقی کوشش میں بس آگ کا منظر بیان کر رہا تھا۔''

(ا) ''آپ اس میں ایک بہادر اور اپنے فرائض سے باخبر شہری کے بجائے ایک ایسا کردار لاتے ہیں جس کی ذرا سی بات پر یعنی محض مکان کو آگ لگ جانے سے ہاتھ پاؤں پھول جاتے ہیں۔ کیا یہ ایسی کسی قوم کے مرد کے شایان شان ہے جس کے بزرگ بحرِ ظلمات میں گھوڑے دوڑایا کرتے تھے۔ میں آپ کی جگہ ہوتا تو بچاؤ بچاؤ کے بجائے اس کردار سے کوئی ایسی بات کہلواتا جو قومی تقاضوں کے زیادہ مطابق ہوتی۔''

(م) ''مثلاً''

(ا) ''مثلاً وہ کہہ سکتا تھا۔ ''جی، ایسی آگیں بہت دیکھی ہوئی ہیں ابھی بُجھا دیں گے۔'' بلکہ اس کو کہنا چاہیے۔ ''آگ واگ کچھ بھی نہیں تخریب' پسندوں کا پروپیگنڈا ہے۔''

(م) مری ہوئی آواز میں ''جی آگ تو بہر حال لگی تھی۔''

(ا) ''ہم جب کہتے ہیں ''آگ واگ کچھ بھی نہیں تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہے بھی تو ہم کیا پروا کرتے ہیں۔ دلاوروں کے آگے آگ کی کیا ہستی ہے۔

اولوالعزمانِ دانش مند جب کرنے پہ آتے ہیں
سمندر چیرتے ہیں کوہ سے دریا بہاتے ہیں

(م) ''خیر آپ کے کہنے سے کر لیتا ہوں، لیکن اس سے بات نہیں بنتی۔''

(ا) ''بنتی کیوں نہیں، آپ آگے چلیے۔''

(م) (آگے بڑھتے ہوئے)۔ ''معلوم ہوتا تھا کوئی لاپروا کرایہ دار انگیٹھی بُجھائے بغیر سو گیا تھا۔ اس کی چنگاری کپڑوں پر پڑی اور آگ بھڑک اُٹھی۔''

(ا) ''کیسا کرایہ دار!''

(م) ''لاپروا۔''

(ا) ''اوّل تو لاپروا کی ترکیب ہی غلط ہے۔ لا عربی کا پروا۔ فارسی کا یا شاید ہندی کا۔ خیر اسے بھی جانے دیجیے۔ آج کل سبھی ایسی زبان لکھتے ہیں لیکن لاپروائی اور غفلت کی ہم اپنے پرچے کے صفحات میں تشہیر کریں۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ اور یہ آپ نے کیا لکھ دیا کہ شخص مذکور انگیٹھی بجھائے بغیر سو گیا تھا۔ آپ ہمارے پڑھنے والوں کے سامنے ایک غلط مثال پیش کر رہے ہیں تاکہ وہ بھی ایسی ہی غفلت کریں۔''

(م) (معذرتاً) ''جی۔ میں نے اس نیت سے نہیں لکھا۔ انگیٹھی کا ذکر اس لیے کیا کہ اس کے بغیر آگ نہ لگتی۔''

(ا) ''چلیے مان لیا آگ نہ لگتی' اس سے کیا نقصان ہوگا؟''

(م) ''نقصان تو کچھ نہ ہوتا بلکہ نہ لگتی تو اچھا تھا۔''

(ا) ''اب آئے نا راہ پر تو پھر یونہی لکھو بھی۔ انگیٹھی کا ذکر بالکل اڑا دو۔ آگ کے ذکر کی بھی ضرورت نہ رہے گی۔ نہ رہے بانس بجے بانسری۔ اچھا اب آگے پڑھو یہ بیچ

کا حصّہ چھوڑ کر سیدھے سیدھے فائر مین کے کردار پر آ جاؤ۔"

(م) "ف.....ف.....ف......فائر مین اللہ دتا جو منجھلی عمر اور گٹھے ہوئے جسم کا جہلم گڈز کا سابق فوجی تھا۔"

(ا) "خوب بہت خوب لکھا ہے آپ نے ہمارا وطن بھی جہلم کی طرف کو ہے چکوال کا نام سُنا ہے آپ نے۔ وہاں کے لوگ ہوتے ہی بہادر ہیں۔ پہلی جنگِ عظیم میں......! (م) (بات کاٹ کر پڑھنا جاری رکھتا ہے۔" (دروازے کے سامنے رُکا۔ تھوڑی دیر سوچتا رہا۔"

(و) "ہیں سوچتا رہا نہیں نہیں فائر مین کو سوچتے مت دکھایئے، اس کا کام تو بس آگ بجھانا ہے۔"

(م) "اس سے کہانی میں زور پیدا ہوتا ہے۔"

(و) "کہانی میں زور پیدا ہو گیا تو کیا؟ اس سے فائر مین کی تو کمزوری ظاہر ہوتی ہے۔ پھر دوسری بات یہ کہ جب ہم نے آگ کا ذکر حذف کر دیا تو فائر مین کے ذکر کی کیا حاجت ہے۔

(م) "لیکن پھر فائر مین اللہ دتا اور جمعدار مولا بخش کے مکالمے کا موقع کیسے پیدا ہوگا؟"

(و) "یہ مکالمے تو آپ ان کے دفتر میں بھی دکھا سکتے ہیں۔"

(م) (پڑھتا ہے) "آگ بجھانے والے دستے کا جمعدار مولا بخش آگے بڑھا اور بولا۔" آفرین ہے تیری بہادری پر، محکمے کو تجھ سے یہی توقع تھی۔" اس کے بعد مسکرا کر بولا۔" ذرا دیکھنا تمہاری داہنی مونچھ جل رہی ہے۔" بہادر اللہ دتا بھی مسکرایا اور پانی کا ایک تریڑا اپنی داہنی مونچھ پر دیا۔ دُور اُفق پر سپیدہ سحری نمودار ہو رہا تھا۔"

(ا) "کیا یہ ذکر بہت ضروری ہے؟"

(م) "کس چیز کا ذکر ہے؟"

(ا) "جلتی ہوئی مونچھ کا۔"

(م) "یہ تو میں نے اپنے افسانے میں مزاح پیدا کرنے کیلئے ڈالا ہے۔ اپنے فرض کی ادائیگی میں اس شخص کا ایسا انہاک دکھایا گیا ہے کہ اسے اپنی مونچھ جلنے تک کی خبر نہیں۔"

(ا) میری مانیے تو آپ اس ذکر کو خارج رکھیے۔ جب ہم نے آگ کا ذکر حذف کر دیا۔ جب مکان ہی کو آگ نہیں لگی تو مونچھ کو لگانے کی کیا ضرورت ہے؟"

(م) "پہلو بدل کر) مزاح.....!"

(ا) "وہ تو ویسے بھی رہے گا۔ لوگ کب ہنستے ہیں۔ جب ان کو کوئی پریشانی نہ ہو۔ کیا آگ کا ذکر نکال دینے سے پریشانی رفع نہیں ہو جاتی؟ ضرور ہو جاتی ہے لہٰذا ہر شخص خوش ہوگا، ہر شخص خود بہ خود ہنسے گا۔ اچھا اب شروع سے سُنا دو کہ کہانی کی کیا صورت ہے؟"

(م) "جی سُنیے!

"رات کے تین بجے ہوں گے۔ کچھ لوگ خوابِ خرگوش کے مزے لے رہے تھے۔ کچھ ہوشیار اور چوکس تھے۔ یکا یک ایک پُرانی حویلی کی تیسری منزل سے کوئی پکارا "آگ واگ کچھ بھی نہیں لگی۔ تخریب پسندوں کا پراپیگنڈا ہے۔" فائر مین اللہ دتا منجھلی عمر اور گٹھے ہوئے جسم کا جہلم کی طرف کا سابق فوجی تھا۔ آگ بجھانے والے دستے کا جمعدار مولا بخش آگے بڑھ کر اُس سے بولا۔" آفرین ہے تیری بہادری پر۔ محکمے کو تجھ سے یہی توقع تھی۔" اللہ دتا مُسکرایا اور پانی کا تریڑا اپنی داہنی مونچھ پر دیا۔" دور اُفق پر سپیدۂ سحری نمودار ہو رہا تھا۔"

(ا) "اب بات بنی نا! اب افسانہ بے نقص ہے اور ماہنامہ "قومی ادب" اسے آب وتاب سے چھاپے گا۔ نہیں شکریے کی ضرورت نہیں "قومی ادب" کا مقصد ہی نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کرنا ہے۔"

☆☆☆

علاج سے پرہیز بہتر ہے

وُہ دن گئے جب اخبار کا مطلب محض خبریں ہوتا تھا۔ خبریں تو آدمی ریڈیو سے بھی سُن سکتا ہے۔ چنڈو خانے میں بھی سُن سکتا ہے، حجام کے ہاں بال کٹواتے ہوئے اور پنساری کے ہاں سودا لیتے ہوئے بھی۔ بلکہ یہ خبریں اخبار سے زیادہ تازہ ہوتی ہیں۔ اخبار فی زمانہ بارہ مسالے کی چاٹ ہے، یہ بات نہیں کہ اس میں خبریں نہیں ہوتیں۔ سب خبریں ہوتی ہیں، جن کی آپ کو ضرورت ہے بلکہ جن کی ضرورت نہیں بھی ہے، صرف حال کی نہیں مستقبل کی بھی۔ آپ اپنی تاریخ پیدائش یاد رکھیے اور اپنا بُرج معلوم کر لیجیے پھر آپ کو فی الفور معلوم ہو جائے گا کہ آپ کتنے پانی میں ہیں اور کل کتنے پانی میں ہوں گے۔ یہ ضروری نہیں کہ تمام اخباروں اور رسالوں میں آپ کے مقدر کے بارے میں ایک ہی بات لکھی ہو، بے شک تقدیر، پتھر کی لکیر ہوتی ہے لیکن اخبار تو سیاہی کی لکیریں ہوتے ہیں۔ آپ کو چاہیے کہ جس میں آپ کا مستقبل خوش آئند بتایا گیا ہے۔ اس پر اعتبار کیجیے۔ باقی کو چھوڑ دیجیے۔ بہر حال موضوعِ سُخن ہمارا یہ ہے، اخبار میں اور بھی، بہت کچھ ہوتا ہے۔ گوبھی پکانے کی ترکیبیں بھی، میز پوش کی کشیدہ کاری کے نمونے بھی، کپڑوں سے اچار کے داغ چھڑانے کے نسخے بھی اور طبّی مشورے بھی اور اشتہار بھی۔

☆☆☆

ویسے آدھے سے زیادہ اشتہار بھی اس قسم کے ہوتے ہیں کہ ان کو طبی مشورے ہی کہنا چاہیے۔ سوال یہ ہے کہ جب آپ اخبار میں ڈاکٹر اور حکیم کا کالم استعمال کر لیں، یعنی اس کالم میں دیے ہوئے مشورے اور کچھ فائدہ نہ ہو تو پھر کہاں جائیں۔ آپ کے سے مایوس العلاج مریضوں کے لیے ہی تو یہ سارے حکیم، سنیاسی باوا، پروفیسر اور عامل کامل اور جرمن، جاپان، خراسان، چین، انڈونیشیا اور لنکا دواخانے ہیں۔ فقیروں کی چٹکیاں ہیں اور طلسمی انگوٹھیاں ہیں۔ اور مقناطیسی چھلّے ہیں اور کراماتی تعویذ ہیں۔ تاہم بعض اخبار واقعی مستند ڈاکٹروں کے طبی مشورے بھی دیتے ہیں۔ کبھی مقامی ڈاکٹروں کے، کبھی غیر ملکی ڈاکٹروں کے بعض ان میں بہت مختصر بھی ہوتے ہیں۔ دلچسپ بھی اور کار آمد بھی۔ لاہور کے ایک مشہور سنجیدہ روزنامے میں ہر روز چوکھٹے میں جدید طبّی تحقیق کا کالم چھپتا ہے۔ اس وقت ہمارے سامنے جو تراشا ہے، وہ یہ ہے کہ سیڑھیوں کے پھسلنے سے جو حادثات ہوتے رہتے ہیں کیا ان کا سدِّ باب ممکن ہے!

☆☆☆

آپ شاید کہیں گے کہ یہ تو طبّی تحقیق نہ ہوئی۔ یہ وضاحت کر دیں کہ جب سیڑھی گرتی ہے تو عموماً اس پر کوئی آدمی چڑھا ہوتا ہے اور وہ طبّی مدد کا محتاج ہو جاتا ہے۔ اگر نہ بھی چڑھا ہو تو سیڑھی تو بہر حال ٹوٹتی ہے۔ اگر بانس کی سیڑھی ہے تو اس کے مالک کو اس کے ٹوٹنے کا دُکھ اپنی ٹانگ کے ٹوٹنے سے بھی زیادہ ہوتا ہے کیونکہ بانس تو امرتسر کا ٹیلی ویژن دیکھنے کے لیے انٹینا اونچا کرنے کے کام آتا ہے۔ ٹانگ تو اس کام نہیں آ سکتی اپنے مُنہ مانگے دام نہیں پا سکتی۔

☆☆☆

بہر حال اُوپر ہم نے صرف سوال درج کیا ہے۔ اصل چیز جواب ہے اور وہ یہ ہے

کہ۔ ''ہاں سدِ باب ممکن ہے، اگر سیڑھی کے استعمال میں احتیاط برتی جائے تو حادثوں سے محفوظ رہا جاسکتا ہے۔ مثلاً سیڑھی کے اُوپر تک نہیں جانا چاہیے۔ دو تین ڈنڈے نیچے رہنے سے توازن نہیں بگڑتا۔ حادثہ عدم توازن کے باعث ہوتا ہے۔''

آپ کہیں گے کہ دو تین ڈنڈے نیچے رہنے سے حادثہ تو بے شک نہیں ہوتا' لیکن آدمی چھت پر بھی تو نہیں پہنچ سکتا۔ ہم اس کج بحثی کے جواب میں یہ عرض کریں گے کہ آپ کو اپنی جان اور اپنی سیڑھی زیادہ عزیز ہے یا چھت پر پہنچنا؟ آپ چھت پر جائیں ہی کیوں۔ چرا کارے کند عاقل کہ باز آید پشیمانی۔ آپ چھت پر جائیں گے تو اور بھی کئی قباحتیں پیدا ہوں گی۔ آپ ہمسائے کے گھر میں جھانکیں گے تو اس سے لپاڈگی ہوگی اور سیڑھی چڑھنے سے آپ کی ٹانگ نہیں ٹوٹی تو یوں ٹوٹ جائے گی بلکہ کچھ اور بھی۔

☆☆☆

بس ہمارا صائب مشورہ یہی ہے کہ اگر آپ کو سیڑھی پر چڑھنے کا بہت شوق ہے تو سیڑھی کے اُوپر تک نہ جایئے۔ آدھی سیڑھی جا کر ڈنڈے پر بیٹھ جایئے اور پھر اُتر آیئے۔ صرف بانس کی سیڑھی کی تخصیص نہیں۔ جو لوگ سیاست کی سیڑھی یا افسری کی سیڑھی میں بالکل چوٹی پر چلے جاتے ہیں وہی زیادہ گرتے ہیں اور گزند اُٹھاتے ہیں' جو سیڑھی چڑھتے ہی نہیں اُن کو ہم نے گرتے بہت کم دیکھا ہے۔ وہ جو کسی کا شعر ہے۔

گرتے ہیں شہ سوار ہی میدانِ جنگ میں
وہ طفل کیا گرے گا جو گھٹنوں کے بل چلے

اس کا در پردہ مطلب بھی یہی نصیحت ہے کہ طفل کے نقشِ قدم پر چلو۔ اگر شہسواری کے شوق میں گھوڑے پر چڑھ گئے تو ہم تمہارے گرنے اور ہاتھ پاؤں تڑوانے کے ذمے دار نہ ہوں گے۔

☆☆☆

شیخ سعدیؒ سے بڑا دانا کون ہوگا۔ انہوں نے اپنی حکایات میں مشورہ دیا ہے اگر خواہی سلامت بر کنار است'' یعنی اگر ڈوبنا مقصود نہیں تو پانی میں مت اُترو ہم نے لوگ سفینوں میں تو ڈوبتے دیکھے ہیں لیکن خشکی پر کھڑا کوئی آدمی آج تک نہیں ڈوبا ہوگا۔ اگر آپ امتحان میں فیل نہیں ہونا چاہتے تو اس کا شرطیہ نسخہ ہے کہ پڑھیں ہی نہیں۔ الیکشن میں ضمانت ضبط نہیں کرانا چاہتے تو الیکشن میں کھڑے ہی نہ ہوں اور آپ کو اپنے بال بچوں کے مستقبل کی فکر ہے۔ ان کی فیسوں اور بیماریوں اور آوارگیوں اور پڑھ کر نوکریوں کی تلاش کے خیال سے وحشت ہوتی ہے تو بچے ہی نہ پیدا کریں بلکہ بچہ پیدا کرنے کی مشین ہی گھر میں نہ لائیں۔ ان سب امور میں ہمارا مفت اور طبی مشورہ ہے کہ علاج سے پرہیز بہتر ہے۔

☆☆☆

پرہیز علاج سے بہتر ہے

پچھلے دنوں ہم بیمار ہوئے۔ کیوں ہوئے؟ کیسے ہوئے؟ کس سے پوچھ کر ہوئے؟ اس کا جواب ہم نہیں دے سکتے۔ اتنا کہہ سکتے ہیں کہ ہم بہت شرمندہ ہیں۔ ہم سے بہت غلطی ہوئی اور آئندہ اس کا اعادہ نہیں کریں گے۔ آئندہ ہم بیمار ہوں تو جو چور کی سزا وہ ہماری سزا۔ اور چور کی سزا جو فی زمانہ ہے' وہ سب کو معلوم ہے۔ اول تو پکڑا نہیں جاتا۔ پکڑا جائے تو بخوبی چھوٹ جاتا ہے۔ بشرطیکہ تھانیدار اچھا ہو۔ اور تھانیدار اچھا نہ ہو تو وکیل اچھا ہو۔

مدعی لاکھ برا چاہے پہ کیا ہوتا ہے

☆☆

ہم صلح کل آدمی ہیں۔ یونہی ذرا منہ پر سوجن سی ہوگئی تھی۔ وہ بھی کچھ زیادہ نہیں۔ اتنی سوجن تو کسی ملزم بلکہ بے گناہ کے تھانیدار کا ایک تھپڑ کھانے سے ہوجاتی ہے۔ ہمارے دوست ہمیں ایک حکیم حاذق کے پاس لے گئے۔ انہوں نے کہا بھئی ڈاکٹری کے چکر میں نہ پڑنا۔ اسبغول استعمال کرو۔ ہم نے آکر اسبغول پانی میں بھگویا اور پلٹس کی طرح منہ پر باندھ لی۔ دو چار دن میں کوئی فائدہ نہ ہوا تو پھر حکیم صاحب کے پاس گئے۔ بولے یہ کیا باندھ رکھا ہے۔ ہم نے کہا آپ کے حسب ہدایت اسبغول ہے۔

بولے۔ ارے۔ (پورا القاب ہم درج نہیں کرتے تاکہ ہماری دل آزاری نہ ہو) میں نے اسبغول کھانے کو کہا تھا لگانے کو نہیں۔ تمہارا قبض دور ہوتا تو یہ سوجن بھی چلی گئی ہوتی۔ اب لکھو۔ ہینگ اور پھٹکری ہم وزن۔ دن میں دو بار۔ ہم نے کہا کس مقدار میں کھائیں۔ فرمایا کھائیں نہیں لگائیں۔ لیپ کریں۔ ضماد فرمائیں اور پرہیز کا خاص خیال رکھیں۔ کوئی کھٹی چیز نہ کھائیں اور کوئی میٹھی چیز نہ کھائیں۔ تاکید ہے۔ ہم نے کہا انگور تو کھا سکتے ہیں؟ سوال بے ضرر تھا لیکن بہت ناراض ہوئے۔

☆☆

خیر ہم نے دوا کے ساتھ پرہیز شروع کر دیا حتیٰ کہ کھٹی ڈکار لینے اور کسی کو میٹھی میٹھی نظروں سے دیکھنے سے بھی خود کو منع کر دیا۔ لیکن کچھ فائدہ نہ ہوا۔ ہمارا اشارہ اپنی طرف ہے۔ حکیم صاحب کو تو ہماری بیماری سے معتدبہ فائدہ ہوا۔ وہ افراطِ زر کے حوالے سے کسی سے دس سے کم کا نوٹ ہی نہ لیتے تھے۔

☆☆

یہ دوا ضرور کارگر ہوتی لیکن ہمارے ایک دوست ہمیں ایک ڈاکٹر صاحب کے پاس لے گئے۔ ہم نے کہا۔ ''ہم آپ سے ایک مشورہ کرنا چاہتے ہیں''۔

بولے ''کرو مشورہ۔ مشورے کی فیس دس روپے ہوگی''۔

ہم نے کہا۔ ''ہمیں کسی اچھے ڈاکٹر کا پتا بتائیے جو ہمارا علاج کر سکے''۔

انہوں نے دس روپے جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔ ''میں خود اچھا ڈاکٹر ہوں بلکہ تعلی نہ سمجھو تو بے مثل ڈاکٹر ہوں اور لالچی بھی نہیں ہوں۔ یہ فیس تو خیر مشورے کی تھی۔ اب میں سوائے علاج کی فیس اور دواؤں کی قیمت اور خرچہ اشتہارات پیکنگ اور ڈاک خرچ کے تم سے کچھ نہ لوں گا۔ درویش آدمی ہوں۔ ڈیفنس سوسائٹی میں دو ہزار گز کے بنگلے پر پڑا ہوں۔ یہ دوا لو مسلسل استعمال کرو انشاء اللہ تندرست ہو جاؤ گے''۔

ہم نے کہا۔ ’’دو سال میں؟‘‘

بولے۔ ’’ہاں یہ کوئی سنگین بیماری نہیں ہے۔ معمولی سوجن ہے۔ پرہیز البتہ ضروری ہے۔ نمک اور مرچ سے مکمل پرہیز۔ آلو مت کھاؤ۔ انڈا مت کھاؤ۔‘‘

ہم نے کہا۔ ’’جی اچھا۔‘‘

☆☆

چند دن میں اس علاج سے ہمارا جی بھر گیا اور ڈاکٹر صاحب کی جیب۔ اب ایک اور مہربان ملے وہ ہمیں ایک عاملِ کامل کے پاس لے گئے۔ انہوں نے چاند کی چودھویں رات کو الو کے گھونسلے سے بیٹ لانے کو کہا اور ایک زندہ سانڈہ ہماری جیب میں ڈالنے کی کوشش کی کیونکہ وید یعنی آیورویدک علاج بھی کرتے تھے۔ ہم وہاں سے چل دیے۔ معلوم ہوا کہ ایک صاحب پانی سے علاج کرتے ہیں۔ ہندی میں اسے جل چکستا کہتے ہیں۔ بہت سادہ علاج ہے۔ مریض کو گردن سے پکڑ کر سات منٹ تک تالاب میں غوطہ دیا جاتا ہے۔ اور مرض رفع ہو جاتا ہے۔ اگر اس غوطے سے مریض زندہ برآمد ہو تو۔ ہم موت سے نہیں ڈرتے۔ لیکن پانی سے ڈرتے ہیں لہٰذا اس سے بھی کنارا کیا۔ بولے۔

’’اچھا علاج مت کرواؤ۔ پرہیز سنتے جاؤ۔ پھیکی چیز کوئی نہ کھانا۔ وہ تمہارے لیے مضر رہے گی۔ دال منع اور گوشت منع اور سبزی تو بالکل ہی منع۔‘‘

☆☆

اپنی بیماری کی حکایت کو ہم مختصر کرتے۔ ہومیوپیتھی کرتے۔ لیکن میٹھا منع تھا۔ کھٹا بھی منع تھا۔ نمک مرچ بھی ہمارے لیے مضر پائے گئے حتیٰ کہ پھیکی چیزوں کی بھی ممانعت ہو گئی۔ اب صرف پینے کو پانی اور کھانے کو ہوا رہ گئی تھی۔ یہ حال دیکھا تو ہم میں بیماری کی تاب نہ رہی۔ ناچار تندرست ہو گئے۔ مرتا کیا نہ کرتا۔

☆☆

حکیم اور ڈاکٹر کچھ بھی کہیں۔ ہماری ناقص رائے میں علاج پرہیز سے بہتر ہے۔ اکثر اوقات علاج پر کم۔ پرہیز پر خرچ بھی زیادہ آتا ہے۔ کبھی آپ نے سوچا کہ لوگ پرہیز کرنے لگیں تو اس کے کتنے ہولناک نتائج برآمد ہوں۔ نہ ڈاکٹر، نہ حکیم نہ وید، نہ عامل کامل۔ نہ اسپتال۔ نہ مطب نہ چین ہیلتھ سینٹر، نہ انڈونیشیا دواخانے، نہ فقیر کی چٹکی نہ جوگی کا عطیہ، نہ دوا ساز کمپنیاں، نہ جوشاندے خیساندے نہ نیولے نہ سانپ، نہ سانڈے نہ چھپکلیاں۔ اس وقت دنیا کی آبادی کو دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ ایک بیمار ایک، معالج۔ ایک چھوٹی سی اقلیت تندرستوں کی بھی ہے۔ لیکن وہ چنداں قابل لحاظ نہیں۔ اگر آدھی آبادی پرہیز کی بدولت بھوکوں مرتی ہے۔ معالج اور دوا ساز وغیرہ تو کون سی ملک اور قوم کی خدمت ہوئی۔ یہ ہو تو میڈیکل سائنس کیسے ترقی کرے۔ نہ صاحب نہ۔

(روزنامہ امروز لاہور۔ ۷۶۔۱۱۔۷)

☆☆☆

بیان پالتو جانوروں کا

بھلا ایسا بھی کوئی گھر ہے جس میں ایک نہ ایک پالتو جانور نہ ہو۔ گائے نہیں تو بھینس۔ بھیڑ نہیں تو بکری۔ کتا نہیں تو بلّی۔ گھوڑا نہیں تو گدھا۔ جانور پالنا بڑی اچھی بات ہے۔ یہ صرف انسان کا خاصہ ہے۔ آپ نے یہ کبھی نہ دیکھا ہوگا کہ کسی طوطے نے خرگوش پالا ہو۔ کسی مرغی نے کوئی بلّی پالی ہو، یا کسی گدھے نے کوئی گھوڑا پالا ہو۔ گدھا بظاہر کیسا بھی نظر آئے، ایسا گدھا کبھی نہیں ہوتا۔

پالتو جانوروں کی چار قسمیں ہیں:

پہلی قسم: دودھ والے جانور، مثلاً گائے، بکری وغیرہ۔

دوسری قسم: دودھ پینے والے جانور مثلاً بلّی۔ کبھی سامنے کبھی چوری چھپے۔

تیسری قسم: جو نہ دُودھ دیتے ہیں نہ دودھ پیتے ہیں۔ مثلاً مرغی مثلاً کبوتر۔ مثلاً طوطا۔

چوتھی قسم ہم بھول گئے ہیں لہٰذا اسے نظر انداز کرتے ہیں اور تھوڑا تھوڑا حال ان جانوروں کا لکھتے ہیں۔

بھینس

یہ بہت مشہور جانور ہے۔ قد میں عقل سے تھوڑا بڑا ہوتا ہے۔ چوپایوں میں یہ واحد جانور ہے کہ موسیقی سے ذوق رکھتا ہے۔ اسی لیے لوگ اس کے آگے بین بجاتے ہیں۔

کسی اور جانور کے آگے نہیں بجاتے۔

بھینس دوُدھ دیتی ہے لیکن وہ کافی نہیں ہوتا۔ باقی گوالا (دُودھ والا) دیتا ہے اور دونوں کے باہمی تعاون سے ہم شہریوں کا کام چلتا ہے۔ تعاون اچھی چیز ہے لیکن دودھ کو چھان لینا چاہیے تاکہ مینڈک نکل جائیں۔

بھینس کا گھی بھی ہوتا ہے۔ بازار میں ہر جگہ ملتا ہے۔ آلوؤں، چربی اور وٹامن سے بھرپور۔ نشانی اس کی یہ ہے کہ پیپے پر بھینس کی تصویر بنی ہوتی ہے۔ اس سے زیادہ تفصیل میں نہ جانا چاہیے۔

آج کل کی بھینسیں انڈے نہیں دیتیں۔ مرزا غالبؔ کے زمانے کی بھینسیں دیتی تھیں۔ حکیم لوگ پہلے روغنِ گلُ بھینس کے انڈے سے نکالا کرتے تھے۔ پھر دوا جتنی ہے کلُ بھی نکال لیا کرتے تھے۔ بہت سے امراض کے لیے مفید ثابت ہوتی تھی۔

گائے

رَب کا شکر ادا کر بھائی ☆ جس نے ہماری گائے بنائی

یہ شعر مولوی اسمٰعیل میرٹھی کا ہے۔ شیخ سعدیؒ وغیرہ کا نہیں یہ بھی خوب جانور ہے۔ دودھ کم دیتی ہے۔ عزت زیادہ کرواتی ہے۔ پُرانے خیال کے ہندو اسے ماتا جی کہہ کر پکارتے ہیں۔ ویسے بیلوں سے بھی اس کا یہی رشتہ ہوتا ہے۔

صحیح الخیال ہندو گائے کا دودھ پیتے ہیں۔ اس کے گوبر سے چوکا لیپتے ہیں لیکن اس کا کاٹنا اور کھانا پاپ سمجھتے ہیں۔ ان کے عقیدے میں جو گائے کو کاٹتا ہے اور کھاتا ہے۔ سیدھا نرک میں جاتا ہے، راستے میں کہیں دم نہیں لیتا۔ یہی وجہ ہے کہ گائے دودھ دینا بند کر دے تو ہندو اسے قصاب کے ہاتھ بیچ دیتے ہیں۔ قصاب مسلمان ہوتا ہے اسے ذبح کرتا ہے اور دوسرے مسلمانوں کو کھلاتا ہے تو یہ سارے نرک میں جاتے ہیں۔ بیچنے والے کو روحانی تسکین ہوتی ہے، پیسے الگ ملتے ہیں۔

جن گائیوں کو قصاب قبول نہ کریں انہیں گؤشالاؤں میں رکھا جاتا ہے۔ جہاں وہ بھوکی رہ کر تپسیا کرتی ہیں اور کوؤں کے ٹھونگے کھاتی پرلوک سِدھارتی ہیں۔ غیر ملکی سیاح ان کے فوٹو کھینچتے ہیں۔ کتابوں میں چھاپتے ہیں۔ کھالیں برآمد کی جاتی ہیں۔ زرمبادلہ کمایا جاتا ہے۔

شاستروں میں لکھا ہے کہ دنیا گائے کے سینگوں پر قائم ہے۔ گائے خود کس چیز پر کھڑی ہے۔ اس کا گوبر کہاں گرتا ہے اور پیشاب کہاں جاتا ہے۔ یہ تفصیلات شاستروں میں نہیں لکھیں۔

بکری

گرچہ چھوٹی ہے ذات بکری کی، لیکن دودھ یہ بھی دیتی ہے۔ عام طور پر صرف دودھ دیتی ہے لیکن زیادہ مجبور کریں تو کچھ مینگنیاں بھی ڈال دیتی ہے۔

جن بکریوں کو شہرت عام اور بقائے دوام کے دربار میں جگہ ملی ہے ان میں ایک گاندھی جی کی بکری تھی اور ایک اخفش نامی بزرگ کی۔ روایت ہے کہ وہ بکری نہیں بکرا تھا، معقول صورت۔ یہ جو شاعری میں اوزان اور بحروں کی بدعت ہے یہ اخفش صاحب ہی سے منسوب کی جاتی ہے۔ بیٹھے فاعلاتن فاعلات کیا کرتے تھے۔ جہاں شک ہو تصدیق کے لیے بکرے سے پوچھتے تھے کہ کیوں حضرت ٹھیک ہے نا؟ وہ بکرا اللہ اسے جنت میں یعنی جنت والوں کے پیٹ میں جگہ دے، سر ہلا کر ان کی بات پر صاد کر دیتا تھا۔ اس بکرے کی نسل بہت پھیلی، پاکستان میں بھی پائی جاتی ہے۔ سوتے جاگتے اس کے منہ سے یس سر، یس سر، جی حضور، جی جناب، بجا فرمایا وغیرہ نکلتا رہتا اسے بات سننے اور سمجھنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

☆☆☆

ایک سپاسنامہ ایک بے لوث کارکن کی طرف سے

جناب والا۔ پاکستان کے بے لوث کارکنوں کی جماعت انجمن بے لوث کارکنان پاکستان (رجسٹرڈ) تہ دل سے جنابِ والا کا خیرمقدم کرتی ہے۔ جناب والا۔ اس وقت ضرورت اس امر کی ہے کہ تمام محب وطن پاکستانی مل کر حکومت کے ہاتھ مضبوط کریں۔ چنانچہ انجمن ہذا بھی خلوص دل سے موجودہ حکومت کے ہاتھ اسی طرح مضبوط کرنے کو تیار ہے۔ جس طرح پیش ازیں صدر ایوب کے ہاتھ مضبوط کرتی رہی ہے۔ صدر یحیٰی کے ہاتھ مضبوط کرتی رہی ہے۔ بلکہ ہر حکومت کے ہاتھ مضبوط کرتی رہتی ہے۔

جناب والا! ہماری انجمن کی ایک خصوصیت حکومت کے ہاتھ مضبوط کرنے کے علاوہ میدان میں کود پڑنا ہے۔ چنانچہ آج بھی ہم اپنے محبوب صدر کے ادنیٰ اشارے پر میدان میں کود پڑنے کو تیار ہیں۔ بشرطیکہ میدان میں یہاں سے وہاں تک روئی کے گدے، نہالچے اور غالیچے بچھا دیے جائیں۔ ان کے بغیر میدان میں کودنا گزند کا باعث ہوسکتا ہے۔ چوٹ آسکتی ہے۔ جو ملک کے موجودہ حالات کے پیش نظر مناسب نہیں ہے۔

جناب والا۔ انجمن ہذا یعنی انجمن بے لوث کارکنان پاکستان (رجسٹرڈ) کے دروازے سب پر کھلے ہیں کیونکہ اس کے اندر کچھ نہیں ہے۔ پہلے تھا۔ لیکن اس کو کارکنانِ مذکور ہاتھوں ہاتھ اٹھالے گئے۔ اب فقط دروازے کا سائن بورڈ باقی ہے جسے انجمن ہذا بہ خوشی قوم کی نذر کرنے کو تیار ہے۔ یہ مضبوط شیشم کی لکڑی کا بنا ہوا ہے۔ اس پر دھوبی کپڑے پٹخ سکتے ہیں' جو دھوبی نہیں وہ سر پٹخ سکتے ہیں۔ غسال مردے نہلا سکتے ہیں بلکہ مردے اپنی مدد آپ کے اصول کے تحت آپ نہا سکتے ہیں۔

جناب والا۔ انجمن ہذا کے سب ہی کارکنان پرلے درجے کے بے لوث کارکن ہیں۔ ان سے کوئی ان کی خدمت کے صلے کی بات کرے تو مارنے کو دوڑتے ہیں۔ یہ خاکسار میاں فقیر محمد سیکریٹری جنرل' انجمن ہذا بالخصوص فقیر منش آدمی ہے۔ اسے آپ سے کوئی خواہش نہیں ہے۔ سوائے عہدے کی خواہش کے' اور کسی قسم کا لالچ نہیں' سوائے روپے کے لالچ کے۔ گزشتہ حکومتوں نے خاکسار کو خریدنے کی بہت کوشش کی لیکن نہیں خرید سکے۔ پہلے وزارت پیش کی گئی۔ خاکسار نے اس پر لات ماردی۔ پھر سفارت پیش کی گئی۔ خاکسار نے اس پر بھی لعنت ماردی۔ خاکسار دولت پر لات مار چکا ہے۔ ثروت پر لات مار چکا ہے۔ شہرت پر لات مار چکا ہے۔ اور بھی کئی چیزوں پر لات مار چکا ہے' جو اس وقت یاد نہیں۔ افسوس اب یہ لات اس قابل نہیں رہ گئی کہ مزید کسی چیز پر ماری جاسکے۔ لات مارنے کی عادت سے مجبور ہو کر اس خاکسار نے ایک کتے کے بھی لات ماردی تھی۔ وہ محاورے نہیں سمجھتا تھا۔ اس نے اس جذبہ ایثار کی قدر نہ کی۔ جواب میں دانت مار دیے۔ آدمیت سے بعید حرکت کی۔

جناب والا۔ جیسا کہ خاکسار نے عرض کیا' خاکسار کو آپ سے یا حکومت سے کسی قسم کی غرض نہیں ہے۔ تاہم خاکسار کو شہر کی مین مارکیٹ میں جو زیرِ تعمیر ہے۔ کونے والی بڑی دکان الاٹ کردی جائے تو خاکسار کا قوم کی بے لوث خدمت کا جذبہ روز افزوں

ہوسکتا ہے۔ اس لیے کہ انجمن ہذا کی عہدے داری کے علاوہ جسے خاکسار ذاتی اغراض کے لیے استعمال کرنا جرم سمجھتا ہے۔ خاکسار کا چھوٹا سا ذاتی کاروبار بھی فقیرا سٹون ورکس کے نام سے ہے۔ ہمارے محبوب صدر نے پچھلے دنوں فرمایا ہے کہ ہمیں محنت کرنی چاہیے۔ پیٹ پر پتھر باندھ کر بھی محنت کرنی چاہیے۔ لہٰذا خاکسار کی فرم نے لوگوں کو پیٹ پر باندھنے کے لیے پتھر بارعایت نرخوں پر سپلائی کرنے شروع کردیے ہیں۔ یہ پتھر منگھوپیر کی پہاڑی کے ہیں لہٰذا مضبوط ہونے کے علاوہ روحانیت سے بھرپور اور خیر و برکت سے معمور ہیں۔ یہ پتھر پیٹ پر باندھنے کے علاوہ اور بھی کئی کام آسکتے ہیں۔ محبوب لوگ ان سے سنگ آستاں بنواتے ہیں اور اس پر عاشق لوگوں سے جبیں گھسواتے ہیں۔ ناک رگڑواتے ہیں۔ ناک اور جبیں کے علاوہ ان پر ہلدی اور مرچ بھی بہ خوبی پیس سکتے ہیں۔ خودکشی کے لیے بھی ہمارے ہاں کے پتھر آزمودہ ہیں۔ جو کوئی ان کو اپنے ساتھ باندھ کر دریا میں کودا پھر پانی کی سطح پر نہ ابھرا۔ ظالم سماج ہاتھ ملتا ہی رہ گیا۔ خودکشی کرنے والوں کے بے شمار تصدیقی سرٹیفکیٹ ہمارے پاس موجود ہیں کہ ہم کو ایک ہی پتھر سے فائدہ ہوا۔ قید حیات و بند غم سے نجات مل گئی۔ اب چند پتھر فلاں فلاں حضرات کو ہماری طرف سے بھیج دیجیے۔ دکان سے دریا کے پل تک پتھر پہنچانے کا خرچ ہم اپنے پلے سے دیتے ہیں۔ گاہک سے چارج نہیں کرتے۔

☆☆

جناب والا۔ جانے کس شاعر نے کہا ہے لیکن خوب کہا ہے کہ اس رزق سے موت اچھی' جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی۔ واقعی ساری خرابیوں کی جڑ رزق یعنی غلہ وغیرہ ہے۔ اس وقت ہماری قوم کو غلے کی اتنی ضرورت نہیں جتنی کہ پتھروں کی ہے۔ ایک چھوٹی سی مثال ہے۔ ہمارے ایک بزرگ جن کا نام میں اس وقت بھول رہا ہوں' دانہ گندم کی وجہ سے جنت سے نکالے گئے۔ آج تک کوئی پتھروں کی وجہ سے نہیں نکالا

گیا۔ شاعر مذکور نے جو رزق سے موت کو بہتر بتایا ہے تو اس کی وجہ ہے مرنے والے کے مزار پر ہماری دکان کے مضبوط اور خوبصورت پتھر لگائے جا سکتے ہیں، کسی زندہ آدمی کے مزار پر نہیں۔ جس نے ایک بار اپنی قبر پر ہمارے ہاں سے پتھر کی تختی لگوائی ہمیشہ کے لیے ہمارا گرویدہ ہو گیا۔ جناب والا! ایک لوح مع قطعہ تاریخ ہم آپ کے نذر بھی کرتے ہیں۔ وقت آنے پر کام آئے گا۔ گر قبول افتد۔

☆☆☆

آ گئے قوم کے بے لوث
خدمت کرنیوالے

جوں جوں الیکشن قریب آ رہے ہیں لوگوں میں بے لوث خدمت کا جذبہ زور پکڑتا جا رہا ہے۔ ہم نے بعض جاننے والوں سے کہا بھی کہ حضرت آپ اپنا گھر بار دیکھیے۔ کاروبار دیکھیے۔ اتنے ایثار کی کیا ضرورت ہے لیکن جواب یہی ملتا ہے کہ ہم قوم کی ناؤ کو منجدھار میں کیسے چھوڑ دیں۔ الیکشن میں کون کون کھڑا ہو رہا ہے فی الحال معلوم نہیں۔ وثوق سے ہم صرف اتنا کہہ سکتے ہیں کہ ہم کھڑے نہیں ہو رہے۔ کم از کم فی الحال ہمارا اس قسم کا کوئی ارادہ نہیں کیونکہ ہم نام و نمود سے کوسوں دور بھاگتے ہیں۔ البتہ اگر دوسرے امیدوار موزوں نہ ہوئے جس کا ہمیں اندیشہ ہے تو شاید پبلک کے اصرار سے مجبور ہو کر قوم کی خدمت اور نظریہ پاکستان کی حفاظت کے لیے میدان میں آنا ہی پڑے کیونکہ بے جا ضد ہماری طبیعت میں نہیں۔ ہماری ذات اور خدمت محتاج تعارف نہیں اور ہمیں اعتراف ہے کہ ہم ہر طرح سے آپ کے قیمتی ووٹ کے مستحق بلکہ حقدار ہیں۔ تاہم اس سلسلے میں ہمارے دوسرے اعلان کا انتظار کیا جائے جو جلد ہی اردو میں کیا جائے گا۔

☆☆

ہمارے محترم بزرگ ڈاکٹر ایم اے خان زادہ نے البتہ ابھی سے اپنی انتخابی مہم کا آغاز کر دیا ہے۔ اور ہمارے پاس ان کا ایک کتابچہ پہنچا ہے جس کا عنوان ہے ''قرآن کریم کی ایک ہزار آیات'' ڈاکٹر صاحب جامع کمالات آدمی ہیں۔ عام ڈاکٹروں کی طرح نہیں کہ صرف آدمیوں کا علاج کرتے ہیں۔ ان کا فیض عام ہے۔ انشاء اللہ شفایاب ہو کر واپس آئے گا۔ پہلے تو خود کو فقط ڈاکٹر ایم اے خان زادہ ہی لکھا کرتے تھے۔ پھر شاید کوئی پرانا شجرہ اپنا یا کسی اور کا ان کے ہاتھ آ گیا اور یہ خود کو نواب لکھنے لگے۔ اب کے سرورق پر جگہ زیادہ خالی پائی تو اپنی ذات پر سے تصوف و سلوک کے کچھ پردے بھی اٹھا دیے ہیں اور ہم ان کا نام یوں لکھا پاتے ہیں۔

''ڈاکٹر نواب ایم اے خان زادہ حنفی نقش بندی بریلوی۔'' اتنی نسبتیں مشخص ہونے کے باوجود ان کی وجہ شہرت کچھ اور ہے۔ آپ ہمارے کالموں کی رونق ملکہ تغزل، شعلہ سخن، موجد صوت واحد مس بلبل کے نفس ناطقہ یعنی وزیر اعظم اور وزیر خارجہ ہیں۔ چونکہ اتنے بڑے منصب کے لیے فی زمانہ قریبی عزیز ہونا بھی ضروری ہوتا ہے۔ لہذا واضح ہو کہ یہ مس صاحبہ موصوفہ کے والد گرامی بھی ہیں۔

☆☆

یہ بات پشتے تک محدود نہیں، بعض اور لوگوں میں بھی پائی جاتی ہے کہ جب قصدِ خوں کو آئیں تو پہلے پکار دیں۔ سرورق پر جس طرح پرانی کتابوں میں ''حسب فرمائش، جے۔ ایس سنت سنگھ'' وغیرہ لکھا رہتا ہے۔ یہاں بھی واضح کیا گیا ہے کہ یہ کتاب مستطاب، بعونِ صناعِ مکین و مکان جس کی بنیاد پر ایک اسلامی مملکت کا دستور تیار کیا جا سکتا ہے۔ ملکہ تغزل مس بلبل، امیدوار قومی اسمبلی پاکستان الیکشن کی خصوصی درخواست پر لکھی گئی ہے۔ ورق الٹیے تو معلوم ہو گا کہ خان زادہ صاحب سے لوگوں نے

کہا تھا کہ ''آپ ۱۹۱۴ء سے سیاست کے میدان میں آ چکے ہیں، خود کھڑے ہو جائیے کیونکہ آپ کی خدمات اظہر من الشمس ہیں۔ لیکن یہ نہ مانے اور اپنی جگہ بہ قول خود اپنی سب سے ذہین اور فہیم اولاد مسِ بلبل کو کھڑا کیا۔ قارئین کرام ہم سے ڈاکٹر صاحب موصوف کی خدمات کے بارے میں کچھ نہ پوچھیں۔ کیونکہ اظہر من الشمس ہونے کی وجہ ہم خود نہیں جانتے۔ اتنی تیز روشنی میں آنکھیں چندھیا جانے کے باعث کوئی کچھ دیکھ نہیں سکتا۔ ہاں ڈاکٹر صاحب ہی کے الفاظ میں ان کو یہ مژدہ دیتے ہیں کہ ''میں وعدہ کرتا ہوں کہ اپنی تمام عمر مسِ بلبل کو مشورہ دیتا رہوں گا اور جب کبھی قربانی کی ضرورت پیش آئے، وہ مجھے سب سے آگے پائیں گی۔'' چونکہ لوگ قربانی کا نام سنتے ہی کھال لینے پہنچ جاتے ہیں۔ لہذا ہم واضح کر دیں کہ ڈاکٹر صاحب نے یہ لفظ یہاں استعارتاً استعمال کیا ہے۔

☆☆

دستور بنانا خصوصاً اسلامی دستور بنانا ہمارے ہاں گھریلو دستکاری بن چکا ہے۔ جہاں دو آدمی بیٹھ گئے، اسلامی دستور بنانا شروع کر دیا۔ صدر مملکت کا اعلان سنتے ہی ڈاکٹر صاحب اور مسِ بلبل نے ہمیں اور ہم ایسے ہی دو ایک اور صاحبانِ علم و فضل کو دعوت نامہ بھیجا تھا کہ اب کی اتوار ہمارے ہاں آئیے۔ کھانا ہو گا اور کھانے کے بعد پاکستان کا دستور بنا کر صدر مملکت کی خدمت میں پیش کر دیا جائے گا۔ افسوس کہ ہم نہ جا سکے اور دستور بننے میں اتنی دیر ہو گئی کہ جس کے لیے ہم قوم کے آگے شرمندہ ہیں۔ ہم گھنٹے دو گھنٹے کے لیے چلے جاتے اور دستور بنا آتے تو ڈاکٹر صاحب کو یہ کتابچہ نہ چھاپنا پڑتا جس کی پیشانی پر لکھا ہے کہ مقصد اس کا بھی ایک اسلامی مملکت کا دستور تیار کرنا ہے۔

☆☆

اس الیکشن نامے کا نام ہم بتا چکے ہیں۔ ''قرآن کریم کی ایک ہزار آیات۔'' انداز

اس کا یہ ہے کہ پہلے آیت۔ پھر ترجمہ۔ پھر توضیح۔ توضیح میں لامحالہ مس بلبل کی زندگی اور خدمات اور عزائم کے حوالے اور اشارے آ گئے ہیں۔ مثلاً آیت تو یہ ہے۔ (ترجمہ) اور جس نے جہاد کیا' خدا کی راہ میں' پھر قتل ہو گیا یا غالب آ گیا۔'' توضیح میں یہ بشارت دی گئی ہے۔ کہ مس بلبل اپنی بزمِ نعت و ادب کی جس کی وہ بانی اور مستقل صدر ہیں۔ سارے اسلامی ملکوں میں شاخیں قائم کریں گی۔ پھر آیت ہے (ترجمہ) ''اور قتل کیا داؤد نے جالوت کو اور دیا اللہ تعالیٰ نے اس کو ملک'' توضیح میں ارشاد ہوتا ہے کہ'' صدر ایوب کو نالائق کہنے والا خود نالائق ہے۔'' ایسے ہی ایک آیت کی توضیح میں ڈاکٹر صاحب نے لکھا کہ وزیر خارجہ نے یک طرفہ معاملہ اقوام متحدہ میں پیش کر کے غلطی کی۔ مس بلبل کو ''انتخاب مل گیا'' تو یہ کشمیر اور حیدر آباد دونوں کے معاملات اقوام متحدہ میں ایک ساتھ پیش کریں گی۔ ممکن ہے کہ کچھ لوگ کہیں کہ قومی اسمبلی کا ممبر؟ ہوتا ہے وہیں نشستن' گفتن اور برخاستن کر کے گھر چلا آتا ہے۔ اقوام متحدہ کے ذکر کا کیا محل ہے؟ ایسے ہی کم فہم مگس کے باغ میں جانے پر معترض ہوا کرتے ہیں کہ اس سے پروانے کے خون کا کیا تعلق ہے۔ بات سیدھی صاف ہے۔ مس بلبل اسمبلی کی ممبر بن گئیں تو ہم پاکستان کے تین کروڑ شاعروں کی طرف سے مطالبہ کریں گے کہ ان کو وزیر یعنی وزیر خارجہ بنایا جائے۔ اس لیے نہیں کہ ہم چاہتے ہیں۔ یہ ملک کے باہر ہی رہیں' کبھی یہاں نہ آئیں بلکہ اس لیے کہ یہی ہیں جو اقوام متحدہ میں کشمیر اور حیدر آباد کے مسائل کو منظوم کر کے پیش کر سکتی ہیں۔ اتنی لمبی لمبی نظمیں سننے کی کس میں تاب ہے۔ اقوام متحدہ کہے گی کہ بابا جاؤ کشمیر لے جاؤ اور حیدر آباد بھی لے جاؤ اور ہاں یہ جونا گڑھ بھی رکھا ہے۔ اپنے سوٹ کیس میں ایک طرف کو اسے بھی ڈال لو۔

☆☆

ڈاکٹر خان زادہ صاحب کا یہ پمفلٹ ''پسر اگر نہ تواند پدر تمام کند'' کی تعریف میں

آتا ہے کیونکہ کچھ دنوں پہلے خود مس صاحبہ نے جو اپنا منشورِ انتخاب نظم میں چھاپا تھا۔ اس میں فقط یہ لکھا تھا کہ۔

ے میں چاہتی ہوں قومی اسمبلی میں پہنچ جاؤں
نغموں سے ساری سوئی ہوئی قوم کو جگاؤں

ارادہ یہ مبارک ہے لیکن مس بلبل نے ذہین اور فہیم ہوتے ہوئے بھی یہ شاید نہیں سوچا کہ کسی کو کچی نیند جگا دیا جائے اور وہ بھی نغموں سے یعنی غزلیں وغیرہ گا کر تو وہ کتنا شور مچاتا ہے۔ فیل مچاتا ہے۔ جگانے والے کی جان کو آ جاتا ہے۔ اسی لیے رات کے وقت ریڈیو پاکستان والے اعلان کرتے ہیں کہ اپنا ریڈیو آہستہ بجائیے۔ جب ایک آدمی فساد پھیلا سکتا ہے تو پوری قوم کو جگانے کا نتیجہ آپ خود سوچ سکتے ہیں۔ اور قوم بھی کون سی۔ پاکستانی قوم؟

☆☆☆

حکیم بقل بطورا

آج صبح ہم نے اخبار کھولا تو اس میں کئی خوشی کی خبریں نظر آئیں۔ ایک تو یہ کہ کراچی کے اسپتالوں کو کتّے کے کاٹے سے بچاؤ کی دوا یعنی سیرم نومبر سے ملنے لگے گی۔ دوسری یہ کہ کراچی کارپوریشن نے پبلک کے پُرزور اصرار پر وسط ستمبر سے شہر کی صفائی کی مہم شروع کرنے کا مصمم ارادہ کرلیا ہے کیونکہ اکتوبر میں دس سالہ ترقیات کے جشن منائے جانے ہیں۔

ایک اخبار میں کے ڈی اے کی سرگرمیوں کے متعلق چار صفحے کا ضمیمہ بھی دیکھا، جس میں کے ڈی اے کے محکمۂ پانی کے انجینئر کا ایک مضمون بھی شامل ہے۔ اس میں پہلی بار یہ انکشاف کیا گیا ہے کہ شہر کی شادابی کے لیے پانی ازبس ضروری چیز ہے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ جو لوگ خود کو کتوں سے کٹوانا چاہتے ہیں، وہ نومبر تک انتظار کرلیں۔ اس کے بعد اپنا شوق جتنا جی چاہے پورا کریں۔ ہمیں یقین ہے کہ اس اعلان کی نقلیں کُتّوں میں بھی تقسیم کردی گئی ہوں گی تاکہ اپنا منہ بند رکھیں۔ دہن سگ بہ اعلان دوختہ بہ۔

کورنگی سے ایک صاحب کتّوں کے لیے ''کُتا گزٹ'' نکالنا چاہتے تھے اور اس کی کثیر الاشاعتی کے بارے میں بڑی اُمیدیں رکھتے تھے، اگر وہ نکل آیا ہو تو یہ اعلان جلی

حروف میں اس میں چھاپ دینا چاہیے، ورنہ ہم اہل شہر کو مشورہ دیں گے کہ آج کا اخبار ہمیشہ اپنے ساتھ رکھا کریں۔ جونہی کوئی کُتا اُن کی طرف لپکے، اُسے ڈانٹ دیں کہ دُر دُر موئے۔ یہ دیکھ اعلان آ گیا ہے کو نومبر تک کاٹنا منع ہے، کیونکہ ابھی دوا نہیں بنی ہے، ٹیلی ویژن پر بھی اس کی تشہیر ضروری ہے کیونکہ بڑے گھروں کے تو کُتے بھی باقاعدگی سے ٹیلی ویژن دیکھتے ہیں۔

اب رہی کراچی کارپوریشن کی صفائی کی مہم۔ کارپوریشن والے سیدھی انگلی یہ اعتراف کیوں نہیں کرلیتے کہ انہیں اس کا خیال ہمارا کالم پڑھ کر آیا ہے اور عشرۂ ترقیات محض بہانا ہے۔ ہم نے لاہور کا ذکر کیا تھا کہ وہاں جابجا کوڑے کے ڈھیروں میں بانس کھڑے کرکے بینر پھیلا دیے گئے ہیں کہ صفائی نصف ایمان ہے۔

تفصیلات پڑھنے پر معلوم ہوا کہ اس مبارک اور ضروری مہم کے لیے کارپوریشن کے ہیلتھ ڈپارٹمنٹ' انجینئرنگ ڈپارٹمنٹ اور باغبانی ڈپارٹمنٹ کو کچی نیند سے جگا کر کہا جائے گا۔

''ہاں تو صاحبو! دکھاؤ ذرا اپنے جوہر۔ ہیلتھ ڈپارٹمنٹ اس سلسلے میں کیا کرے گا۔ اس کا کچھ اشارہ بھی اس اعلان میں ہے۔ وہ یہ کہ لوگوں کو نوٹس دے گا کہ اپنے اپنے گھروں پر سفیدیاں کراؤ، جو نہیں کرائے گا اس کے......وغیرہ وغیرہ۔''

اس سے یہ معلوم ہوا کہ دوسرے محکمے بھی نوٹس دیں گے، لیکن کس بات کے، اس بارے میں ابھی کچھ کہا نہیں جاسکتا۔ ہمیں ڈر ہو گیا ہے کہ ہم نے سواری نیچے کے لیے مانگی تھی، کہیں اُوپر کے لیے نہ مل جائے۔ ہم نماز بخشوانے کی فکر میں ہیں، کارپوریشن روزے ہمارے گلے میں ڈالنے کی سوچ رہی ہے۔ ہم نے پوری خبر کو دوبارہ پڑھا۔ اس میں کہیں اس بات کا اشارہ نہیں کہ لوگ بھی چاہیں تو کارپوریشن کو نوٹس دے سکتے ہیں کہ اُٹھواؤ کوڑے کے ڈھیر۔ کرو صاف نالیاں شہر کی۔

ایک صاحب نے تو ابھی سے یہ فالِ بدزبان سے نکال دی ہے کہ دیکھنا یہ کارپوریشن شہر والوں کو بھنگی بنا کے چھوڑے گی۔

پچھلے دنوں اخبار میں اس قسم کی خبر بھی دیکھی کہ آئندہ ڈاکٹروں اور انجینئروں کو بلدیہ کا چیئرمین مقرر کیا جایا کرے گا۔ ہرچند اس خبر میں یہ ذکر نہیں کہ موجودہ چیئرمین اور وائس چیئرمین وغیرہ کسی اسپتال میں ڈاکٹر لگا دیے جائیں گے۔ تاہم اس تجویز کا ہم خیر مقدم کرتے ہیں۔ آخر اتنے سارے ڈاکٹر کس مرض کی دوا ہیں۔ ان سے کچھ کام تو لینا ہی چاہیے۔ ہمارے ذہن میں کچھ اس قسم کا منظر آتا ہے کہ ہمارے عزیز دوست ڈاکٹر ایم بی ایس خان (محمد باقر بن سلطان خان) بلدیہ کے دفتر میں چیئرمین بنے بیٹھے ہیں۔ ایک ہاتھ میں عوام کے دلوں کی دھڑکنیں سُننے کے لیے اسٹیتھسکوپ ہے اور دوسرے میں تھرمامیٹر...... جس سے اپنا کان کھجا رہے ہیں، اتنے میں ایک اہل کار فائل بغل میں دابے داخل ہوتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نہایت خوش خلقی سے چپراسی کو آرڈر دیتے ہیں کہ دو کپ کونین مکسچر کے بنا کے لاؤ۔

وہ صاحب عذر کرتے ہیں کہ میں ابھی پی کے آیا ہوں، لیکن ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں کہ ایک اور میں کیا حرج ہے۔ مکسچر ہی تو ہے چائے تو نہیں کہ نقصان کرے۔ آپ کو کونین مکسچر پسند نہیں تو فلو مکسچر بھی ہے۔ اچھا تو کیا بات ہے؟"

"جناب پرائمری اسکول چاہیے رنچھوڑ لائن میں، اس کے لیے پیسے منظور کیے جائیں۔"

"کیا علامات ہیں؟"

"جناب بچے ناتعلیم یافتہ ہیں۔"

"ایکسرے کرایا؟"

"جی کس چیز کا؟"

"کس چیز کا؟ اسکول کے بچوں کا"

"جی وہ تو نہیں کرایا، کرا لیں گے۔"

"دیکھیے صاحب۔" ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں۔

"اسکول کے لیے تو ہمارے پاس پیسے نہیں ہیں۔ فی الحال سارے بچوں کو جمع کر کے ایک ایک ٹیکہ ہیضے کا لگا دیجیے۔ بہت دوا ہے ہمارے پاس اور اسکول جہاں بنانا مقصود ہے، وہاں فی الحال ڈی۔ ڈی۔ ٹی چھڑک دیجیے۔"

وہ صاحب دوسری فائل آگے بڑھاتے ہیں۔

"ابدالی روڈ کی حالت بہت خراب ہے۔ لوگ ٹھوکریں کھاتے پھرتے ہیں۔ بعضوں کی تو ٹانگ بھی ٹوٹ جاتی ہے۔"

ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں۔" ہاں، ہاں ابدالی روڈ کی حالت واقعی خراب ہے۔ جا بجا سے فریکچر ہے۔ اُس کا بھی ایکسرے کرانا ضروری ہے۔ فی الحال تو پولٹس کی تہ جما کر پٹی باندھ دی جائے۔"

"جی سڑک کے؟"

"ارے نہیں، زخمی ہونے والوں کے۔"

اس مسند پر ڈاکٹروں کا حق ثابت ہے تو حکیموں کا کیوں نہیں۔ ہمارے مہربان فاضل طب حکیم بقل بطورا صاحب بھی اس کام سے عہدہ برآ ہو سکتے ہیں۔ دفتر میں مسند بچھی ہے۔ آلتی پالتی مارے بیٹھے ہیں۔

جو شخص فائل لے کر اندر آتا ہے، پہلے اس کی نبض دیکھتے ہیں۔ اسے جوشاندے کا پیالہ پیش کرتے ہیں۔ اس کے بعد احوال سُنتے ہیں۔

اہل کار یہاں بھی وہی بات دُہراتا ہے کہ پرائمری اسکول چاہیے اور سڑک مرمّت طلب ہے۔

حکیم صاحب فکر مند ہو کر فرماتے ہیں۔

"جی ہاں، میں نے بلدیہ کے مسائل کا قارورہ دیکھا ہے۔ واقعی بڑی خراب حالت ہے۔ ایسے کیسے کام چلے گا۔ سارے عملے کو جلاب دینا پڑے گا۔"

اب رہا پانی، تو گویا ریسرچ اور تحقیقات کے بعد کے، ڈی، اے کے انجینئروں نے بھی یہ راز پالیا ہے کہ شہر کی شادابی سے پانی کا قریبی تعلق ہے۔ یہ بات ہم نے بھی کہی تھی، لیکن ہم ٹیکنیکل آدمی نہیں ہیں۔ ہمارے پاس اس دعوے کے لیے ثبوت میں شواہد اور دلیلیں نہیں تھیں۔

بہر حال اس اہم انکشاف کے بعد کیا ہم توقع کریں کہ ہماری ٹنکی میں پانی آیا کرے گا۔ اور علامہ اقبال ٹاؤن کے پارک کی طرف توجہ کی جائے گی جس میں کتے لوٹتے ہیں بلکہ اب تو وہ بھی لوٹتے لوٹتے تنگ آ جائیں۔"

☆☆☆

ذکر دروازوں کا، کرسیوں کا اور بوریے کا

آج کل یہ پیشکش سب ہی سیاسی جماعتوں کی طرف سے سُننے میں آ رہی ہے کہ ہمارے دروازے سبھی محبِ وطن لوگوں پر کھلے ہیں۔ بعض جماعتوں نے تو اب محبِ وطن کی شرط بھی اُڑا دی ہے۔ کیونکہ اتنے سارے محبِ وطن لوگ کہاں سے آئیں گے۔ بعض جماعتوں نے کوئی نہ کوئی اصول بھی رکھے تھے۔ ان کی شرط بھی اُڑا دی گئی تاکہ لوگوں کو خواہ مخواہ کسی قدغن یا گھٹن کا احساس نہ ہو۔ سیاسی فلسفوں اور اصطلاحوں کو بھی فی الحال اُٹھا کر طاق پر رکھ دیا گیا ہے کہ لوگ ان دروازوں میں داخل ہوتے ہوئے نہ ہچکچائیں۔ اصل میں یہ زمانہ مقابلے کا ہے۔ لوگ تھوڑے ہیں سیاسی جماعتیں زیادہ ہیں۔ جس طرح بعض مہذّب ملکوں میں آبادی کے ہر پچیس آدمیوں کے پیچھے ایک ڈاکٹر ہے۔ اس طرح ہمارے ہاں ہر پچیس آدمیوں کے پیچھے ایک جماعت ہے یا یوں کہیے ہر جماعت کے پیچھے کم و بیش پچیس آدمی ہیں گویا ہم بھی مہذب ملکوں سے کسی طرح کم نہیں بلکہ پطرس کی طرح تھوڑا سا جی کڑا کر کے یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ ہم بھی مہذب ہیں۔ ہم بھی ترقی یافتہ ہیں۔ الحمدللہ۔

☆☆☆

جس طرح اسکولوں کے دروازوں پر ایک زمانے میں لکھا رہتا تھا۔ ''داخلے جاری ہیں۔'' اکثر جماعتوں کے دروازوں کی پیشانی پر بھی یہی لکھا ہے۔ ''داخلے جاری ہیں۔'' اگرچہ ایک آدھ جماعت نے ندرت بھی دکھائی ہے، داخلے کو خارجے لکھا ہے۔ ''خارجے جاری ہیں۔''

پچھلے دنوں بہت سے لوگ بلکہ نائب صدر اور سکریٹری وغیرہ اس جماعت کے خارجے والے دروازے سے نکلے اور کسی اور جماعت کے ''داخلے جاری ہیں'' والے دروازے میں داخل ہوگئے۔ بعض جماعتیں رضا کاری پر یقین نہیں رکھتیں۔ ان کا کہنا ہے کہ عوام کو اپنے بُرے بھلے کی کیا تمیز ہے۔ وہ لوگوں کو کھینچ کھینچ کر دھکیل دھکیل کر، ہانک ہانک کر ان دروازوں میں داخل کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ بعض دروازوں میں تو آمدورفت دھکّا پیل کو پہنچ گئی ہے۔ دروازوں پر بھی اس کا اثر پڑا ہے اور وہ چوکھٹ سے الگ ہو رہے ہیں۔ ممکن ہے دو ایک ماہ بعد کواڑ بالکل ہی اُتار کر رکھ دیے جائیں۔

اژدہام اور زیادہ ہوا تو کیا عجب خاص الخاص لوگوں کو چھت کے موکھوں سے بھی اندر لٹکانا پڑے۔ پرانی ڈیوڑھیوں، خصوصاً محبوباؤں کے دولت کدوں کے دروازوں پر ایک زمانے میں دربان کھڑے رہا کرتے تھے۔ آنے والوں کی ساری دعائیں عموماً صرف درباں ہو جایا کرتی تھیں۔

غالب جیسے ان کے قدم بھی لیتے تھے کہ ذرا داخلہ مل جائے۔ دربان رکھنے کی یہ رسم آج بھی ہے لیکن ان کا کام آنے والوں کو روکنا نہیں بلکہ یہ ہے کہ کہیں کوئی دوبارہ باہر نہ نکل جائے۔ ان دولت کدوں کو ایک طرح کے چوہے دان کہہ سکتے ہیں کہ چوہا اندر تو باآسانی دندناتا رجز گاتا چلا جاتا ہے۔ بس ذرا باہر نکلنے کی پرابلم ہے۔ ایک زمانے میں پارٹیوں میں آگے پیچھے دونوں طرف دروازے رکھنے کا رواج تھا۔ اس میں بڑی

خرابی ہوتی تھی۔ بعض اوقات ہوا تیز چلتی ہو تو آدمی ادھر سے داخل ہوتا تھا اُدھر سے باہر نکل جاتا تھا۔ ہمارے مرحوم دوست اے ڈی اظہر کے ساتھ یہی ہوا تھا۔ ان دنوں پیپلز پارٹی نئی نئی بنی تھی۔ بہت زیادہ محفوظ اور امن کی جگہ بھی نہ تھی۔ وقت کی سرکار لاٹھی چارج بھی کرتی رہتی تھی۔ بس ایک دن سُنا کہ آپ پیپلز پارٹی میں داخل ہوئے۔ دوسرے دن سُنا کہ خارج ہوگئے۔ جھونکا ہوا کا آیا اور آ کر گزر گیا۔

پس جماعتوں والوں نے سب سے پہلا کام تو یہی کیا کہ عقبی دروازے بند کیے۔ بلکہ مقفل کیے کہ اب یہاں سے کوئی نہیں، کوئی نہیں جائے گا۔ اب ہوا اور آندھی سے کسی خطرے کا وسوسہ بھی نہ رہا۔ بس کھڑکیاں ہوتی تھیں۔ ان سے ہوا آتی رہتی تھی۔ سانس ہی تو لینا ہوتا ہے۔ پھر کچھ لوگ نکلنے کے لیے ان کی سلاخیں اکھاڑنے لگے۔ بعض ان کے پیچھے سے تاک جھانک بلکہ آنے جانے والوں سے ساز باز بھی کرنے لگے۔ پس دانش مند سیاسی جماعتوں نے یہ دریچے بھی بند کیے۔ اب روزن اور روشن دان رہ گئے۔ جب یہ دیکھا کہ اتنی روشنی بھی نقصان دہ ہے۔ بعض لوگوں کی آنکھوں کو نقصان دیتی ہے ان کو بھی بند کیا۔ لکڑی کے دروازوں کی چولیں ڈھیلی ہو جاتی ہیں۔ اور جماعتوں کی بھی۔ اس لیے بعض دور اندیشوں نے چوبی کواڑوں کے بجائے مقناطیسی لوہے کے کواڑ لگا دیے ہیں۔ جو شخص ان کے دروازے کے پاس سے گزرتا ہے، بس ٹھاہ کر کے آن لگتا ہے۔ اور لگتے ہی اس میں سے آواز نکلتی ہے کہ میں گمراہ ہو گیا تھا۔ مجھے تو اب حقیقت کا پتا چلا ہے۔

عمارتوں کا ذکر ہے تو فرنیچر کا بھی کچھ بیان ہو جائے۔ کُرسی آج کل تہذیب کا لازمہ ہے۔ ہر کسی کو کُرسی کی ضرورت ہے اور تلاش ہے۔ کسی گھر کے دروازے میں داخل ہونے سے پہلے پوچھ لیتا ہے کہ وہاں کرسی بھی ملے گی؟ یہ غالب کا زمانہ نہیں کہ لوگ بوریا بچھا کر آنے والوں کا انتظار کرتے تھے اور غالب کے ہاں تو وہ بھی نہ ہوتا

تھا۔ بعض لوگ جب تک اِن کے پاس کُرسی رہتی تھی‘ قیام فرماتے تھے۔ جب کسی ضرورت سے صاحب خانہ کُرسی خالی کرالیتا تھا یا نیچے سے کھینچ لیتا تھا۔ تو فوراً کسی اَور گھر کا راستہ دیکھتے تھے۔ اور ان کو طرح طرح کے ضمیر کے تقاضے یاد آ جاتے تھے۔ اور ناخوب‘ خوب ہو جاتا تھا۔ بعض جماعتیں کُرسیوں کے علاوہ تخت بھی رکھا کرتی تھیں۔ یہ بھی بڑی آرام دہ چیز ہے۔ لیکن خرابی یہ ہے کہ اس فرنیچر کو کبھی کبھی ہائے ہنوز ہو جاتی ہے۔ تخت کا تختہ ہو جاتا ہے۔ لہٰذا فی زمانہ اس کو کافی سمجھا جاتا ہے۔ کُرسیاں بھی آج کل بڑی بڑی بننے لگی ہیں۔ ایک آدمی بیٹھتا ہے دوسرا اس کی گود میں بیٹھ جاتا ہے۔ ایک دو کو اس کے ہتھوں پر بٹھا لیتا ہے اور ایک آدھ پیچھے لٹک بھی جاتا ہے۔ اتنا البتہ اس میں بھی ہے کہ اس کو ٹانگ سے پکڑ کر کوئی کھینچے تو پھر سبھی ایک ساتھ گرتے ہیں۔ ایک دوسرے کے اوپر۔ بورے پر بیٹھنے والا اس لحاظ سے اُچھا رہتا ہے کہ وہ گرتا نہیں اور گرے تو اس کے زیادہ چوٹ نہیں آتی۔

(بقلم خود مورخہ ۲۱۔۳۔۷۶ روزنامہ امروز)

☆☆☆

قِصّہ آبِ رواں کا اور مچھلیوں کا

لاہور میں زنانہ پولیس کے ٹریفک سنبھالنے کی خبریں کراچی پہنچی ہیں اور منو بھائی کے کالم کے باوجود بہت سے لوگ لاہور جانے اور اپنا چالان کرانے کے لیے پر تول رہے ہیں۔ بلکہ مطالبہ ہو رہا ہے کہ کراچی میں بھی ایسا ہی کیا جائے تاکہ لوگوں کو چالان کرانے اور مار کھانے کے لیے دُور کا سفر نہ اختیار کرنا پڑے۔ لاہور کے اخباروں میں یہ آیا ہے کہ جہاں زنانہ پولیس کو ٹریفک کنٹرول کے لیے متعین کیا گیا‘ وہیں ٹریفک کا مسئلہ پیدا ہو گیا۔ تماشائی ہجوم کر آئے۔ ٹھٹ لگ گئے۔ ظاہر ہے کہ یہ بیبیاں اس ٹریفک کو کنٹرول کرنا جانتی ہوں گی اور کر لیں گی لیکن ایسے ہی موقع کے لیے شاعر نے کہا ہے۔

ے آبِ رواں کے اندر مچھلی بنائی تُو نے
مچھلی کے تیرنے کو آبِ رواں بنایا

ٹریفک کنٹرول کرنا بلکہ کسی طرح کا بھی کنٹرول عورتوں کے لیے کوئی مشکل بات نہیں۔ یہ تو سڑک کی آمدورفت ہے۔ اس دنیائے رنگ و بو میں ......کوئی ان کی اجازت کے بغیر قدم نہیں رکھ سکتا۔ اسی لیے جب نیستی سے ہستی کے راستے پر کنٹرول کی ضرورت پڑتی ہے اور اس کے لیے منصوبہ بندی کے محکمے بنتے ہیں تو عورتوں ہی

سے پہل کی جاتی ہے کہ کسی کو آنے نہ دیں۔ بہت رعایت کی تو ایک یا دو کا کوٹہ مقرر کر دیا۔ یہ بھی قطرہ قطرہ بہت ہو جاتے ہیں۔ رات کو دیر سے گھر آنے والے بہت سے صاحبان بھی خواتین کی ٹریفک کنٹرول کرنے کی صلاحیتوں کا تجربہ رکھتے ہوں گے۔ بعضے تو دروازے پر لال بتی دیکھ کر دیوار پھاندنا مستحسن سمجھتے ہیں یا اپنے ساتھ کسی نوحہ گر کو رکھتے ہیں تاکہ بیلن یا جھاڑو کا پہلا وار اسی پر ہو۔ تفصیل کے لیے دیکھیے ہماری کتاب ''قصہ ایک کنوارے کا'' میں دل خوش خان کا احوال۔

☆☆☆

لاہور سے اس قسم کی خبریں بھی آئی ہیں کہ اگر کسی چوک پر ٹریفک کی چھتری کے نیچے کوئی ایسی سپاہن کھڑی کر دی گئی کہ نِک سُک سے درست کچھ طرح داری بھی رکھتی ہو، تو بعض موٹروں والے اس چھتری ہی کا طواف شروع کر دیتے ہیں۔ برابر وہیں گھوم رہے ہیں۔ سُنا ہے ان کو نظرِ بد سے بچانے کے لیے یہ بھی طے کیا گیا ہے کہ ان کے ساتھ کوئی مرد کانسٹیبل بھی رہے جو لوگوں کو ہٹو بچو کرتا رہے۔ چونکہ بعض مرد کانسٹیبل وغیرہ بھی طرح دار ہوتے ہیں اس لیے اس جوڑے پر ایک اور سنتری کو متعین کرنے کی ضرورت بھی پیش آئے گی۔ یوں ٹریفک کا مسئلہ حل ہو نہ ہو، لوگوں کی بے روزگاری کا مسئلہ...... بڑی حد تک حل ہو سکتا ہے۔

انہی دنوں خبر آئی کہ برژی باردوت نے چور پکڑا۔ برژی باردوت کو سبھی جانتے ہیں قتالہء عالم ہے۔ یہ خبر فرانس کی ہے اور راوی یوں بیان کرتا ہے کہ مس باردوت نے ایک شخص کو چھت پر فرار ہوتے دیکھ کر سختی سے ڈانٹا۔ اس شخص نے حکم کی تعمیل کی اور اس کی خواب گاہ سے چُرائی ہوئی رقم اور زیور اس کے حوالے کر دیے۔ مس باردوت کو چاہیے تھا کہ چور کی اس ادا پر خود قربان ہو جاتیں یعنی اپنے گھر سے خود ہی چلی جاتیں لیکن انہوں نے پولیس کو فون کر دیا اور اس نے اس نامعلوم شخص کو آ کر گرفتار کر لیا۔ مس

باردوت کا تعلق فلموں سے ہے۔ ان کو چور بھی فلمی ملا۔ یوں لگتا ہے کہ بے چارا پہلے ہی موصوفہ کی زلف گرہ گیر کا اسیر ہو چکا تھا۔ پولیس کی گرفتاری کو قندِ مکرر سمجھنا چاہیے۔ عام زندگی میں لوگ ایسے سدھے ہوئے نہیں ہوتے۔ کوئی روکے یا للکارے تو چاقو یا پستول سے جواب دیتے ہیں۔ پولیس کو ٹیلی فون کرنے کی اجازت تو جہاں تک ہمارا خیال ہے کوئی بھی نہیں دیتا۔ ہمیں تو یہ سارا افسانہ لگتا ہے۔ اک ذرا پلاٹ اس میں کمزور ہے۔

☆☆☆

چوری کے ساتھ کوئی اور قافیہ باندھتے منّو بھائی سے ڈر لگتا ہے لیکن بندہ بشر ہے، خواہ وردی ہی میں کیوں نہ ہو۔ ہمیں ڈر ہے، یہ بیبیاں کہیں سماج ہی کو لال بتّی نہ دکھانا شروع کر دیں اور یہ منظر نہ ہو کہ سماج تو آ کر لال بتّی پر ٹھٹک گیا۔ اور انہوں نے ہری بتّی کے رُخ سڑک پار بھی کر لی اور کسی راہگیر کا ہاتھ پکڑے پکڑے قاضی کے ہاں راضی ہونے پہنچ گئیں۔ جن لوگوں نے لاہور میں زنانہ پولیس کا ڈول ڈالا ہے۔ انہوں نے شاید گُل کے باغ میں جانے اور پروانے کا خون ناحق ہونے کا قصہ نہیں سُنا۔ بس اتنا دیکھا کہ جہاں کسی لیڈی کانسٹیبل نے ایک آدمی کو حکم دیا کہ ٹھہرو۔ وہاں دس آدمی ٹھہر گئے بلکہ پوچھنے لگے کہ محترمہ آگے کیا حکم ہے۔ کھڑے رہیں یا چلے جائیں۔ اس کا باعث قانون کے احترام کے علاوہ کچھ اور بھی تو ہو سکتا ہے۔

☆☆☆

گھر آئے چور کو پولیس کے حوالے کرنے کی بات بھی پسند نہیں آئی۔ ویسے جو چاہے برژی باردوت کا حُسنِ کرشمہ ساز کرے۔ اس چور سے ہمیں اوہنری کے ایک قصہ کا چور یاد آیا جو ایک شخص کے ہاں چوری کرنے گیا تو پستول دکھا کر کہنے لگا۔

''ہاتھ کھڑے کرو۔''

اس شخص نے ایک ہاتھ کھڑا کیا۔ چور نے کہا۔ ''دوسرا بھی۔'' اس شخص نے معذرت کی کہ گٹھیا ہے۔ اس ہاتھ کو میں جنبش نہیں دے سکتا۔ چور نے پوچھا۔ ''ورم بھی ہے۔'' اس شخص نے کہا ''پہلے تھا۔ اب نہیں ہے۔'' اس پر مکالمہ بازی شروع ہوگئی۔

''کوڑیالے سانپ کا تیل استعمال کیا؟''

''بہت کیا۔''

''بقراطی گولیاں استعمال کیں۔''

''پانچ مہینے متواتر۔ ان کے علاوہ لبوب کبیر۔ معجون فلاسفہ اور اطریفل جالینوس بھی استعمال کر دیکھے حتیٰ کہ لعوق خراسانی بھی کھاتا ہوں۔'' اب چور اپنا کام تو بھول گیا مشورے دینے لگا اور بولا۔

''مجھے بھی یہ مرض رہا ہے۔ ڈاکٹری علاج کرایا؟'' مریض نے کہا۔ ''بہت کرایا۔ میرے نزدیک تو ڈاکٹر سب کے سب چور ہیں۔''

اس چور نے ڈاکٹر بنتے ہوئے اسے ایک دو نسخے اور بتائے۔ فاسفورس کا تیل وغیرہ۔ مریض نے کہا۔ ''کچھ افاقہ نہیں ہوا۔'' اس پر اس نے کہا۔ ''پھر تو ایک ہی دوا ہے۔ شراب کے دو گھونٹ جو کام کرتے ہیں وہ ان تیلوں اور معجونوں کے بس کی بات نہیں۔ چلو ذرا کپڑے پہنو، باہر کوئی شراب خانہ کھلا ہو تو دو گھونٹ پی آئیں۔ تکلف مت کرو پیسے میرے پاس ہیں۔''

☆☆☆

اَبھی کل کی بات ہے

اسکول کے زمانے میں فیروز شاہ تغلق کے زمانے کی قیمتوں کا پڑھا کرتے تھے تو تعجب کیا کرتے تھے کہ ہیں، گیہوں بھی روپے کا چار من ہوسکتا ہے؟ گھی بھی روپے کا چھ سیر ہوسکتا ہے، چنے کی دال دو پیسے کی سیر ہوسکتی ہے۔ یقین نہیں آتا تھا۔ اب جو ہم بیس پچیس برس پہلے کی قیمتوں کا احوال پڑھتے ہیں تو اس سے زیادہ حیرت ہوتی ہے۔ روزنامہ امروز لاہور کے ۳۰ مئی ۱۹۵۰ء کے شمارے میں اکبری منڈی کے بھاؤ چھپے تھے۔

مونگ	.... دس روپے من
ماش	.... ۱۲ روپے من
موٹھ	.... ۲/۱ ۹ روپے من
مسور	.... نو روپے من
چنے سفید	.... سوا سات روپے من
گڑ	.... دس روپے من
شکر	.... تیرہ روپے من
تیل سرسوں	.... ۵۴ روپے من

تیل بنولہ .... ۵۲ روپے من

گھی دیسی .... ۱۴۵ روپے من

گویا ابھی ۱۹۵۰ء میں گھی پونے چار روپے سیر تھا اور وہ خالص پنجاب کے گھی یا پنجاب کے خالص گھی کی بات تھی۔ نقلی میں بناسپتی گھی ضرور ڈیڑھ دو روپے سیر ہوگا۔ اب تو وہ بھی ساڑھے سات روپے سیر ہے، اور اس قیمت پر بھی سیدھی انگلی نہیں نکلتا۔ اصلی گھی کے متعلق کہا جاتا تھا کہ اصلی گھی سونے کے کُشتے سے بہتر ہے یعنی اس سے زیادہ طاقت لاتا ہے۔

پھر ایسا زمانہ آیا کہ بناسپتی گھی دُکان سے لینے کے لیے سونے کے کشتے کی طاقت درکار ہونے لگی۔ اصلی گھی کا تو ہم نے پوچھنا بھی بند کر دیا ہے۔ سوچنا بھی بند کر دیا ہے، بیس روپے سیر کے آس پاس ہوگا۔ اب ہم کھائیں گے بھی تو ہمیں نقصان کرے گا جس طرح ہم خالص آٹا کھالیں، خالص دودھ پی لیں، خالص ہلدی اور مرچ استعمال کرلیں تو پیٹ میں گڑ بڑ ہو جاتی ہے جو انجن ڈیزل سے چلتا ہو اُسے پیٹرول سے چلانے کی کوشش غلط ہے۔

مسور کی دال اُن دنوں نو روپے من تھی۔ چار پونے چار آنے سیر کہیے۔ اُس زمانے میں یہ مُنہ اور مسور کی دال کا محاورہ سمجھ میں نہ آتا تھا، اب آتا ہے اور بہت آتا ہے۔ گُڑ کا بھاؤ بھی آپ نے پڑھ لیا؟ چار آنے سیر یہ بھی تھا۔ اب تین چار روپے کا سیر ہوگا۔ وہ بھی ایسا کہ جتنا گُڑ ڈالیے اُتنا ہی پھیکا۔

پُرانے زمانے میں ایک محاورہ ہوتا تھا کہ جو گُڑ دینے سے مرجائے اُسے زہر کیوں دیا جائے۔ یہ سستے زمانے کی باتیں ہیں اب تو زہر دینا سستا رہے گا، جو زہر دینے سے مرجائے اُسے گُڑ کیوں دیا جائے۔ گُڑ کھائیں...... گلگلوں سے پرہیز بھی اُسی زمانے کا محاورہ ہے، اب تو شاید گلگلے ہی سستے ہوں گے۔

☆☆☆

شکر بھی اُن دنوں تیرہ روپے من تھی۔ تیرہ روپے کو چالیس سیر پر تقسیم کرنا ہمیں نہیں آتا۔ ٹیڑھا سوال ہے۔ چھ سات آنے سیر کا اندازہ سمجھیے۔ اسی لیے اس زمانے میں شکر لبوں کی وہ قدر نہ تھی جو آج کل کے زمانے میں ہے۔ خوباں کا بھی یہ حال تھا کہ بولتے تھے تو یوں لگتا تھا جیسے شیرینی بانٹ رہے ہوں۔ ہم ریوڑیاں بانٹ رہے ہوں بھی کہہ سکتے تھے، لیکن محاورے میں ریوڑیاں لینے والے کا اپنا ہونا ضروری ہے۔ نہ ہم خوباں کو یہ کہہ سکتے ہیں، نہ ہمیں کسی کا اپنا ہونے کی کبھی سعادت حاصل ہوئی۔

☆☆☆

بس اب تو یہی رہ گیا ہے کہ تاریخ میں فیروز شاہ تغلق کا باب نکالیں، پُرانے اخباروں میں منڈیوں کے بھاؤ تلاش کریں اور اُن کو شہد لگا کر چاٹیں، لیکن صاحبو! اب تو شہد بھی مہنگا ہو گیا ہے۔ یہ نہیں کہ مکھیاں مہنگی ہوگئی ہوں اور انہیں پھولوں سے رس چُوسنے کے لیے پہلے سے زیادہ پیسے دینے پڑتے ہوں۔ ابھی تک پھول بھی مُفت، ان کا رس بھی اور مکھیاں بھی، لیکن چینی تو مہنگی ہے۔ جو شہد کا جزو اعظم ہوتا ہے، ہم نے سوات میں، سیدو شریف میں سب سے مشہور کمپنی کے صدر دفتر سے شہد کی بوتل خریدی تو اُس سے بھی چینی کا ڈلا نکلا۔ پتا نہیں کمپنی والے بے ایمانی کرتے ہیں یا مکھیاں۔ فی زمانہ سب ہی کچھ ممکن ہے۔

(باتیں انشاء جی کی اخبار جہاں ۷۴/۶/۲۶)۔

☆☆☆

کیا پانی بھی برادر

۱۹۶۵ء اور ۱۹۶۶ء میں جب کہ ہم اپنے مکان میں آئے نہیں تھے، اسے شوق سے دیکھا کرتے تھے، پانی کی آمد کا یہ حال تھا کہ درّاتا ہوا چڑھتا تھا، جیسے شاعر نے بحرِ ظلمات میں گھوڑوں کے دوڑانے کی کیفیت بیان کی ہے اور ٹنکی کو بھر کر کناروں سے باہر گرنے لگتا تھا' حتیٰ کہ ہمیں بھاگ کر والو بند کرنا پڑتا تھا۔ اُدھر ہم مکان میں آئے، ادھر کسی نے کے ڈی اے والوں کو خبر کر دی کہ یہ شخص اہلِ بیت سے عقیدت رکھتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ چند روز میں تیمّم کرنا پڑا۔ نماز تو خیر تیمّم کے ساتھ ہو جاتی ہے، لیکن کھانا پکانا' نہانا دھونا تو از روئے شرع بھی تیمّم کے ساتھ نہیں ہوسکتا۔ پھر ہم نے زرِ کثیر خرچ کیا اور آنگن میں کنواں یعنی حوض بنوایا اور مزید زرِ کثیر سے ایک مشین لگوائی۔ لیکن چند دن میں اس بے زبان مشین نے بھی شکایت شروع کر دی کہ حضرت میں پانی چڑھا سکتی ہوں، بنا نہیں سکتی، کے ڈی اے والے پانی چھوڑیں۔ وہ اس حوض میں آئے، تب میں اسے اوپر چڑھاؤں۔ ہم نے اسے آکسیجن اور ہائیڈروجن سپلائی کرنے کا وعدہ بھی کیا، لیکن اس نے اپنی پُرامن عدم تعاون کی تحریک جاری رکھی۔

☆☆☆

بہت دن ہم ٹیکس تو کے ڈی اے کو دیتے رہے اور پانی باہر سے بالٹیوں میں منگاتے

رہے، کیونکہ وہ دن حُبّ الوطنی کے تھے۔ جس چیز کی قلت اور گرانی کی شکایت ہم کرتے، جواب ملتا کہ اُسے بیرونِ ملک برآمد کر کے زرمبادلہ کمایا جارہا ہے۔ چاول کے ساتھ یہ ہوا تھا، ہم نے یہ سمجھ لیا کہ پانی بھی برآمد کر کے زرمبادلہ کمایا جاتا ہوگا۔ لہٰذا شکایت کرنی ٹھیک نہیں۔ ٹھیک کے علاوہ شکایت کرنا قرینِ مصلحت بھی نہ تھا۔ کیونکہ یک بارگی جو بھی نظامِ حکومت بدلا، اور لوگوں نے نئے سرے سے پانی مانگا۔ تو حکومت نے لوگوں کے گھروں کے باغیچے کٹوا دیے۔ انعام درّانی صاحب کچھ دن خوب لڑے، انتظامیہ کے کالموں اور نظموں کی قرولیاں بھونکتے رہے۔ آخر ہار کر بیٹھ گئے۔ کہ کہیں ایسا نہ ہو کوئی آ کے مکان بھی ڈھا دے کہ اس کی وجہ سے پانی کی قلت ہے۔ یہ وہ زریں دور تھا جب دودھ دہی کی دکانوں پر جالیاں لگائی جارہی تھیں، اور جمعداروں کی فوج ظفر موج سڑکوں پر نمودار ہوگئی تھی حتیٰ کہ ہمیں اپنے اور پڑوسی کے کُل وقتی جمعدار گھسیٹا مسیح کے متعلق پہلی بار معلوم ہوا کہ دراصل کارپوریشن کا تنخواہ دار ہے۔ لیکن یہ چار دن کی چاندنی تھی، اس کے بعد وہی ہوا، جو چار دن کی چاندنی کے بعد ہوتا ہے۔

☆☆☆

ہمارا وہ گمان تو جس کا تعلّق عقیدے اور مذہب سے تھا، غلط ثابت ہوا۔ تحقیق پر پتا چلا کہ کے ڈی اے کے سبھی افسرانِ مجاز بحمداللہ صحیح العقیدہ مسلمان ہیں۔ محرّم کے دنوں میں پانی کا بالخصوص بند ہونا محض امرِ اتفاقی ہے، یا زیادہ سے زیادہ کے ڈی اے کی نالائقی کہا جاسکتا ہے۔ سو آج کل کون محکمہ ہے جو نالائقی نہیں دکھاتا۔ پھر بشارت ہوئی کہ اُڑن کھٹولا آئے گا' اِک لال پری کو لائے گا۔ معاف فرمائیے ہم پر بھی اِن دنوں فلموں کا اثر ہونے لگا ہے۔

معلوم یہ ہوا تھا کہ آب رسانی کا نیا منصوبہ مکمل ہو رہا ہے، جس کا ثبوت یہ ہے کہ جا

بجائے سڑکیں کھُد رہی ہیں، ٹریفک بند ہے اور پائپ پڑ رہے ہیں۔ اب کہ پانی کا وہ ریلا آئے گا، کہ شاید ابو سمبل کے مندروں کی طرح کراچی کو بھی کہیں اور آباد کرنا پڑے گا۔ یہاں تو بس ایک بڑی سی جھیل ہوگی، جس کے کنارے بیٹھ کر کراچی والے مچھلیاں پکڑا کریں گے، یا رویا کریں گے کہ کاش ہم نے یہ آرزو نہ کی ہوتی، اور ہم نے کی بھی تھی تو اتنا پانی تھوڑا مانگا تھا۔

☆☆☆

ہم پاکستانی لوگ عادتاً اس نوکر کی طرح ہوگئے ہیں، جس نے آقا سے کہا تھا کہ میری تنخواہ بڑھا دیجیے ورنہ...... اور جب آقا نے پوچھا ورنہ کیا......؟ تو وہ سہم کر بولا۔
''ورنہ میں اسی تنخواہ پر کام کرتا رہوں گا۔''

پس قلتِ آب اور گرانی کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے بھی ہم اس تنخواہ پر کام کرتے رہے، حتیٰ کہ ٹیلی ویژن پر انٹرویو دیتے ہوئے کے ڈی اے کے چیئرمین سومرو صاحب نے بشارت دی کہ لوگو انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں، اب اپنے اپنے گھڑے تیار رکھو، پانی آیا کہ آیا، اور ہاں ٹونٹی پوری مت کھولنا، ورنہ پورے گھر میں پانی بھر جائے گا۔ اور کے ڈی اے...... ذمہ دار نہ ہوگی۔ اس کے مقابلے میں ہوا یہ کہ پکانے ریندھنے کو بھی پانی مشکل سے دستیاب ہونے لگا۔ اب ہم حیران تھے کہ سومرو صاحب کا پانی کہاں گیا، وہ سیلابِ بلا کسی اور کے گھر جانے کے بجائے ناظم آباد کی طرف آیا ہوتا۔ بارے مستفیض احمد صدیقی صاحب کا بیان آیا جس سے اس پانی کا مصرف معلوم ہوا۔ خبر ملی ہے کہ کے ڈی اے نے وہ سارا پانی شہریوں کی اُمیدوں پر پھیر دیا ہے۔

☆☆☆

اب یہ بحث تو ناظم آباد کی مجلسِ ہائے ہائے کے سکتر مستفیض احمد صدیقی صاحب

اور کے ڈی اے کے سومرو صاحب کے درمیان ہے کہ کس نے کتنا پانی لیا اور کس نے کتنا ٹیکس دیا۔ ہم ادھر مستفیض صاحب کی ہاں میں ہاں ملائیں گے کہ پھر کہیو کہ ہاں کیوں ہو......؟

اُدھر سومرو صاحب نے کوئی جواب دیا، یا عذر کیا کہ زیادہ پانی کیا کرو گے۔ تم ہندو تھوڑا ہی ہو کہ صبح صبح اشنان کرنے بیٹھ جاؤ۔ مسلمان تو جمعے کے جمعے نہاتا ہے، تو ہمیں کہنا پڑے گا کہ بے شک آپ بھی ٹھیک کہتے ہیں۔ اگر کسی نے کہا کہ مستفیض صاحب اور سومرو صاحب...... دونوں بہ یک وقت کیسے ٹھیک ہو سکتے ہیں۔ تو لامحالہ ہم کہیں گے کہ ہاں آپ بھی ٹھیک کہتے ہیں۔ کیونکہ ہم پُر امن عدم تعاون والے تھوڑا ہی ہیں۔ ویسے ہم جانتے ہیں کہ جو وہ کہیں گے جواب میں۔ یعنی سومرو صاحب' ایک صاحب کسی نشانے پر تیر مار رہے تھے، سارے تیر اِدھر اُدھر لگ رہے تھے۔ نشانے پر کوئی نہ بیٹھتا تھا، آخر بولے ''تعجب کی بات ہے۔ یہاں سے تو تیر بالکل ٹھیک جاتا ہے، نشانے کے قریب جا کر جانے اسے کیا ہو جاتا ہے۔'' سومرو صاحب بھی شاید یہ فرمائیں کہ یہاں سے تو پانی ٹھیک جاتا ہے، اور بہت جاتا ہے۔ ابنِ انشا صاحب کے گھر پر جا کر جانے اسے کیا ہو جاتا ہے۔

(دخل در معقولات۔ روزنامہ جنگ ۱۸/۳/۷۱)۔

☆☆☆

واپسی مچھّر خان کی!

”السلام علیکم“

”وعلیکم السلام۔ آ بھئی مچھر خان۔ روزہ ہے یا لوگوں کا خون چُوستا پھر رہا ہے۔“

”آپ تو ایسے کہہ رہے ہیں جیسے خود روزے سے ہوں۔“

”تجھے ہم سے کیا مطلب، ہمارا عمل ہمارے ساتھ۔ دیکھ عالی صاحب نیک ہو گئے، ہم بھی ہو جائیں گے، جب سے وہ عمرہ کر کے آئے ہیں، روزہ، نماز، تراویح وغیرہ سب کا اہتمام ہے۔ ہم بھی اللہ نے چاہا تو عمرہ کر آئیں گے۔“

”تو کیا عمرہ ادا کرنے سے پہلے روزے نماز کی ممانعت ہے؟“

”ارے تو کیوں مذہبی بحثوں میں پڑتا ہے' اندیشہ شہر میں مبتلا ہوتا ہے، بتا تیری کیا خاطر کروں۔ تیرے لیے تو جان بھی حاضر ہے، جیسا کہ ملیریا کے اعداد وشمار سے ظاہر ہے۔“

”شکریہ، ابھی سامنے حلوائی کے کونڈے پر سے چکھوتیاں کر کے آیا ہوں۔“

”تو کیا اس نے جالیاں ہٹا دیں۔“

”جالیاں۔ اجی حضرت وہ تو لوگوں نے دو دن کو اس ڈر سے لگالی تھیں کہ مارشل لا والے دھر لیں گے۔ جب دیکھا کہ یہ معاملے سول حکام یعنی کارپوریشن وغیرہ پر

چھوڑ دیے گئے ہیں، تو اتار پھینکیں۔“

”اچھا آج کوئی کہانی سُنانے آیا ہے۔ ہمارا قصور معاف کر۔“

”جی نہیں۔ کہانی سُنانے نہیں۔ تبادلہ خیالات کرنے آیا ہوں۔“

”تو پھر جلدی سے کر، ہمارے خیالات تُو لے لے' اپنے خیالات ہمیں دے دے۔ ہم پہلے ہی اپنے خیالات سے تنگ ہیں۔“

”میرا خیال تھا۔ آپ کچھ ون یونٹ وغیرہ ٹوٹنے کے مسئلے پر رائے زنی کریں گے۔ اب تو خوش ہیں ناں آپ۔“

”تجھے ہمارے خوش ناخوش ہونے سے مطلب' تو تین میں نہ تیرہ میں۔ نہ پنجابی نہ مہاجر۔ نہ نیا سندھی نہ پُرانا سندھی۔“

”جی یہ تنگ نظریاں آپ اشرف المخلوقات کو مبارک' ہمارے ہاں ایسی تفریق نہیں، ہم تو مچھرستان بنائیں گے ایک ہی۔“

”کیا پدّی کیا پدّی کا شوربہ، ارے تُو تو پدّی بھی نہیں ہے۔“

”پدّی ودّی کی باتیں بہت ہُو چکیں، یہ جمہوریت کا زمانہ ہے بندوں کو گِنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے۔“

”کیا مطلب۔ تو بھی الیکشن کی سوچ رہا ہے۔ مرزا ظفر الحسن کے رجسٹر میں نام لکھائے گا۔“

”جی ہاں' جب آبادی کی بنا پر ہی سب کچھ ہونا ہے تو ہم بھی ہیں۔“

”تُو بھی اے فرزند کتاباں اپنی خودی پہچان۔“

”آپ لوگ تو پورے ملک میں بارہ کروڑ ہوں گے' یہاں ایک جوہڑ پر ہماری اتنی آبادی ہوگی، یہ جو آپ کے سامنے کی سڑک پر کوڑے کا ڈھیر ہے، اور جسے آپ کے دس کالم بھی نہیں اُٹھوا سکے، کوئی دس لاکھ مچھر تو اس پر آباد ہوں گے۔“

’’اچھا بابا! جو تیرا جی چاہے کر۔ ہم سیاسی آدمی نہیں ہیں۔ آج ہفتے کا دن ہے ہمیں اپنا کالم لکھنے دے۔‘‘

’’پھر آپ ڈاکٹروں پر لکھیں گے؟‘‘

’’ارے نہیں، وہ تو ایک ڈاکٹر صاحب پر لکھ دیا تھا۔ سب کو ناراض کرلیں تو ہماری بیماریوں کا علاج کون کرے گا؟ بہت بیماریاں ہیں ہم میں جن کا فارما کوپیا میں ذکر ہے اور نہیں بھی ہے۔‘‘

’’آپ تو وہمی آدمی ہیں۔‘‘

’’نہیں وہمی نہیں ہوں، سائنس کی ترقی کے ساتھ دواؤں میں بھی ترقی ہوئی ہے، بیماریوں میں بھی ہوئی ہے، ڈاکٹروں کی فیسوں میں بھی ہوئی ہے۔ پہلے ایسی رنگا رنگ ٹھنڈی میٹھی چار چار انچ لمبے ناموں والی بیماریاں کہاں ہوتی تھیں۔ لوگوں کو کھانسی بخار وغیرہ ہوتا تھا۔ حکیم کی دو پیسے کی دوا سے ٹھیک ہوجاتے تھے، اب تین منٹ کے ڈیڑھ سو روپے دیتے ہیں اور مرجاتے ہیں۔‘‘

’’یہ تو زیادتی ہے۔ بعضے بچ بھی جاتے ہیں۔‘‘

’’ہاں، بعض قسمت والے بچ بھی جاتے ہیں، جسے اللہ رکھے اُسے کون ڈاکٹر چکھے۔ آپ نے اکثر ڈاکٹروں کی زبان سے یہ قول سُنا ہوگا کہ آپریشن کامیاب ہوا۔ مریض مرگیا۔‘‘

’’لیکن اب تو دواؤں میں بہت ریسرچ ہوئی ہے، کیمسٹ کی دکان پر جاکر دیکھیے۔ طرح طرح کی رنگ برنگی گولیاں۔ کیپسول۔ شربت۔ جو دوا آج ہے کل نہیں ہے، جو کل ہے پرسوں نہیں ہے۔‘‘

’’ہاں بے شک سائنس کی ترقی کے تو ہم بھی قائل ہیں کہ اینٹی بایوٹک دوائیں بنا کر دس لاکھ کی جان بچاتے ہیں اور ایک بم پھینک کر بیس لاکھ کو نشٹ کردیتے ہیں۔ اور

دواؤں کا یہ حال ہے کہ جس طرح پہلے زمانے میں بعض مرض ایسے ہوتے تھے، جن کی کوئی دوا نہ ہوتی تھی۔ اب سُنا ہے ایسی دوائیں ہوتی ہیں، جن کے لیے کوئی مرض ابھی تک نہیں نکلا۔‘‘

’’جی یہ سب باتیں کمپی ٹیشن کی ہیں۔ فری انٹر پرائز کی ہیں۔‘‘

’’خیر، یہ لمبی بحث ہے، خدا کرے یہ بیماریاں ختم ہوں اور کوئی شخص بیمار نہ ہو۔‘‘

’’ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد۔‘‘

’’آپ نے چور کی دُعا سُنی ہے؟‘‘

’’چور کی دُعا؟ راجہ مہدی علی خان کی نظم جس میں چور دست بہ دعا ہے کہ ’’بندے پہ تیرے وقت عجب آن پڑا ہے یا مولا کُتّے کو سُلا دے، چوکیدار کو بے ہوش کردے، دروازے کی کُنڈی کھول دے۔‘‘

’’لیکن میں تو ڈاکٹروں کی بات کر رہا ہوں، آج ایک ڈاکٹر کے گھر سے گزر ہوا۔‘‘

’’کونین پینے گیا ہوگا۔ یا ڈی ڈی ٹی کا پھنکا مارنے گیا ہوگا۔ ارے بڑا چٹورا ہے تو مچھر خان۔‘‘

’’آپ بات تو سُنیے۔ ڈاکٹر...... کی بیٹی تقاضا کر رہی تھی کہ ڈیڈی میرے کمرے میں الگ ٹیلی ویژن ہونا چاہیے، جس میں صابن تیل کے اشتہار دل جمعی سے دیکھ سکوں، ڈاکٹر صاحب نے کہا اچھا بیٹے ملیریا پھیل رہا ہے ایک نہیں دو لادوں گا۔ اب ان کی بی بی نے کہا کہ مجھے سونے کا جڑاؤ سیٹ چاہیے۔ ڈاکٹر صاحب بولے انفلوائنزا کے لیے دعا کرو۔ اللہ سب کی سُنتا ہے، اب صاحبزادے بولے مجھے کار چاہیے ابا جی! سب ڈاکٹروں کے بچّوں کے پاس ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا۔ اچھا بیٹے۔ یہ تو رمضان ہی میں لے دوں گا۔ لوگ تھالیاں بھر بھر افطاری کھاتے ہیں، پھر پیٹ پکڑے دوڑے آتے ہیں۔‘‘

ہم نے کہا ''دیکھو میاں مچھر! یہ بحث ختم کرو۔ اس میں ڈاکٹروں کی فیسوں کا ذکر آئے گا۔ اور مریضوں کی غریبی کا ذکر آئے گا۔ جو دس پانچ روپے خرچ نہیں کر سکتے، میں کہوں گا علاج کا ذمہ حکومت لے، لوگ کہیں گے کہ اس کا دماغ چل گیا ہے۔''

''یہ سارے مسائل آپ کو مبارک ہوں' ہاں ڈاکٹروں کا علاج البتہ ہوسکتا ہے، میں نے ایک کتاب میں پڑھا ہے۔''

''شاباش ہے ہمیں بھی دینا وہ کتاب۔ لیکن کل، اب بھاگ کہ ہمارے کالم کا وقت ہے، اور پھر ہمیں گھی لینے جانا ہے۔''

''وہ کیوں؟''

''ارے ون یونٹ ٹوٹا ہے ناں، چراغ جلائیں گے اصلی گھی کے نہ سہی ماما والے کے سہی۔''

(داخل در معقولات جنگ مورخہ 2/12/69)

☆☆☆

ہم دعوت نامہ لے کر گئے تھے

ایک زمانے میں ہمارے ملک کے ایک مشہور صوفی بزرگ نے ایک ''روغن گیسو دراز'' ایجاد کیا تھا۔ جس کی تعریف یہ سُنی تھی کہ ایک قطرہ اس کا ایک بلّی پر گر گیا اور دیکھتے دیکھتے اس پر بالوں کی ایسی گھٹا چھائی کہ منہ سر چھپ گیا، اسی پر بس نہیں، پاس ہی بوٹ پالش کا بُرش پڑا تھا، چند چھینٹے اس پر بھی پڑ گئے۔ اس کے بال جو بڑھنے لگے تو چھت کی خبر لانے لگے۔ اس کو استعمال کرنے میں بڑی احتیاط لازم تھی۔ ایک آدھ بار کسی نے ہتھیلی سے سر میں مل لیا' اور اس کے بعد ہر روز ہتھیلی کی شیو کرانا لازم ہوگیا۔ اس کے لگانے کے لیے ربڑ کے دستانے پہننے کی ہدایت تھی۔ بال اس پر بھی اُگ آتے تھے، لیکن اسے پھینکا جاسکتا تھا۔

بعض لوگوں کو شاید اس تعریف میں مبالغے کی بُو آئے، لیکن جب ہم دیکھتے ہیں کہ ایسی گولیاں ایجاد ہو چکی ہیں، جن کے کھانے سے قد لمبا ہوسکتا ہے، اور ایسے روغن نکل آئے ہیں جن کے استعمال سے رنگ گورا اور بال کالے ہو جاتے ہیں۔ تو قطعاً تعجب کی گنجائش نہیں رہتی۔ بال گھنگھریالے بنانے والے تیل کا اشتہار ہم ایک مدّت سے پڑھ رہے ہیں لیکن اب اخبارِ خواتین کے ایک مضمون سے پتا چلا کہ فیشن بدل رہا ہے۔ اب خواتین نے بالوں کے بل نکالنے اور ان کو تکلے کی طرح سیدھا کرنے کے لیے

بالوں پر استری کرانا شروع کرا دیا ہے۔ یہ فیشن چلا تو ولایت سے تھا، لیکن اب یہاں
بھی آ گیا ہے، کل جو ہم اپنا سوٹ استری کرنے کے لیے تاج پنجاب اپ ٹو ڈیٹ
لانڈری رجسٹرڈ میں گئے، تو ماسٹر اللہ دتہ نے کہا کہ جناب آپ کے سوٹ کی باری کل
آئے گی۔ آپ دیکھتے ہیں کتنی خواتین انتظار کر رہی ہیں، پہلے ان کے بالوں پر استری
کر لوں، گویا ہمارے دیکھتے دیکھتے دھوبیوں کی چاندی ہو گئی اور ہیئر ڈریسر حضرات کا
کاروبار چوپٹ ہوا۔ خیر امید کی جاتی ہے کہ اب لانڈریوں کا کاروبار اتنا بڑھے گا کہ
ان صاحبوں کی اس میں کھپت ہو جائے گی۔ جہاں آپ نے گھر آ کر پوچھا کہ بیگم
کہاں گئی ہیں۔ بچوں نے بتایا کہ ذرا لانڈری تک گئی ہیں، ابھی آتی ہیں۔

☆☆☆
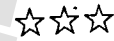
ہیئر ڈریسروں کے روزگار پر فقط دھوبیوں کی طرف سے چوٹ نہیں پڑی، مالیوں کی
طرف سے بھی پڑی ہے۔ کل ایک صاحبزادے ملنے آئے جن کے بالوں کی اوپری سطح
ایسی میدانی اور مسطح تھی کہ اس پر غالیچہ بچھا...... کر بیٹھ کر حقہ پینے کو جی چاہتا تھا۔ ہم نے
پوچھا تو نہیں لیکن ظاہر ہے وہ اپنے بالوں پر لان کی گھاس کاٹنے والی مشین چلوا کر
آئے تھے۔ بعض لوگ سر کو اُسترے سے صفاچٹ کروانا بھی پسند کرتے ہیں۔ اس کا
فائدہ یہ ہے کہ پھر گھر میں آئینہ رکھنے کی حاجت نہیں رہتی۔ اس پر ذرا سا تیل لگایا، اور
جس نے چاہا جب ذرا گردن جھکائی اور (اپنی صورت) دیکھ لی۔ ایک صاحب نے یہ
رجحان دیکھ کر صفاچٹ ہیئر آئل کے نام سے اپنے تیل کا اشتہار دینا شروع کر دیا اور
وہ خوب چل نکلا ہے، لیکن تحقیق سے معلوم ہوا یہ وہی تیل ہے جس سے جناب مشتہر
گنجوں کے سر پر شرطیہ بال اُگانے کی گارنٹی دیا کرتے تھے۔ چونکہ اشتہار کی عبارت
میں ضروری تبدیلی کر دی گئی ہے، اس لیے نسخے میں تبدیلی کی قطعاً حاجت نہیں رہی،
بات یہ ہے کہ دواؤں کا اتنا سارا اسٹاک کون ضائع کرے، عبارت بدلنا اس سے کہیں

زیادہ سہل اور کم خرچ ہے۔ ترکیب استعمال کو البتہ مزید آسان بنا دیا گیا ہے۔ وہ یوں
کہ اگر کسی کو مالش کے لیے اُس کی بُو ناگوار محسوس ہو تو اس کے دو چمچے نہار منہ پی لے۔
اثر یکساں ہوگا۔ کیا اثر ہوگا اس کی اشتہار میں پوری طرح وضاحت نہیں کی گئی ہے۔

☆☆

ہمارے قصبوں کے پرانے ڈاکٹر بڑے جامع العلوم ہوتے تھے، دانت کے درد سے
لے کر امراض چشم، امراض معدہ، امراض ناک، کان، گلا (اضافت کے لیے معاف
فرمایئے) حتیٰ کہ تپ دق اور کتے کے کاٹے کا علاج بھی خود ہی کر لیا کرتے تھے،
شہروں کی طرح نہیں کہ ہر ڈاکٹر کا علم بس اپنے شعبے تک محدود ہے۔ ہمیں کھانسی تھی اور
معمولی تھی، لیکن ہمارے دوست ڈاکٹر اظہر ماہر امراض چشم نے بھی دیکھتے ہی سر ہلا دیا
کہ کھانسی کے ماہر کے پاس جاؤ، عینک لگوانی تھی تو ڈاکٹر سرور ماہر امرض معدہ ہماری
کوئی مدد نہ کر سکے۔ پچھلے دنوں ہمارے گھٹنے پر چوٹ آئی تو ہم قریب ترین دندان ساز
کے پاس گئے، اس نے دیکھتے ہی دانت نکال دیے کہ میں تو گھٹنے کے متعلق کچھ نہیں
جانتا۔ ہاں کہو تو تمہاری بتیسی کھڑے کھڑے نکال دوں۔ اور تو اور شہر میں ہم نے
مویشیوں اور آدمیوں کے جدا جدا ڈاکٹر دیکھے، دیہات میں ایسا کوئی امتیاز نہیں بکری
بیمار ہو تو ڈاکٹر صاحب کے پاس لے جاؤ، خود کو ملیریا ہو جائے تو سلوتری صاحب کے
پاس چلے جاؤ، شہروں والے تو ہر بات میں باریکی دکھاتے ہیں۔ مین میکھ نکالتے ہیں۔
ہمارے ڈاکٹروں کو نہ سہی، دوا سازوں کو اس بات کا احساس ہوا کہ امراض کتنے بھی
ہوں، ان کے لیے الگ الگ دوائیں بنانا خوامخواہ پریشان مریضوں کو اور پریشان کرنا
ہے۔ یہ سچ ہے کہ ہمیں جب کبھی مکسچر اور پڑیاں اور گولیاں دی گئی ہیں کہ یہ فلاں وقت
پیو، یہ اتنے گھنٹے بعد پھانکو اور گولی اس کے دس منٹ بعد نگلو تو ہمارا سارا حساب گڑبڑ
ہو گیا۔ اور ہم بے موقع ان سب دواؤں کو ایک ہی وقت معدے یا نالی میں ڈالتے

رہے، خیر ہم نے اوپر ایک دوا کا ذکر کیا ہے جسے گنجے لگائیں تو دو دن میں یہ ماجرا ہو کہ جنگل کا جنگل ہرا ہو جائے۔ اور بالوں والے لگائیں تو آئینے کو آئینہ دکھائیں۔ ایک اور دوا ہمارے ایک کرم فرمانے نکالی ہے، جو ملیریا، تپ دق، تپ محرقہ سب کے لیے اکسیر ہے۔ آنکھ میں ڈالنے سے عینک چھوٹ جاتی ہے، اور دانتوں پر لگائی جائے تو نئے دانت آ جاتے ہیں ایک صاحب اس کی یوں توجیہ کرتے ہیں کہ بینائی جاتی رہے تو عینک کی کہاں حاجت رہ جاتی ہے، اور جب دانت ہی جھڑ جائیں تو دندان ساز کے ہاں سے نئے دانت کیوں نہ آئیں گے۔ خیر اتنا ہم ضرور کہیں گے، کہ یہ قبض کو دور کرتی ہے اور اسہال میں مفید ہے۔

جوڑوں کا درد، کان کا درد، داد، چنبل، پھوڑے، ہچکی آنے، یرقان، بانجھ پن، اور دماغی کمزوری کا یہ حتمی علاج ہے۔ اس کی ہمہ گیر افادیت کا اندازہ اس سے کیجیے کہ چارپائی پر چھڑکی جائے تو کھٹمل فوراً مر جاتے ہیں۔ ہاں کوئی بڑا جانور ہو، مثلاً آدمی تو اسے متواتر کئی خوراکیں دینی پڑیں گی، تب ہی کماحقہ اثر دکھائے گی۔

☆☆

خاتون نے اپنی ڈائری میں ذکر کیا ہے کہ وہ کسی ڈاکٹر کے پاس گئیں، ان سے دوائی لی اور باہر آ کر نالی میں پھینک دی، گھر پہنچنے تک وہ صحت یاب ہو چکی تھیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض ڈاکٹروں کی دوائیں ایسی ہی سریع الاثر ہوتی ہیں۔ ہم نے خود ہمیشہ یہی کیا اور عموماً دو تین خوراکیں نالی میں پھینکنے سے کلی طور پر صحت یاب ہو گئے۔ ڈاکٹروں کے مطبوں کے باہر بڑی بڑی نالیاں اسی مقصد کے لیے ہوتی ہیں لیکن بعضے نومشق مریض پھینکنے کے بجائے دوا گھر لے جاتے ہیں اور اسے پی لیتے ہیں۔ اور پھر نقصان اٹھاتے ہیں۔ انجکشنوں کے تو ہم اور بھی زیادہ قائل ہیں۔ ہم نے اکثر دیکھا کہ ایک انجکشن لگا اور چہرے پر خون کی لہر دوڑ گئی۔ مریض کے چہرے پر نہیں، ڈاکٹر

کے چہرے پر۔ پھر یہ ایسی چیز ہے کہ مریض ہو نہ ہو، انجکشن ہر حال میں فائدہ کرتا ہے۔ مریض کو نہیں، ڈاکٹر کو۔ ابھی اس اتوار کو جب ہم نے اپنی نئی غزلیں سنانے کے لیے اپنے گھر پر مشاعرہ کیا (کوئی اور اس کا اہتمام کرنے پر راضی نہ ہوا) تو ہم دعوت نامہ لے کر اپنے پڑوسی ڈاکٹر زبیری کے ہاں بھی گئے، وہ اس وقت مصروف تھے لہٰذا ہم بھی ایک بنچ پر بیٹھ کر اخبار پڑھنے لگے۔ یکا یک کسی نے ہماری آستین اٹھائی اور ہم نے سوئی کو تب دیکھا جب وہ ہمارے گوشت میں سے نکل رہی تھی۔ ہم نے کہا۔ ''ڈاکٹر صاحب میں تو دعوت نامہ لے کر حاضر ہوا تھا۔ شام کو تشریف لائیے، ماحضر تناول فرمائیے اور تازہ کلام سنیے....'' بولے ''ضرور حاضر ہوں گا، لیکن اس انجکشن کے تین روپے کمپونڈر کو دیتے جائیے گا، اور خوراک میں کھٹی چیزوں، بڑے گوشت اور چاولوں سے پرہیز لازم ہے۔ کل اسی وقت پھر آئیے گا اور مکسچر کے لیے خالی شیشی ساتھ لائیے گا۔''

☆☆☆

میر صاحب سے آغا صاحب تک

میر حسن اردو کے مشہور شاعر ہیں۔ وجہ شہرت ان کی مثنوی سحر البیان ہے عام لوگوں کے لیے یہی کافی ہے۔ باقی جو کچھ لکھا ہے وہ محققین کے کام کا ہے کہ اس پر مقالے لکھیں اور ڈگریاں سمیٹیں۔ پچھلے دنوں پشاور کے قصہ خوانی بازار سے گزرتے ہوئے کچھ پرانی خستہ وخراب کتابیں نظر آئیں۔ انہی میں ایک تھی غزلیات حسن۔ اب پتا نہیں روپیہ دیا تھا یا ڈیڑھ روپیہ۔ بہر حال زر کثیر خرچ کر کے ہم نے اسے حاصل کر لیا۔ کیونکہ ٹائیٹل پر غیر مطبوعہ لکھا تھا۔ خیر جس زمانے میں یہ کتاب چھپی ہے۔ اتنی زیادہ پرانی بھی نہیں۔ ۱۹۴۴ء میں یہ غیر مطبوعہ ہی ہوں گی۔ پڑھا تو معلوم ہوا کہ ہر چند دیباچہ نگار نے ان غزلوں کی بڑی تعریف کی ہے۔ دیباچہ نگار کا تو یہ فرض منصبی ہوتا ہے لیکن یہ تبرک ہیں۔ دیباچے سے یہ بھی معلوم ہوا کہ میر حسن کا بہت سارا کلام گھر میں آگ لگنے سے نذر آتش بھی ہو گیا تھا۔ ہمیں اس کا بھی افسوس ہے۔

اس نادر مجموعے میں سے سنانا تو آپ کو ایک غزل ہے جس سے معلوم ہو کہ ای جمی کے زمانے میں ہمارے بزرگ کس قسم کی غزلیں اور کس قسم کا کلام کہا کرتے تھے۔ تاہم کچھ متفرق اشعار بھی سن لیجیے۔ ترتیب اس مجموعے کی ردیف وار ہے۔ یعنی آخری حرف (الف) ہے تو پہلا اور آخری حرف (ی) ہے۔ تو آخر میں چنانچہ الف کی تختی کی

پہلی غزل یہ ہے۔

کبھی زلفوں سے ہے اس کی کبھی گیسو سے مٹھ بھیڑا
مرے دل کے لیے رہتا ہے! الجھیڑے پہ الجھیڑا

☆☆

ایک شعر سے معلوم ہوا کہ کھیڑا کا لفظ جو پنجابی میں گاؤں یا بستی کے معنی میں آتا ہے اور وارث شاہ کے ہاں بہت آیا ہے۔ اس زمانے میں اردو میں بھی تھا۔

اسی دل میں ہے عیش و غم' اسی میں شادی و ماتم
سہانی سی یہی بستی ہے' اُجڑا سا یہی کھیڑا

ہائے کتنا اچھا لفظ تھا جسے اردو والوں نے متروک کر دیا۔ ایک اور شعر سنیے۔

عجب پیدا کیے ہیں یار تم نے اپنی صحبت کے
کوئی لنگڑا' کوئی لولا' کوئی کانا کوئی ڈھیرا

☆☆

بیچ بیچ سے کچھ اور نمونے کلام بلاغت نظام کے دیکھیے کیسی کیسی رونقیں ڈھونڈتے تھے۔ کس کس طرح کی مشق اپنے آپ سے لیتے تھے۔

مد میں جوبن کے جو ہے وہ بُت بے باک چڑھا
گل بھی لیتا ہے تو ہاتھوں سے مرے ناک چڑھا

☆☆

کبھی یہ تھا کہ ہم کو دیکھتا تھا تند خو چھپ چھپ
ادا کرتا تھا خاموشی میں کیا کیا گفتگو چھپ چھپ

☆☆

جس طرح سے شرر کے لیے سنگ ہے وسیع
جلوے کو تیرے مرا دلِ تنگ ہے وسیع

قافیوں کی سنگلاخی دیکھیے۔

نہ مینا ہے نہ مے ہے سب یہ اے ساقی تکلف ہے
اسی کی ذات اک باقی ہے اور باقی تکلف ہے
نہ آتے ہو نہ ملتے ہو نہ ہنستے ہو نہ کھلتے ہو
تکلف برطرف آگے بد اخلاقی تکلف ہے
شرر ریزی تو پلکوں کی اس اشک گرم سے دیکھو
رکھے ہے کون یہ بندوق چقماقی تکلف ہے

اوراب وہ غزل پہلودار

میں کہا مجھ سے ملاکر تو لگا کہنے اونہوں
پھر کہا کچھ تو وفا کر تو لگا کہنے اونہوں
میں کہا مہر نہیں تجھ میں تو وہ بولا کہ ہوں
جب کہا رحم کیا کر تو لگا کہنے اونہوں
سب سے ملتا ہی تھا وہ عید کے دن میں بھی گیا
مجھ سے بھی ٹک تو مل آکر تو لگا کہنے اونہوں
میں کہا تجھ سے نہ بولوں تو لگا کہنے کہ ہوں
بیٹھا جب منہ میں بناکر تو لگا کہنے اونہوں
جب کہا میں کہ اونہوں ہی یہ رہے یا ہوں ہی
کچھ تو قصہ یہ ادا کر تو کہنے لگا اونہوں
میں حسنؔ سے جو کہا اس کی تو باتیں ہیں یہی
مل نہ اب اس سے تو جاکر تو لگا کہنے اونہوں

اگلے وقتوں کے لوگ اس قسم کا کلام کہا کرتے تھے اور اگلے وقتوں کے لوگ اس کو پسند بھی

کرتے تھے۔لیکن پچھلے دنوں ایک بزرگ کا کلام نظر پڑا..... جو اس زمانے کے ہیں۔اللہ ان کی عمر میں برکت دے۔لکھنؤ کی موٹی مٹی کی نشانی ہیں۔ان کی کتاب دس بارہ سال ادھر جوش ملیح آبادی، شاہد احمد دہلوی مرحوم اور بہزاد لکھنوی مرحوم کے تحسینی دیباچوں کے ساتھ چھپی تھی۔فرماتے تھے۔

بتادوں کسے کہتے ہیں زندگانی
جوانی جوانی جوانی جوانی
بتادوں ابھی تم کو کیا ہے بڑھاپا
کہانی کہانی کہانی کہانی
بتادوں ان آنکھوں پہ کیا ہے طلائی
کمانی کمانی کمانی کمانی
بتادوں تمہیں ان کے وعدے ہیں کیسے
زبانی زبانی زبانی زبانی
بتادوں نہیں ان کی کیا شے مرے پاس
نشانی نشانی نشانی نشانی
بتادوں کہ مے تیز ترکون سی ہے
پرانی پرانی پرانی پرانی
بتادوں غریبوں کو کھلتی ہے کیا شے
گرانی گرانی گرانی گرانی
بتادوں مذہب ہے جو سب سے بہتر
قرآنی قرآنی قرآنی قرآنی

کیا جامع غزل ہے جس میں عاشقی بھی آگئی ہے۔اسلام بھی آگیا ہے۔سوشلزم

بھی۔ جانے فی زمانہ اس شعر کی قدر کیوں نہیں۔ ایک اور نمونہ ملاحظہ ہو۔ اسی رنگ میں۔

نشیلی نگاہیں قدم لڑکھڑائے
وہ آئے وہ آئے وہ آئے وہ آئے
جوانی کی آنکھوں میں صہبا کے ڈورے
وہ ہائے رے ہائے رے ہائے رے ہائے
بہ مشکل انہیں میں نے افسانے دل کے
سنائے سنائے سنائے سنائے
نہ آنے کے اس شوخ نے سوبہانے
بنائے بنائے بنائے بنائے
وہ مانیں نہ لیکن رقیبوں کے ہیں تو
پڑھائے پڑھائے پڑھائے پڑھائے
سفر میں برابر رہی فکر دل کو
گھر آئے گھر آئے گھر آئے
چنے میں نے چاہت میں لوہے کے آغا
چبائے چبائے چبائے چبائے

ظاہر ہے کہ جو شخص خود چنے چبائے گا دوسروں کو بھی چبوائے گا۔ ایک نظم ہے بہ عنوان شیخ و برہمن دیکھیے کیسے کیسے قافیوں کو کس خوبصورتی سے باندھا ہے۔

سورگ سے میں جس دم نکالا گیا ہوں
بہت اپنے جی میں اُداسا گیا ہوں
جو کعبہ گیا ہوں تو احرام باندھے

میں مسجد میں باندھے منڈا سا گیا ہوں
سنا ہے جو نانا بنارس گئے ہیں
تو میں پیچھے پیچھے نواسا گیا ہوں
میں ڈھولک لیے ساتھ قوال بن کر
عرس میں شرکت کو بانسا گیا ہوں
طبیعت جو میری رہی سیدھی سادی
تو بس کھا کے جھانسوں میں جھانسا گیا ہوں
میں ہر بار اپنے کو خود دفن کرنے
رکھے دوش پر اک گڑانسا گیا ہوں
جہاں سینکڑوں مجھ سے پہلے گڑے تھے
اسی قبر میں لاکے ٹھانسا گیا ہوں
سمجھ میں آئے تو آغا سمجھ لو
میں ہستی کا کرتا خلاصہ گیا ہوں

اور آغا صاحب کے اس خلاصے کے ساتھ ہمارا آج کا پروگرام ختم ہوتا ہے۔

☆☆☆

قصہ ایک بہت بولنے والے کچھوے کا

یہ قصہ ہے ایک کچھوے کا' بہت بولنے والے کچھوے کا جو بحر ہند میں ایک چھوٹے سے ٹاپو پر رہتا تھا۔ چونکہ بہت بولنے والے' بے موقع بولنے والے' خوامخواہ بولنے والے کچھوے کسی بھی ملک میں ہو سکتے ہیں' اس لیے یہ کہانی غور سے سنائی جائے بچوں کو بھی۔ ان کو بھی جو اپنے کو بچہ نہیں سمجھتے۔

ہر چند کہ یہ کچھوا جواں عمر ہی تھا ابھی مشکل سے اس نے اپنی زندگی کے پہلے سو سال پورے کیے تھے۔ لیکن بڈھوں کی طرح بک جھک کی عادت اسے ہو گئی تھی۔ اور سر پر اپنی عظمت کا سودا سوار ہو گیا تھا۔ سبھی ملنے جلنے والوں کی جان اس سے زچ تھی۔ سب سے زیادہ اس کی بیوی کی۔ آخر کسی نے اسے مشورہ دیا کہ نیک بخت فلاں دلدل کے پاس ایک سیانا لم ڈھینگ کھڑا ہے' بہت دانش مند ہے' اس سے جا کر اپنے میاں کی اصلاح کا نسخہ پوچھ۔

☆☆

لم ڈھینگ نے اس بی بی کی بات گمبھیرتا سے سنی اور سوچ میں پڑ گیا۔ اس کی بی بی کا کہنا تھا کہ میاں کے سر پر کوئی آسیب سوار ہو گیا ہے۔ اس کو یہ ٹاپو بہت چھوٹا نظر آنے لگا ہے۔ پدرم سلطان بود کی رٹ لگائے رکھتا ہے۔ اس کے کسی پرکھے نے کسی خرگوش کو

دوڑنے میں زک دی ہوگی۔ یہ بھی کسی خرگوش کے ساتھ دوڑنے لگا اور اسے ہرانا چاہتا ہے۔

''کچھوا اور خرگوش کو زک؟''

''اجی آپ نے وہ حکایت لقمان نہیں پڑھی کیا۔؟ اس میں یہ قصہ ہے۔ یہ اسی اللہ ماری کتاب کو پڑھتا اور جاپتا رہتا ہے۔''

''اچھا اچھا میں سمجھ گیا۔ لیکن بی بی وہ تو جانے کون جگ کی بات ہے اور لقمان کے قصے تو پھر لقمان کے قصے ہیں۔ ان پر اعتبار نہ کرنا چاہیے۔''

''لیکن یہ بات اس کی سمجھ میں آئے تو۔'' کچھون نے رونکھی ہو کر کہا۔

لم ڈھینگ نے کہا۔ ''میں سمجھ گیا۔ کتابیں پڑھ پڑھ کر تمہارے میاں کا مغز الٹ گیا ہے' خیر دیکھو۔ کوئی علاج سوچتے ہیں۔ کوئی نسخہ نکالتے ہیں۔''

یہ کہہ کر لم ڈھینگ نے اپنی چونچ کو اپنے پروں میں لے لیا' اور ایک ٹانگ پر کھڑا ہو گیا۔ جو اشارہ تھا اس بات کا کہ انٹرویو ختم۔ اب تخلیہ۔ چنانچہ کچھون اپنے گھر چلی گئی۔

صاحبو! ابھی لم ڈھینگ منقار زیر پر ہوا ہی تھا اور اس نے پپوٹا بند کیا ہی تھا کہ اسے کچھ شور سنائی دیا۔ اس نے آنکھ کے کونے سے دیکھا کہ وہی جھکی کچھوا ہے' اور اسی سے مخاطب ہے۔

''اے میاں لم ڈھینگ ایک ٹانگ پر کیوں کھڑے ہو۔ اماں تھک جاؤ گے۔ اور یہ گردن کیوں پروں میں اڑس رکھی ہے۔ دم گھٹ جائے گا۔ ذرا باہر نکالو تو اپنی چونچ۔''

لم ڈھینگ نے اپنی گردن سیدھی کی۔ اور اپنی دوسری ٹانگ زمین پر ٹکائی اور کہا ''حکم؟''

کچھوے نے کہا۔ ''حکم کی کیا بات ہے' باتیں کرو۔ ادھر ادھر کی سناؤ بڑے میاں۔''

لم ڈھینگ نے کہا۔ ''ابھی تمہاری بی بی آئی تھیں۔''

کچھوے نے کہا۔ ''اچھا؟ ارے میں تو اسے کئی دن سے کہہ رہا تھا کہ کسی بیانے کے پاس جاؤ، اسے تو چپ لگی ہے، جانے کیا ہو گیا ہے۔ بولتی ہی نہیں۔ کوئی نفسیاتی عارضہ ہے۔ شاید۔ اس ٹاپو پر تو نفسیاتی علاج کا بندوبست بھی نہیں ہے۔''

کچھوے نے کوئی آدھ گھنٹے اس مسئلے پر تقریر کی کہ اس کی بیوی نارمل نہیں ہے، اس کو کچھ ہو گیا ہے۔ کوئی کمپلیکس ہے جو چپ لگی ہے۔ اس کے لاشعور میں کوئی گڑبڑ ہے۔ وغیرہ۔ اس آدھ گھنٹے میں وہ ایک لمحے کو بھی نہ رکا۔ لم ڈھینگ بے چارا ہونکارا بھرتا رہا۔ کچھوا اپنی بیوی کی شکایات کا دفتر مکمل کر کے بعض ہمسایوں کے بارے میں رطب اللسان ہونے کو تھا کہ لم ڈھینگ نے موقع پا کر کہا۔

''یہ خرگوش کے ساتھ دوڑ لگانے کا کیا قصہ ہے حضرت۔''

کچھوے نے کہا۔ ''ہوں یہ بات میری بی بی نے کہی ہوگی۔ عورت ذات کو باتیں بنانے کے علاوہ آتا ہی کیا ہے، ہاں میں کہتا ہوں، خرگوش کیا چیز ہے، جو میرے سامنے آئے، مجھ سے دوڑ لگائے، ایک بار مڈبھیڑ ہو تو۔''

لم ڈھینگ نے کہا۔ ''یہ ہو تو کیسے ہو۔ اس ٹاپو پر تو کوئی خرگوش ہے نہیں۔''

کچھوے نے کہا۔ ''رونا تو اسی بات کا ہے، میں سوچتا ہوں۔ تیر کر سمندر پار کہیں۔ افریقہ یا ہندوستان جاؤں۔ اس چھوٹے سے ٹاپو پر تو میری صلاحیتیں ضائع ہو رہی ہیں۔ ہے نا؟''

اسے اس ہے نا؟ کا جواب نہ ملا۔ کیونکہ اسی دوران میں لم ڈھینگ نے اپنی ایک ٹانگ پھر اٹھالی تھی۔ اور اپنی گردن کی کنڈلی بنالی تھی۔ کچھوے نے ایک دوبار للکارا پھر چلا گیا۔

☆☆

اگلے روز کچھون پھر لم ڈھینگ کے پاس گئی جو اپنی دونوں ٹانگیں مضبوطی سے زمین

پر جمائے اس کا منتظر تھا۔ لم ڈھینگ نے کہا....

''اے خاتون! کل تو نے لقمان کا ذکر کیا تھا۔ اس پر مجھے ایک حکایت یاد آئی جو مہاتما بدھ سے منسوب ہے، اس میں ایک حل بتایا گیا ہے۔''

''کیا اس سے میرے میاں کا دماغ ٹھیک ہو جائے گا؟'' کچھون نے بے صبری سے کہا۔

''ہاں۔ اس سے یا تو مرض نہیں رہے گا، یا مریض نہیں رہے گا۔ ایک بات تو بہرحال ہوگی۔'' یہ کہہ کر لم ڈھینگ اپنے بے ڈول پر پھڑپھڑاتا اڑ گیا اور ایک سارس سے جا ملا۔ اور پھر یہ دونوں بزرگ اسی چٹان پر جا اترے، یہاں کچھوے میاں الکسا رہے تھے۔

''لو بھی، تمہارے دل کی مراد پوری ہوئی جا رہی ہے، میں اور سارس تمہیں کسی ایسی جگہ پہنچا دیں گے جہاں کوئی خرگوش ہو تاکہ تم اس سے دوڑ لگا سکو اور اپنی حسرت نکال سکو۔''

''یہ تو مزے آ گئے۔'' کچھوے نے خوش ہو کر کہا۔ ''لیکن تم مجھے لے جاؤ گے کیسے؟''

''یہ کچھ مشکل نہیں، البتہ تمہیں تھوڑی دیر کو چپ رہنا ہوگا۔ اپنی ٹر کو بند رکھنا ہوگا۔ چپ رہ لو گے کیا؟''

''ہاں، ہاں کیوں نہیں؟'' کچھوے نے کہا۔ ''رہ لیں گے۔ چپ بھی۔''

☆☆

لم ڈھینگ کسی درخت کی ٹہنی ڈھونڈ کر لایا۔ اور کچھوے سے کہا۔ ''لو اس کو مضبوطی سے اپنے دانتوں میں تھام لو۔'' کچھوے نے اس پر دانت جمائے۔ ایک طرف سے لم ڈھینگ نے اسے اپنی چونچ میں تھاما، دوسری طرف سے سارس نے، اور اسے لے

اڑے۔

چند گھنٹے کی اڑان کے بعد یہ لوگ کسی ساحل پر... آن اترے' کچھ بچوں نے دیکھا تو تالیاں بجائیں۔ "واہ جی واہ! اچھا تماشا ہے۔ دو پرندے ایک کچھوے کو لیے اڑے جا رہے ہیں۔"

کچھوے سے ضبط نہ ہو سکا۔ منہ کھول کر بولا۔

"ارے چپ رہو شیطان کے بچو۔"

ٹہنی اس کے منہ سے نکل گئی۔ اور کچھوے نے لڑھکنیاں کھاتے ہوئے زمین کا رخ کیا۔

لم ڈھینگ نے چچ چچ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ نسخہ تو ناکام ہو گیا۔ مرض کے بجائے مریض چلا گیا۔ نیچے پتھریلی زمین ہے' ابھی اس کے ٹکڑے اڑ جائیں گے۔ کھوپڑی چیخ جائے گی۔"

☆☆

وہ بے چارے تو افسوس کرتے ہوئے لوٹ گئے۔ اب کچھوے کا ماجرا سنو۔ کچھوا زمین کے بجائے ایک نرم جھاڑی پر گرا۔ اور وہاں سے لڑھکتا ہوا.... غڑاپ سے پانی کے اندر۔

یکایک اس کے کان میں آواز آئی' خوش آمدید۔ جی آیاں نوں۔ شاہی شوربے کے جوہڑ میں' آمد مبارک ہو۔" یہ کسی مینڈک کی آواز تھی۔

"کیا کہا؟ کیا بکواس کی تم نے' کیا جوہڑ؟" کچھوے نے ڈانٹ پلائی۔

"شوربے کا جوہڑ۔" مینڈک ٹرایا۔ "اس ملک کے بادشاہ کو طرح طرح کے شوربوں کا شوق ہے' اس کے خانساماں نے یہ جوہڑ بنا رکھا ہے' اس میں سب طرح کے جانور ہیں۔ صبح کو خانساماں آتا ہے' اور جال ڈالتا ہے' لیکن تم کو ڈرنے کی کوئی بات

نہیں۔ اس وقت ایک کونے میں دبک جاؤ۔ میں بھی تو کئی برس سے یہ ترکیب کیے پڑا ہوں۔ گھڑی بھر کو دم سادھ لیتا ہوں' اور مزے کرتا ہوں' تین وقت کھانا ملتا ہے' اس جوہڑ میں جانوروں کو۔"

☆☆

کچھوا منہ سے تو کچھ نہ بولا اور جی ہی جی میں کہا۔

"پچھلی بار تو جان ہی چلی گئی تھی۔ اب کے نہیں بولوں گا۔"

اگلی صبح خانساماں بہادر جوہڑ پر آئے اور اپنا جال پھینکا کچھوے میاں ایک کونے میں دبک رہے۔

خانساماں بہادر بڑبڑا رہے تھے "بادشاہ نے تو کچھوے کے شوربے کی فرمائش کی ہے' لیکن کچھوا کہاں سے لاؤں۔ بام مچھلی مل جائے تو اس کا شوربہ بنالوں' وہ بھی اچھا ہوتا ہے' بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ کچھوے کے شوربے سے ہزار گنا زیادہ لذیذ ہوتا ہے' بادشاہ ایک بار پی لے گا تو کچھوے کا نام بھی نہ لے گا۔"

کچھوے سے ضبط نہ ہو سکا' کمین گاہ سے نکل آیا' اور بولا۔ "دماغ خراب ہو گیا ہے کیا؟ ساری دنیا کا سب سے اچھا شوربہ...."

☆☆☆

کچھ انڈوں کی طرف داری میں

دنیا میں یہ بحث ہمیشہ سے چلی آ رہی ہے کہ انڈا پہلے یا مرغی۔ کچھ لوگ کہتے ہیں انڈا۔ کچھ کا کہنا ہے مرغی۔ ایک کو ہم مرغی اسکول یا فرقہ مرغیہ کہہ سکتے ہیں۔ دوسرے کو انڈا اسکول۔ ہمیں انڈا اسکول سے منسلک سمجھنا چاہیے۔ ملتِ بیضا کا ایک فرد جاننا چاہیے۔ ہمارا عقیدہ اس بات میں یہ ہے کہ اگر آدمی تھانے دار یا مولوی یعنی فقیہ شہر ہو تو اس کے لیے مرغی پہلے اور ہم ایسا غریب شہر ہو تو اس کے لیے انڈا پہلے اور غریب شہر سے بھی گیا گزرا ہو تو نہ اس کی دسترس مرغی تک ہو سکتی ہے نہ انڈا اس کی گرفت میں آ سکتا ہے۔ اسے اپنی ذات اور اس کی بقا کو ان چیزوں سے پہلے جاننا چاہیے مقدم رکھنا چاہیے۔

☆☆

ایک زمانے میں ہمارا دھیان کبھی کبھی مرغی کی طرف بھی جایا کرتا تھا۔ لیکن جب سے بکری کے دام گائے کی قیمت کے برابر ہوئے ہیں اور مرغی بکری کے دام پانے لگی ہے اور انڈا مرغی کے بھاؤ دستیاب ہونے لگا ہے ہمارے لئے انڈا ہی مرغی ہے۔ ہم وحدت الوجود کی منزل میں آ گئے ہیں۔ انڈا یوں بھی بڑی خوبیوں کی چیز ہے۔ اس میں سفیدی ہوتی ہے۔ اس میں زردی ہوتی ہے۔ اس میں چونا ہوتا ہے۔ اس میں پروٹین

ہوتی ہے۔ اسے دانہ نہیں ڈالنا پڑتا۔ یہ بیٹ نہیں کرتا۔ بلیاں اس کی جان کی خواہاں نہیں ہوتیں۔ اس کے لیے ڈربا نہیں بنوانا پڑتا۔ اس کے خول پر رنگ کر کے اسے گھر میں سجا سکتے ہیں۔ ہاں کبھی کبھی یہ گندا ضرور نکل جاتا ہے۔ سو اسے آسانی سے اٹھا کر باہر گلی میں پھینکا جا سکتا ہے۔ علامہ اقبال بھی جب نئی تہذیب کے کسی گندے انڈے کو دیکھتے تھے۔ یہی کہا کرتے تھے۔ افسوس کہ پرانی تہذیب کے گندے انڈوں کے متعلق انہوں نے اپنے کلام میں کوئی واضح ہدایات نہیں چھوڑیں۔ اس لیے ان کے عقیدت مند ان کو سنبھال سنبھال کر رکھے جا رہے ہیں۔

☆☆

اقبال کے ایک شارح نے تو اس شعر کی مدد سے علامہ اقبال کی گھریلو زندگی پر بھی پورا مقالہ لکھ دیا ہے۔ آج کل دستور یہی ہے کہ غالب کی زندگی معلوم کرنی ہے۔ تو اس کے دیوان سے اخذ کرو کہ وہ شہر میں بے آبرو پھرا کرتے تھے۔ ڈھول دھپا اور پیش دستی کیا کرتے تھے۔ در کعبہ سے الٹے پھر آیا کرتے تھے۔ سیدھے نہیں۔ اور مرنے کے بعد بھی بولا کرتے تھے۔

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ

وغیرہ وغیرہ۔ ان صاحب نے لکھا ہے کہ علامہ اقبال ایک روز بازار سے نئی تہذیب کے کچھ انڈے لے کر آئے۔ ان کی بیوی آملیٹ بنانے بیٹھیں تو انہیں دوسرا مصرع پڑھنا پڑا۔

ع نئی تہذیب کے انڈے ہیں گندے

اس پر علامہ موصوف نے ترکی بہ ترکی یعنی مصرع بہ مصرع ہدایت کی کہ ان کو۔

اٹھا کر پھینک دو باہر گلی میں

☆☆

یہ تحقیق یہاں ختم نہیں ہو جاتی۔ کیونکہ اتنی سی بات کو ہر عامی بھی سمجھ سکتا ہے۔ شارح موصوف کا کہنا ہے کہ شاعر کا گھر کسی گلی میں تھا۔ یہ شعر لازماً ان دنوں کا ہے جب علامہ مرحوم نے میوروڈ پر ابھی اپنی کوٹھی نہیں بنائی تھی۔ ورنہ وہ یہ فرماتے کہ اٹھا کر پھینک دو باہر سڑک پر۔ جناب محقق نے علامہ اقبال کی زبان میں نقص بھی دریافت کیا ہے کہ باہر کا لفظ زاید ہے کیونکہ گلی گھر کے اندر نہیں ہوتی۔ مزید لکھا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کو ہر معاملے میں خوامخواہ اپنی رائے دینے کی عادت تھی ورنہ گندے انڈے کو گلی میں پھینکنے کا فیصلہ ان کی بی بی خود بھی کر سکتی تھیں۔

☆☆

شارح موصوف نے یہ بھی لکھا ہے کہ یہ شعر علامہ اقبال مرحوم کے ابتدائے جوانی کا ہے۔ جب انہیں پہلوانی اور کسرت اور کرتب بازی سے دلچسپی تھی۔ وہ بھاری بھاری وزن کو اٹھا کر دو چار بار گردش دیتے تھے۔ پھر پھینکتے تھے۔ یہ ان کی عادت ثانیہ بن چکی تھی۔ اس لیے کہا ہے کہ اٹھا کر پھینک دو۔ صرف ''پھینک دو'' کہنا کافی نہیں سمجھا۔ معاملہ انڈوں ہی کا کیوں نہ تھا۔ ہمارے خیال میں اس شعر سے ابھی اور معنی نچوڑنے کی بھی گنجائش ہے۔ علامہ مرحوم کو اپنے باطن کی صفائی کی طرف زیادہ دھیان رہتا تھا۔ باہر کی صفائی کا کچھ خیال نہ کرتے تھے۔ ورنہ وہ یہ کبھی نہ فرماتے کہ انڈے اٹھا کر باہر گلی میں پھینک دو۔ انہیں کوڑے کے ڈرم میں پھینکنا چاہیے تھا۔ باہر کسی بھلے آدمی کی اچکن پر گر جاتے تو بڑا فضیحتا ہوتا۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ہماری قوم کو علامہ مرحوم کی ہر ہدایت پر آنکھ بند کر کے عمل کرنا چاہیے۔ ہماری رائے میں اپنی عقل کا واجبی استعمال بھی کر لینا چاہیے۔ تھوڑی احتیاط بھی لازم ہے۔ ہر خوشۂ گندم کو جلانے، مرمر کی سلوں سے ناخوش و بیزار ہونے اس رزق سے موت اچھی ہونے اور گندے انڈے گلی میں اٹھا کر پھینک دینے کے متعلق اشعار اس کی محض چند مثالیں ہیں۔

آج انڈوں کی طرف رہ رہ کر ہمارا دھیان جانے کی کئی وجہیں ہیں۔ ایک تو سردی دوسرے حکومت کا یہ اعلان کہ گوشت اور دودھ کی طرح انڈوں کی بھی قیمتیں مقرر کی جا رہی ہیں تاکہ مقررہ قیمتوں پر نہ ملیں۔ تیسرے شاد عارفی مرحوم کا ایک نادرہ کار شعر ہماری نظر سے گزرا ہے۔ صیاد اور قفس اور نشیمن کے مضمون بہت شاعروں نے باندھے ہیں۔ نئے رنگ اور نئے ڈھنگ سے بھی باندھے ہیں۔ خود علامہ اقبال مرحوم نے بھی ایک بلبل کی فریاد لکھی ہے۔ لیکن اس مضمون کے جملہ تعلقات پر کسی کی نظر نہیں گئی تھی۔ فرماتے ہیں شاد عارفی رام پوری۔

انہیں بھی ساتھ لیتا جا، کہیں ٹکیاں بنا لینا
ارے صیاد دو انڈے بھی رکھے ہیں نشیمن میں

☆☆

انڈے کا مضمون تو ختم ہوا لیکن اپنے دوست عنقا کے شکریے کے ساتھ شاد عارفی مرحوم کے چند اور اشعار۔

☆☆

تا چند باغبانیٔ صحرا کرے کوئی
لیکن سوال یہ ہے کہ پھر کیا کرے کوئی

☆☆

جناب شیخ ہی اب رہ گئے ہیں لے دے کے
وہ دن گئے کہ کسی برہمن پہ چوٹ کروں

☆☆

ستم گر کو میں چارہ گر کہہ رہا ہوں
غلط کہہ رہا ہوں مگر کہہ رہا ہوں

☆☆

آج ایک سبق جغرافیے کا.........

گلیلیو کی حرکت کولمبس کی غلطی پنڈت جی کے آسن!

جغرافیہ میں سب سے پہلے تو یہ بتایا جاتا ہے کہ دنیا گول ہے' ایک زمانے میں بے شک یہ چپٹی ہوتی تھی' پھر گول قرار پائی۔ گول ہونے کا فائدہ یہ ہے کہ لوگ مشرق کی طرف سے جاتے ہیں' مغرب کی طرف جانکلتے ہیں۔ کوئی ان کو پکڑ نہیں سکتا۔ اسمگلروں' مجرموں اور سیاست دانوں کے لیے بڑی آسانی ہوگئی۔

ہٹلر نے زمین کو دوبارہ چپٹا کرنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن کامیاب نہیں ہوا۔

پرانے زمانے میں زمین گل محمد کی طرح ساکن بھی ہوتی تھی۔ سورج اور آسمان وغیرہ اس کے گرد گھوما کرتے تھے۔ شاعر کہتا ہے۔ ''رات دن گردش میں ہیں سات آسمان' پھر گلیلیو نامی ایک شخص آیا'' اور اس نے زمین کو سورج کے گرد گھمانا شروع کردیا۔ پادری بہت ناراض ہوئے کہ یہ ہم کو کس چکر میں ڈال دیا ہے۔ گلیلیو کو تو انہوں نے قرار واقعی سزا دے کر آئندہ اس قسم کی حرکات سے روک دیا زمین کو البتہ نہیں روک سکے۔ برابر حرکت کیے جارہی ہے۔

شروع میں دنیا میں تھوڑے ہی ملک تھے' لوگ خاصے امن چین کی زندگی بسر کرتے

تھے۔ پندرھویں صدی میں کولمبس نے امریکا دریافت کیا۔ اس کے بارے میں دو نظریے ہیں' کچھ لوگ کہتے ہیں کہ اس کا قصور نہیں۔ یہ ہندوستان کو یعنی ہمیں دریافت کرنا چاہتا تھا' غلطی سے امریکہ کو دریافت کر بیٹھا۔ اس نظریے کو اس بات سے تقویت ملتی ہے' کہ ہم ابھی تک دریافت نہیں ہو پائے۔

دوسرا فریق کہتا ہے کہ نہیں کولمبس نے جان بوجھ کر حرکت کی یعنی امریکا دریافت کیا۔ بہر حال اگر یہ غلطی بھی تھی تو بہت سنگین غلطی تھی کولمبس تو مر گیا' اس کا خمیازہ ہم لوگ بھگت رہے ہیں۔

مشق

ذیل کے پہاڑوں' دریاؤں' صحراؤں وغیرہ پر مختصر نوٹ لکھو' کوہِ ندا' بحرِ رمل' دریائے فصاحت۔ دشتِ جنوں' تنگنائے غزل۔ اب ایک دو ملکوں کا احوال۔

پاکستان

حدود اربعہ: پاکستان کے مشرق میں سیٹو ہے' مغرب میں سنٹو۔ شمال میں تاشقند اور جنوب میں پانی یعنی جائے مفر کسی طرف نہیں۔

پاکستان کے دو حصے ہیں۔ مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان۔ ایک دوسرے سے بڑے فاصلے پر ہیں' کتنے بڑے فاصلے پر ہیں اس کا اندازہ اب ہو رہا ہے' ان کی سرحدیں حسبِ ذیل ہیں۔

مغربی پاکستان کے شمال میں پنجاب' اور جنوب میں سندھ' مشرق میں ہندوستان اور مغرب میں سرحد اور بلوچستان ہیں۔ یہاں پاکستان خود کہاں واقع ہے' اور واقع ہے بھی کہ نہیں' اس پر آج کل ریسرچ ہو رہی ہے۔

پر جمائے اس کا منتظر تھا۔ لم ڈھینگ نے کہا....

"اے خاتون! کل تو نے لقمان کا ذکر کیا تھا۔ اس پر مجھے ایک حکایت یاد آئی جو مہاتما بدھ سے منسوب ہے' اس میں ایک حل بتایا گیا ہے۔"

"کیا اس سے میرے میاں کا دماغ ٹھیک ہو جائے گا؟" کچھون نے بے صبری سے کہا۔

"ہاں۔ اس سے یا تو مرض نہیں رہے گا' یا مریض نہیں رہے گا۔ ایک بات تو بہر حال ہو گی۔" یہ کہہ کر لم ڈھینگ اپنے بے ڈول پر پھڑ پھڑاتا اڑ گیا اور ایک سارس سے جا ملا۔ اور پھر یہ دونوں بزرگ اسی چٹان پر جا اترے' یہاں کچھوے میاں الکسا رہے تھے۔

"لو بھئی' تمہارے دل کی مراد پوری ہوئی جا رہی ہے' میں اور سارس تمہیں کسی ایسی جگہ پہنچا دیں گے جہاں کوئی خرگوش ہو تاکہ تم اس سے دوڑ لگا سکو اور اپنی حسرت نکال سکو۔"

"یہ تو مزے آ گئے۔" کچھوے نے خوش ہو کر کہا۔ "لیکن تم مجھے لے جاؤ گے کیسے؟"

"یہ کچھ مشکل نہیں' البتہ تمہیں تھوڑی دیر کو چپ رہنا ہو گا۔ اپنی ٹرٹر کو بند رکھنا ہو گا۔ چپ رہ لو گے کیا؟"

"ہاں' ہاں کیوں نہیں؟" کچھوے نے کہا۔ "رہ لیں گے۔ چپ بھی۔"

☆☆

لم ڈھینگ کسی درخت کی ٹہنی ڈھونڈ کر لایا۔ اور کچھوے سے کہا۔ "لو اس کو مضبوطی سے اپنے دانتوں میں تھام لو۔" کچھوے نے اس پر دانت جمائے۔ ایک طرف سے لم ڈھینگ نے اسے اپنی چونچ میں تھاما' دوسری طرف سے سارس نے' اور اسے لے

مشرقی پاکستان کے چاروں طرف آج کل مشرقی پاکستان ہی ہے۔

بھارت

یہ بھارت ہے۔ گاندھی جی یہیں پیدا ہوئے تھے۔ لوگ ان کی بڑی عزت کرتے تھے' ان کو مہاتما کہتے تھے' چنانچہ مار کر ان کو یہیں دفن کر دیا' اور سمادھی بنا دی' دوسرے ملکوں کے بڑے لوگ آتے ہیں تو اس پر پھول چڑھاتے ہیں۔ اگر گاندھی جی نہ مرتے' یعنی نہ مارے جاتے تو پورے ہندوستان میں عقیدت مندوں کے لیے پھول چڑھانے کی کوئی جگہ نہ تھی۔ یہی مسئلہ ہمارے یعنی پاکستان والوں کے لیے بھی تھا۔ ہمیں قائداعظم کا ممنون ہونا چاہیے کہ خود ہی مر گئے' اور سفارتی نمائندوں کے پھول چڑھانے کی ایک جگہ پیدا کر دی' ورنہ شاید ہمیں بھی ان کو مارنا ہی پڑتا۔

بھارت بڑا امن پسند ملک ہے۔ جس کا ثبوت یہ ہے کہ اکثر ہمسایہ ملکوں کے ساتھ اس کے سیز فائر کے معاہدے ہو چکے ہیں۔ ۱۹۶۵ء میں ہمارے ساتھ ہوا۔ اس سے پہلے چین کے ساتھ ہوا۔ امن اور شانتی اور پنچ شیلا وغیرہ کا اسے ایسا پاس ہے کہ کوئی زبردست آئے تو فوراً صلح کر لیتا ہے' کوئی کمزور ہو تو اور بات ہے۔

بھارت کے بادشاہوں میں راجہ اشوک اور راجہ نہرو مشہور گزرے ہیں۔ اشوک سے ان کی لاٹ اور دہلی کا اشوکا ہوٹل یادگار ہیں' اور نہرو جی کی یادگار مسئلہ کشمیر ہے' جو اشوک کی تمام یادگاروں سے زیادہ مضبوط اور پائیدار معلوم ہوتا ہے۔ راجہ نہرو بڑے دھرماتما آدمی تھے صبح سویرے اٹھ کر شیر شک آسن کرتے تھے یعنی سر نیچے اور ٹانگیں اوپر کر کے کھڑے ہوتے تھے' رفتہ رفتہ ان کو ہر معاملے کو الٹا دیکھنے کی عادت ہو گئی۔ حیدر آباد کے مسئلے کو انہوں نے رعایا کے نقطہ نظر سے دیکھا اور کشمیر کے مسئلے کو راجا کے نقطہ نظر سے۔ یوگ میں طرح طرح کے آسن ہوتے ہیں۔ ناواقف لوگ ان کو

قلابازیاں سمجھتے ہیں۔ نہرو جی نفاست پسند بھی تھے۔ دن میں دوبار اپنے کپڑے اور قول بدلا کرتے تھے۔

☆☆

بھارت ایک سیکولر ملک ہے۔ یہاں ہر مذہب کو آزادی ہے۔ کہ اپنے کو ہندومت میں مدغم کردے۔

بھارت کا مقدس جانور گائے ہے۔ بھارتی اسی کا دودھ پیتے ہیں۔ اسی کے گوبر سے چوکا لیپتے ہیں' اور اس کو قصائی کے ہاتھ بیچتے ہیں کیونکہ خود وہ گائے کو مارنا یا کھانا پاپ سمجھتے ہیں۔ آدمی کو بھارت میں مقدس جانور نہیں گنا جاتا' فقط جانور گنا جاتا ہے۔

☆☆☆

اس کوچے میں

دلی کے سوداگروں کے ایک طبقے کے متعلق مشہور ہے کہ وہ جوتا بیچتے ہیں تو گاہک سے قسم کھاتے ہیں کہ اس میں ان کا منافع فقط آٹھ آنے ہے۔ یہ لوگ عموماً متشرع وضع کے ہوتے ہیں' اکثر حاجی بھی' نماز کا بھی بالعموم التزام' خلافِ شرع تھوکتے بھی نہیں۔ پھر یہ آٹھ آنے کے معمولی منافع کا کاروبار کیسے چلتا ہے۔

وہ یوں کہ دکان دار نے موچی سے جوتا دس روپے میں خریدا۔ اس میں ایک روپیہ منافع لے کر اپنی بی بی کے ہاتھ بیچ دیا۔ بی بی نے ایک روپیہ نفع پر بیٹے کے ہاتھ بیچا۔ بیٹے نے بھی ایک روپے سے زیادہ نفع چارج کرنا پسند نہ کیا اور جوتا باپ کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ یعنی ہر پھر کے وہیں آ گیا۔ لیکن اب لاگت تیرہ روپے ہو چکی تھی۔ اب کیا لینے والا اس پر آٹھ آنے بھی نفع نہ لے۔ اب اس کاروبار پر کہیں انگلی نہیں رکھی جا سکتی۔ قسم بھی سو فی صدی سچی۔ لیجیے احتیاط پسند صداقت شعار قسم کھاتے ہوئے' اشارہ کر کے کہتے ہیں قسم ہے اس کتاب کی (جو جزدان میں لپٹی طاق میں رکھی ہوئی ہے)' اب گاہک میں تو اتنا تجسس نہیں ہوتا کہ جزدان کھول کر اس میں سے مولوی عبد الحق کی ڈکشنری نکالے لہٰذا اگر قسم جھوٹی بھی ہے تو ڈکشنری کی ہے۔ اس سے کیا ضرر پہنچ سکتا ہے۔

اب کے عصمت میں بہلول قادری صاحب نے ایمان کی سوداگری کے عنوان سے خداکے ساتھ بندوں کی ٹھگی کرنے کی کچھ مثالیں دی ہیں۔ لکھتے ہیں۔

''بہ ظاہر ہمارار جحان مذہب کی طرف ہوتا ہے لیکن اسلامی تعلیمات میں ہمیں یہ تلاش رہتی ہے کہ کہاں تک چیزیں جائز کی جا سکتی ہیں۔ مثلاً ایک ایرانی نے کہا ہے کہ آپ کے یہاں شراب کا استعمال بہت کم ہے حالانکہ یہ حرام نہیں صرف نجس ہے۔ اور نجس کوئی چیز منہ میں چلی جائے تو تین بار کلی کرنے سے منہ پاک ہو جاتا ہے۔

بعض بزرگ کہتے ہیں کہ جنت کے سازوسامان اور انتظامات کی جھلکیاں تو دنیا میں بھی موجود ہیں مثلاً سورۃ الرحمٰن میں لکھا ہے کہ خیموں میں حوریں بیٹھی ہیں۔ اب اس منظر کی تلاش میں ہم دل میں نیک نیت لیے کراچی میں سینڈس پٹ ' ہاکس بے کا چکر لگاتے ہیں تو وہاں خیمہ نما جھونپڑوں میں واقعی حور پیکر ہستیوں کی جھلکیاں نظر آجاتی ہیں۔ ایسے موقع پر ہمارا نفس اس کا قائل نہیں رہتا کہ نامحرم کو دیکھنا منع ہے۔ کیونکہ کبھی کبھی نفس کو چھٹی دے کر آزاد چھوڑ دینے کے بارے میں بھی کتابوں میں لکھا ہے۔

؎ لازم ہے دل کے ساتھ رہے پاسبان عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

زکوٰۃ دینا فرض ہے۔ مان لیجیے کہ حساب سے ساٹھ ہزار روپے ہوتے ہیں مگر یہ رقم تو بہت بڑی ہے۔ اور یہ کسی کو کیسے دے دی جائے۔ بہت سوچنے کے بعد ایک تدبیر سوجھی ہے جو ناجائز معلوم نہیں ہوتی۔ آٹے سے بھری ہوئی ایک بوری منگائیے اور ساٹھ ہزار روپے کا نوٹ آٹے کے اندر چپکے سے دبا دیجیے۔ اب کسی غریب کو بلا کر کہیے کہ یہ ایک بوری آٹا زکوٰۃ کا ہے اسے لے جاؤ۔ اگر یہ بوری تمہارے لیے بھاری ہے اور تم میرے ہاتھ بیچنا چاہو تو اس کی قیمت لے لو۔ ظاہر ہے وہ غریب روپے لینے

کے لیے فوراً راضی ہو جائے گا۔ اس کو ایک بوری آٹے کی قیمت دے کر رخصت کیجیے اور اپنے ساٹھ ہزار روپے کے نوٹ نکال لیجیے۔ اس طریقے سے واجب الادا زکوٰۃ کا فریضہ بھی پورا ہو گیا اور روپے بھی بچ گئے۔ اگر کوئی کہے کہ اس غریب کو یہ بتایا نہیں گیا کہ آٹے کے اندر ساٹھ ہزار روپے چھپے ہیں تو ہم یہ کہہ کر بچ جائیں گے کہ اس غریب نے پوچھا ہی نہیں کہ آٹے کے اندر کیا ہے ' ورنہ ہم سچ سچ ضرور بتا دیتے۔ اس معاملے میں کوئی گناہ سرزد ہوا بھی تو وہ گناہ صغیرہ ہی ہوگا۔

جب ہم کوئی بڑے افسر بن جاتے ہیں تو سارے محلے میں جتا دیتے ہیں کہ رشوت ہم بالکل نہیں لیتے۔ ہاں تحفے تحائف لینے میں کچھ حرج نہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو شہنشاہِ روم نے بہت قیمتی تحائف بھیجے تھے۔ انہوں نے لینے سے انکار نہیں کیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ تو اتنے اعلا مرتبت خلیفہ تھے کہ زندگی ہی میں ان کو جنتی ہونے کی بشارت ملی تھی۔ اگر انہوں نے شہنشاہ روم کے تحائف کا ذاتی استعمال نہیں کیا اور تمام چیزوں کو بیت المال میں جمع کرا دیا تو یہ بات ان کے شایان شان تھی۔ ہم ان کی ریس کر سکتے ہیں؟ اور پھر یہاں کوئی بیت المال تو ہے نہیں اتنے سارے تحفوں کا سامان گھر میں نہ رکھیں تو کہاں رکھیں؟ کس کو دیں؟''

☆☆☆

ایک سوالنامے کا جواب نامہ

آج ہمیں ایک بڑا سا جہازی سائز کا کارڈ ڈاک میں ملا ہے جس کے ایک طرف تو ہمارا پتا لکھا ہے۔ مکرمی معظمی وغیرہ القابات کے ساتھ دوسری طرف کارڈ چھاپنے اور بھیجنے والے کا نام ہے۔

خدمتِ عوام پارٹی۔ (غیر سیاسی)

اس کے نیچے چند سوالات بھی درج ہیں۔

۱۔ کیا آپ ادارے یا محکمے کا سامان اسٹیشنری وغیرہ اپنے ذاتی استعمال کے لیے گھر تو نہیں لے جاتے؟

۲۔ کیا آپ اپنے دفتری اوقات کو خوش گپیوں یا دوستوں کی خاطر تواضع میں تو ضائع نہیں کرتے؟

۳۔ کیا آپ دفتر کا کام ختم ہو جانے سے پہلے کھسک تو نہیں جاتے؟

۴۔ کیا آپ اپنے دفتر کا کام جان بوجھ کر تاخیر سے تو نہیں کرتے؟

۵۔ کیا آپ کسی عزیز یا محترمہ کو اپنے سرکاری ٹیلی فون سے مفت کال کرنے کی اجازت تو نہیں دیتے؟

۶۔ کیا آپ اپنے دفتر میں کام کرنے والی خواتین کو اس نگاہ احترام سے دیکھتے ہیں

جیسے اپنی خواتین کو؟

۷۔ کیا تنخواہ لیتے وقت آپ کا ضمیر تو کبھی ملامت نہیں کرتا؟

بعض لوگ منفی ذہنیت کے ہوتے ہیں۔ ہم ان میں سے نہیں ہیں۔ چنانچہ پہلے پانچ سوالات کی حد تک ہمارا جواب اثبات میں ہے۔ بے شک اپنے ادارے کی اسٹیشنری لے جاتے ہیں لیکن اس پر ذاتی استعمال کی تہمت نہیں لگا سکتے۔ ایک تو اس لیے کہ زیادہ تر بچوں کے کام آتی ہے۔ یا اس پر دھوبی کا حساب لکھتے ہیں۔ سو دھوبی کی ذات اور ہماری اپنی ذات میں فرق ہے۔ اگر اس اسٹیشنری سے خطوط لکھتے بھی ہیں تو ہر چند کہ خود لکھتے ہیں لیکن وہ جاتے تو دوسروں کے نام ہیں۔ دوسرے لوگ ہماری ذات کی تعریف میں کیسے آ سکتے ہیں۔

دوسرے سوال میں لفظ ضائع کے استعمال پر ہمیں اعتراض ہے۔ بلکہ ہم اس پر احتجاج کرتے ہیں۔ خوش گپیوں اور دوستوں کے لطف صحبت سے دماغ تازہ ہوتا ہے۔ اور اگلے روز کام کرنے کے لیے آدمی تازہ دم اور مستعد آتا ہے۔ اگر اگلے روز بھی وہ احباب آ جاتے ہیں تو اس سے اگلے روز سمجھیے۔

اے ذوق کسی ہمدم دیرینہ کا ملنا
بہتر ہے ملاقات مسیحا و خضر سے

تیسرے سوال کا جواب تو اثبات ہی میں ہے لیکن کھسکنے کا لفظ یہاں بے محل ہے۔ ایک سینما میں کوئی صاحب فلم دیکھ رہے تھے وہ تھی، کوئی تعمیری قسم کی۔ چنانچہ خراٹے لینے لگے۔ پاس والے نے منغض ہو کر ان کو جگایا اور ملامت کی کہ بھلے مانس خراٹے لے کر دوسروں کی نیند میں خلل کیوں ڈالتا ہے۔

چپکے سے نکل جانے میں بھی کچھ اسی قسم کی مصلحت ہے۔ کوئی دیکھ لے اور پوچھ لے اور باز پرس کرنے لگے تو خود ہی سوچیے، اس میں کتنا وقت ضائع ہوگا اور وہ سرکاری وقت

ہی ہوگا۔

چوتھے سوال کا جواب بھی ہاں ہے اور حکمت اس میں یہ ہے کہ اگر جھٹ پٹ کام کر دیا جائے تو پھر دفتر کی ضرورت نہیں رہتی۔ تاخیر میں کئی فائدے ہیں' ایک آدمی کا کام کرنے کے لیے پانچ آدمی رکھے جاتے ہیں ملک میں بے روزگاری کم ہوتی ہے۔ تاخیر کے اسباب معلوم کرنے کے لیے کمیشن بیٹھتا ہے۔ اس میں نیا عملہ وملہ بھرتی ہوتا ہے' اس سے بے روزگاری مزید ختم ہوتی ہے۔ پانچویں سوال کے جواب میں ہم کہیں گے۔ یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ جب کسی محترمہ کو ہم خود مفت کال کرتے ہیں' اگر وہ خود آ کر مفت کال کرلے تو کیا مضائقہ ہے۔

اب رہا سوال نمبر ۶ دفتر میں کام کرنے والی عورتیں اگر معمولی صورت کی یا مسن ہیں تو اخلاق کے تقاضے سامنے آ جاتے ہیں کہ ان کو مائیں' بہنیں بیٹیاں سمجھا جائے ویسے آج کل گھر گھاٹ یعنی گھر اور دفتر میں چنداں فرق نہیں رہا۔

مغرب میں تو عام بات ہے۔ کہ اگر کوئی سیکریٹری خوبصورت ہے تو مستقبل قریب میں اپنے افسر کی گھر والی بن جاتی ہے اور گھر اور دفتر کے پردے اٹھ جاتے ہیں۔

ساتویں سوال کا جواب ہے کہ جی نہیں۔ ملامت نہیں کرتا۔ کیا مجال ہے کہ کرے۔ البتہ تنخواہ نہ لیں تو ضرور ملامت کرتا ہے۔

☆☆

یہ سوالات تو ضمنی ہیں کچھ اہمیت نہیں رکھتے۔ اصل چیز خدمت عوام پارٹی ہے۔ بلکہ اس کا غیر سیاسی ہونا ہے۔

ع ویسے ہستی کے مت فریب میں آ جائیو اسدؔ

ہم نے بہت سی پارٹیوں اور جماعتوں اور تحریکوں کو غیر سیاسی سے شروع ہو کر سیاست کا پنجا پکڑتے دیکھا ہے۔ خود اس سوالنامے میں سیاست کے جراثیم بہت

ہیں۔ کل انہی لوگوں کے پاؤں جم گئے تو جھنڈا لے کر نکل آئیں گے کہ دفتروں میں کاہلی اور بے ایمانی اور عدم کارکردگی دور کرنے کے لیے ہمیں اپنی صفوں کو منظم کرنا چاہیے اور عوام کی خدمت اور معاشرے کی اصلاح کے لیے اگلے الیکشن میں کھڑا ہونا چاہیے۔ الیکشن کی بات آئے گی تو دائیں بازو اور بائیں بازو اور اسلام اور سوشلزم کا قضیہ ضرور اٹھے گا۔ ہم نے تو اس سوالنامے کے بے سوچے سمجھے جواب دے دیے۔ قارئین کو احتیاط چاہیے کیونکہ بات سے بات نکلتی ہے۔ اور غیر سیاسی سے سیاسی بنتی ہے۔ سرچشمہ باید گرفتن بہ میل۔ ایک بزرگ بازار میں جا رہے تھے۔ ایک نوجوان نے انہیں سلام کیا۔ وہ چپ رہے اور جواب نہ دیا۔ بزرگ کے ساتھیوں نے کہا۔ "بھلا آپ نے یہ غیر شرعی حرکت کیوں کی۔ سلام کا جواب دینا چاہیے تھا۔" بولے "تم نہیں سمجھتے۔ میں سلام کا جواب دیتا تو وہ اپنا تعارف کراتا اور کہتا' حاجی صاحب آئیے چائے خانے میں چل کر چائے پیجیے۔ اس کی چائے پی کر اسے چائے پلانا میرا فرض ہو جاتا۔ اس کی میرے گھر میں آمد و رفت شروع ہو جاتی۔ میری.... ایک جوان بیٹی ہے۔ میں ایسے اوباش نوجوان کو اپنی بیٹی کا رشتہ ہرگز نہیں دے سکتا۔"

☆☆☆

کام نے نکما کر دیا

ہمارے ہاں چھٹی کا مطلب اتوار ہے۔ چھ دن کام کے' ایک دن آرام کا۔ امریکا میں اور بعض دوسرے ملکوں میں دو دن کی چھٹی کا رواج ہے۔ ہفتہ اور اتوار۔ لیکن امریکا میں تازہ رواج یہ چلا ہے کہ تین دن چھٹی رکھی جائے تا کہ آدمی چار دن کام کرے۔ تین دن اینڈتا رہے یا تاش کھیلے اور جمعرات کا گیا پیر کو کام پر حاضر ہو جائے۔ امریکا والے اس پر بھی زیادہ خوش نہیں اور سوچ رہے ہیں کہ چار دن بھی کام کے لیے کچھ زیادہ ہی ہیں۔

☆☆

اس وقت سینکڑوں کارخانے اور فرمیں ہفتے میں چار دن کا معمول اختیار کر چکے ہیں۔ امید کرنی چاہیے کہ جلد ہی تین دن کا ہفتہ رائج ہو جائے گا۔ تین دن کام۔ چار دن آرام۔ چار دن کے آرام والے کو کوئی دن میں یہ تین دن بھی گراں گزرنے لگیں گے اور کچھ عجب نہیں سال دو سال تک صرف دو دن کا کام رہ جائے۔ اور پھر ایک ہی دن کی نوبت آئے۔ ایک دن فی الحال ضروری معلوم ہوتا ہے کیونکہ یورپ اور امریکا میں ہفتہ وار اجرت اور تنخواہ کا رواج ہے۔ بس پیر کے دن گئے۔ تنخواہ لی۔ کام پر ایک نظر ڈالی۔ کچھ دیر بیٹھے گھڑی دیکھتے رہے کہ کب دفتر کا وقت پورا ہوتا ہے اور ہنستے کھیلتے گھر

آ گئے اور لیٹ گئے تصور جاناں کیے ہوئے۔ سچ یہ ہے کہ ہمیں تو یہ ایک دن کا ہفتہ بھی کھلتا ہے کھڑاک کی معلوم ہوتا ہے۔ کام کا کیا ہے' ہوا نہ ہوا جو کارخانے اتنا حوصلہ دکھا سکتے ہیں' وہ یہ بھی کر سکتے ہیں کہ ایک چپراسی نوکر رکھ لیں جو لوگوں کے گھروں پر تنخواہ دے آیا کرے۔ دفتر کا بہت سا خرچ بچ سکتا ہے۔ میز کرسی کا خرچ۔ بلب کی بجلی پنکھے کی بجلی۔ پنسل۔ قلم دوات کا صرفہ غرض یہ کہ خاصی کفایت ہو سکتی ہے۔ ہمیں سواری الاؤنس نہیں ملتا لیکن اگر ملتا بھی تو ایسے حالات میں بخوشی چھوڑ دیتے۔ اپنے سیٹھ یا فرم کے لیے زیادہ نہیں تو اتنا ایثار تو کرتے ہی۔

☆☆

صاحبو۔ کام نے ہم کو نکما کر دیا۔ ورنہ ہم بھی آدمی تھے عشق کے۔ چھ دن کام۔ اور ساتواں دن کون سا فراغت کا ہوتا ہے۔ اسی سوچ میں گزر جاتا ہے کہ کل پھر کام پر جانا ہے۔ مشقت بھی رہتی ہے صبح صبح اٹھ کر اپنا اور جمیل الدین عالی کا کالم اخبار میں پڑھنا پڑتا ہے۔ سارا مزہ کرکرا ہو جاتا ہے۔ ہمارا اصول زندگی بھر یہ رہا ہے کہ جو کام کل ہو سکتا ہے وہ آج کیوں کیا جائے۔ بلکہ کل کیا تخصیص ہے۔ کیا ہی کیوں جائے۔ اب رہی کمائی۔ کمائی کر کے کھایا تو کیا کھایا۔ ایسے تو سب ہی کھا سکتے ہیں۔ پیسہ ملے تو چھپر پھاڑ کر ملے اور چھپر بھی ہمیں نہ پھاڑنا پڑے۔ قدرت یا قسام ازل یہ تکلف بھی خود ہی کرے۔

☆☆

استاد ذوقؔ نے جو شعر تکلف کے بارے میں کہا ہے۔

اے ذوقؔ تکلف میں ہے تکلیف سراسر
آرام سے ہیں وہ جو تکلف نہیں کرتے

ہمارے خیال میں اس میں تکلف کے بجائے کام کا لفظ زیادہ موزوں ہوگا۔ استاد ذوقؔ کو شعر کے وزن کی مجبوری تھی۔ مس بلبلؔ یہی شعر لکھتیں تو اس میں کام کا لفظ

باندھتیں۔ یہ شعر استاد امام دین گجراتی کے ہاتھ آتا تو وہ اسے ایسے بھی ٹھوک پیٹ کر ٹھیک کر لیتے۔ انہوں نے کام کو اپنے کلام میں کئی جگہ کم باندھا ہے۔ الف کی بچت کر لی ہے۔ اس میں مجبوری کا سوال نہیں تھا' پنجابی میں کام کو کم ہی کہتے ہیں۔ استاد امام دین نے ایک قصیدہ بہ خدمت سمندر خاں سپرنٹنڈنٹ دفتر کمشنر راولپنڈی لکھا تھا جو ان کے دیوان میں شامل ہے (سمندر خان کے دیوان میں نہیں' استاد امام دین گجراتی کے دیوان میں)

سمندر خاں کی خدمت میں پڑا ہے ایک کم میرا
اگر وہ ہوگیا جلدی تو مٹ جائے گا غم میرا

اگر پہلے مصرعے میں کام لکھا جاتا تو دوسرے میں عام لکھنا پڑتا اور شعر بے معنی ہو جاتا اور مطلب تو کام سے ہے۔ سمندر خاں بھی استاد کے ہم زبان تھے' مطلب سمجھ گئے اور ان کا "کم" کر دیا۔

زاں پیشتر کہ کام کے بارے میں اس قسم کی رائے رکھنے سے کوئی صاحب ہمارے بارے میں کوئی غلط رائے قائم کرنے کی کوشش کریں۔ ہم علامہ اقبال مرحوم کو اپنی کمک پر لاتے ہیں کیونکہ ہمارے ہاں ہر غلط صحیح کام کے لیے علامہ مرحوم کے کلام سے گواہی ڈھونڈنے کا دستور ہے۔ خود تو جیسا کہ سب ہی جانتے ہیں۔ یہ ہمیشہ اپنی چارپائی پر پڑے حقہ پیتے اور شعر کہتے رہتے تھے۔ جب ولایت گئے تو یہ دیکھ کر حیران ہوئے کہ ہر شخص کام میں جتا ہوا ہے۔ کسی کو فرصت نہیں کہ بیٹھ کر ان کے شعر سنے۔ دو چار آدمیوں کو روک کر انہوں نے کہا بھی کہ حضرت ابھی ابھی دو شعر کہے ہیں سماعت فرمایئے۔ آپ کا جی خوش ہوگا۔ وہ دامن چھڑا کر چل دیا کہ نا صاحب کام پر جا رہا ہوں۔ آخر جھنجلا کر انہوں نے اپنے دوست شیخ عبدالقادر کو شکایت نامہ لکھ بھیجا۔

مدیر مخزن کو جا کے اقبال کوئی میرا پیام دے دے
جو کام کچھ کر رہی ہیں قومیں انہیں مذاق سخن نہیں ہے

علامہ مرحوم کی تخصیص نہیں۔ ہمارا تجربہ یہی ہے کہ جتنے کام کرنے والے ہیں خواہ وہ ٹھیکیدار ہوں یا کارخانہ دار یا دکاندار سب ہی مذاق سخن سے بے بہرہ یا بدذوق ہوتے ہیں۔ تلاشی لے لیجیے کسی کے ہاں سے ہمارا مجموعہ کلام چاند نگر نہ نکلے گا۔ ہمارے مخدوم حفیظ جالندھری بھی کام کے زیادہ قائل نہیں۔ بلکہ اسے فتنے کی جڑ سمجھتے ہیں۔ ایک جگہ لکھا ہے۔

جاگ کام دیوتا ☆ فتنہ ہائے نو جگا

دیکھیے اقبال اور حفیظ دونوں کتنے اچھے شاعر بنے محض اس لیے کہ کام کے بارے میں ان کا نقطہ نظر کام کرنے والوں کا سا نہ تھا۔ میر تقی میر کو بھی ان کے باوا ہدایت کر گئے تھے کہ بیٹا زندگی بھر عشق کرنا یعنی کام وغیرہ نہ کرنا۔ بیٹے نے یہی کیا۔ اور یہی ہمارے نزدیک ان کی عظمت کا راز ہے۔ اب غیر شاعروں کی مثال لیجیے۔ اگر نیوٹن کام کرنے والا آدمی ہوتا تو کشش ثقل آج تک دریافت نہ ہوتی۔ کسی باغ میں بنچ پر بیٹھ کر الکسا رہا تھا کہ درخت سے سیب گرا۔ اور کوئی ہوتا تو اسے جیب میں ڈال لیا ہوتا۔ کھانے کے بعد کھاتا اور کسی ڈاکٹر کو بھگاتا یا چٹنی مربے کا کوئی کارخانہ قائم کرنے کی سوچتا اور عمر عزیز اسی میں ضائع کر دیتا۔ نیوٹن بس بیٹھا دیکھتا رہا اور سوچتا رہا اور کشش ثقل ایجاد ہوگئی۔ ایک اور شخص تھا جیمز واٹ نامی۔ کیتلی کے پاس بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ بھاپ سے ڈھکن جو ہلنے لگا تو سوچ سوچ کر اس نے بھاپ کی قوت دریافت کر لی۔ اس کے بجائے کوئی مستعد یعنی کام کا آدمی ہوتا تو کوئی بوجھ رکھ کر ڈھکن کو دبا دیتا اور پھر کام کرنے لگتا۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ یہ ریل ویل انجن ونجن وغیرہ کچھ بھی نہ ہوتے۔ گویا ثابت ہوا کہ شاعری کریں تو کام نہ کرنے والے۔ ایجادیں کریں تو کام نہ کرنے والے۔ ارے کسی کام کرنے والے نے آج تک کچھ کیا بھی ہے؟

(یہ کالم ۵ جولائی ۱۹۷۱ء کو لکھا گیا)

☆☆☆

ایک کالم برستے پانی میں

ایک مسافر کا قصہ مشہور ہے کہ جنگل بیاباں میں چلا جارہا تھا چلتے چلتے تھک گیا۔ کہاں سے چلا تھا' کہاں جارہا تھا اور کیوں جارہا تھا۔ گھر میں نچلا بیٹھا حقہ کیوں نہیں پی رہا تھا۔ یہ بات قصے میں مذکور نہیں۔ مذکور ہے تو یہ کہ اس نے آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر دعا کی کہ کوئی سواری بھیج۔ اب آسمان والوں کو یہی ایک کام تھوڑی تھا۔ ان کے پاس درخواستوں اور فرمائشوں کے ڈھیر لگے رہتے ہیں۔ بہرحال یہ کوئی نیک بندہ تھا۔ اس کی درخواست پر حکم ہوا کہ سواری فی الفور بھیجی جائے۔ مسافر کیا دیکھتا ہے کہ ایک گھڑسوار چلا آرہا ہے اور ساتھ اس کے ایک چھوٹا سا بچھیرا ہے۔ اس نے اپنے ہنٹر سے اس مسافر کو ٹھوکا دیا اور کہا ویل کالا آدمی۔ ہمارا بچھیرا تھک گیا ہے' اس کو کندھوں پر بٹھاؤ اور ہمارے ساتھ ساتھ بھاگو۔ اس شخص نے تعمیل ارشاد کی لیکن آسمان والوں سے گلہ کیا کہ بات سمجھنے کی کوشش کرو۔ خوامخواہ الٹے سیدھے حکم جاری کردیتے ہو۔ میں نے سواری نیچے کے لیے مانگی تھی۔ اوپر کے لیے تھوڑا ہی مانگی تھی۔

☆☆

کچھ ایسا ہی اب کے کراچی والوں کے ساتھ ہوا۔ یہاں ایک پائپ لائن ٹوٹنے سے پانی کا توڑا ہوگیا تھا۔ لوگ پانی کے قطرے قطرے کو ترسنے لگے تھے۔ لوگوں نے تیمّم

کر کر کے نمازیں پڑھیں اور دعائیں کیں۔ چاہیے تو یہ تھا کہ کارکنانِ قضاوقدر پائپ لائن کو جوڑ دیتے۔ اپنے پاس سے پانی دینا ہی تھا تو ناپ کر دیتے۔ وہ بھی اعشاری پیمانوں لیٹر وغیرہ سے۔ انہوں نے آسمان کی ٹینکی ہی لنڈھا دی۔ چنانچہ اہل کراچی کے ساتھ وہی ہوا جو کبھی حفیظ جالندھری کے ساتھ ہوا ہوگا بلکہ ہوا تھا۔ جب انہوں نے ایک پیر مرد کے نکاح ثانی پر ایسا ویسا سہرا لکھا تھا۔

جہاں قطرے کو ترسایا گیا ہوں
وہیں ڈوبا ہوا پایا گیا ہوں

ہم اتفاق سے ان دنوں کراچی سے باہر تھے۔ ورنہ کراچی والوں سے کہتے کہ کوئی دل سے دعائیں مت مانگو۔ دعا کے ساتھ اعدادوشمار بھی دیا کرو۔ یہ کہو کہ معمولی پانی چاہیے۔ بارانِ رحمت نہیں چاہیے۔ ہم نے کچھ برسات لاہور میں دیکھی۔ کچھ پنڈی میں پائی۔ وہاں تو پانی پڑتا ہے۔ سڑکیں ڈھل جاتی ہیں۔ لیکن پنجاب کے لوگ اس کے عادی ہیں۔ کراچی والوں کو جب بارانِ رحمت کا کئی سالوں کا کوٹا ایک ہی بار ملتا ہے تو ان کے ذہن میں نہیں سماتا۔ چھاجوں برستا ہے اور چھتوں کو چھلنی کردیتا ہے۔ آدمی کچھ مانگے تو اس کا اپنا ظرف بھی کچھ ہونا چاہیے۔ دینے والی سرکار تو ایسی ویسی ہے نہیں۔ جب دیتی ہے تو چھپّر پھاڑ کر دیتی ہے۔ بہرحال انتظامیہ کے ہر سال کے اس اعلان کے باوجود کہ بارش کی آفات سے نمٹنے کا معقول انتظام کرلیا گیا ہے، جابجا ایمرجنسی سینٹر کھول دیے ہیں۔ پانی کی مجال نہیں کہ غریبوں اور جھگیوں والوں کا بال بیکا کرسکے۔ ہر سال وہی دیتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے۔ چنانچہ اب کے برس بھی یہی ہوا۔

فی الحال یہ کیفیت ہے کہ ایک محلّے کا آدمی دوسرے محلّے کے آدمی سے خیریت پوچھتا ہے تو ان لفظوں میں کہ میاں آج کل کتنے پانی میں ہو؟ وہ کہتا ہے جناب ہم تو پانی پانی ہورہے ہیں۔ یا یہ کہ پانی سر سے گزر گیا ہے یا یہ کہ ہماری کمائی پر پانی پھر گیا

ہے۔ اگر یہ پوچھا جائے کہ کیا کر رہے ہو فی الحال۔ جواب ملتا ہے کہ فی الحال تو آپ کے سامنے پانی بھرتا ہوں۔ مبادا پوچھنے والا سمجھے کہ محاورہ بازی ہو رہی ہے۔ وہ بالٹی بھی دکھاتا ہے۔ بے شک کراچی میں محاورے بولنے والوں کی خاصی آبادی ہے لیکن آج کل پانی کا جتنا کاروبار ہو رہا ہے، لغوی معنوں میں ہو رہا ہے۔

زبان اردو کو اس لحاظ سے بحرِ ناپیدا کنار کہنا چاہیے کہ اس میں پانی کے محاورے بہت ہیں۔ پانی چڑھتا ہے اُترتا ہے، بہتا ہے اور ملتان تک جاتا ہے۔ لوگ اسے پیتے ہیں اور پی پی کر حریفوں کو کوستے ہیں۔ اس کی لہر میں گنّے کا کاروبار ایک مستقل کاروبار ہے۔ لوگ پانی میں آگ تک لگاتے ہیں۔ پانی مانگتے ہیں بلکہ بعض اوقات تو پانی تک نہیں مانگتے۔ پانی سب کچھ کر چکتا ہے تو مر بھی جاتا ہے، چنانچہ پانی مرنا بھی ایک محاورہ ہے۔ جان صاحب کا شعر ہے۔

تیرے دل میں مصری چاہ یوسف بیگ بھیا کی!
نہ کیوں آنکھیں چُرائے مجھ سے، مرتا تجھ میں پانی ہے

ایک اور استاد فرماتے ہیں۔

آنسو تو دامن سے پونچھوں، ہچکی کیوں کر روکوں میں
لاکھ چھپاؤ عشق کو لیکن پانی پھر بھی مرتا ہے

بعض شاعر اور عاشق کہ اندر سے یہ دونوں ایک ہوتے ہیں۔ خود پانی پہ مرتے ہیں۔

لپٹ جاتے ہیں وہ بجلی کے ڈر سے
الٰہی یہ گھٹا دو دن تو برسے

ایک اور شاعر اس مضمون کو یوں باندھتا ہے۔

جاسکا پھر نہ مرے گھر جو وہ دہ جانی آیا
رحمت اللہ کی آئی، جو یہ پانی آیا!

پانی کے چلنے کا ایک اور مضمون بھی سنیے۔

غسل حمام کو کب آئے گا، وہ شوخ غفور
پانی جلتا ہے جدا، آگ جُدا جلتی ہے

اساتذہ کے اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک زمانے میں پانی سستا بھی ہوا کرتا تھا۔ لوگ اسے روپے کی طرح سے بہایا کرتے تھے۔ آج کل کی طرح پیسے اور صراحی کے حساب سے بِکا نہ کرتا تھا۔ کسی کا شعر ہے۔

پیتے ہیں اب جناب مشیخت مآب بھی
پانی کے مول بکنے لگی ہے شراب بھی

شعرا کے حوالے سے یہ بھی معلوم ہوا کہ صرف کپڑا اور گردن ہی ناپنے کا دستور نہ تھا۔ پانی بھی ناپا جاتا تھا۔ مشہور شاعر قلق کا شعر ہے۔

کچھ پتہ ملتا نہیں عشقِ ذقن کو چاہ کا
پانی ناپا آشناؤں نے بہت اس چاہ کا

ایک شعر راسخ کا بھی سنیے کہ مضمون نکالنے کی حد تک ناسخ کے بھائی تھے۔

ہوگیا ہے مرے جلّاد کا خنجر پانی!
کم سے کم ناپ کے پیتا ہوں میں گز بھر پانی

قارئین کرام! ہم پانی کے مضمون کو مزید پانی کرتے لیکن ابر پھر گھر آیا ہے اور پانی پھر برسنے کے آثار ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ ذرا سی تاخیر سے ہمارے اس کالم پر پانی پھر جائے۔ جس طرح کسی شاعر نے اپنے نامے کے بارے میں اندیشہ ظاہر کیا ہے۔

آسمان اپنی عداوت سے نہ پانی پھیر دے
لے چلا ہے خط ہمارا نامہ بر برسات میں

☆☆☆

کراچی میں دو عیدیں

کراچی میں اب کے دو عیدیں ہوئیں اس پر بھی لکھنے والوں نے کچھ نہ کچھ لکھا ہے لیکن ہم کچھ نہ لکھیں گے کیونکہ یہ ایک شرعی مسئلہ ہے۔ بعض بزرگوں نے اتوار کو عید منانے والوں کی روک تھام کے لیے جو مسجدوں میں تالے ڈال دیے تھے اس باب میں بھی ہم کچھ نہ کہیں گے کیونکہ وہ بھی شرعی مسئلہ ہے جس کی توضیح ایک صاحبِ ارشاد وہدایت نے ہم سے یوں کی ہے کہ ہمارا بس چلے تو سارا سال تالے ڈالے رکھیں تاکہ بدعتی لوگ مسجدوں میں نہ آسکیں۔ فساد نہ پھیلا سکیں ہر چند کہ ہم نے سن رکھا ہے۔ شرع میں شرم نہیں لیکن شرع کی اس قسم کی شرح دیکھ کر ہمیں تو آتی ہے۔

☆☆

ہم اس لیے بھی اس مسئلے پر کچھ نہ لکھیں گے کہ یہ ایک اقتصادی مسئلہ بھی ہے۔ اگر تالوں کا وسیع پیمانے پر استعمال نہ ہو تو تالے بنانے والے بھوکے مرجائیں۔ علی گڑھ تالے بنانے والوں کی انجمن نے تو علمائے کرام اور مفتیانِ عظام کے اس فیصلے کو برملا سراہا ہے۔

پھر جب آپ کارخانے داروں کو تالا بندی سے نہیں روکتے تو مسجدوں کی تالا بندی روکنے کا کیا جواز ہے۔ ہمارے ملک میں دین بھی انڈسٹری ہے اور امامت وخطابت بھی کاروبار ہے اور فتویٰ سازی بھی صنعت ہے۔ اگر عید سارے ملک میں ایک ہی دن

ہو جائے جیسے کہ اکثر اسلامی ملکوں میں باتفاق رائے ہوتی ہے تو لوگ سمجھنے لگیں گے کہ رویت ہلال کمیٹی کی کوئی ضرورت نہیں بلکہ مولویوں کی بھی کوئی ضرورت نہیں۔ ہر مسلمان اللہ تعالیٰ سے براہِ راست استمداد کرنے اور رشتہ استوار کرنے کی سوچے گا۔ پروہتوں کو غیر ضروری سمجھے گا۔ معاملہ صرف چاند اور عید کا ہوتا تو مضائقہ نہ تھا۔ بات اور آگے جاسکتی ہے۔

ہم اس لیے بھی اس باب میں کچھ نہ لکھیں گے کہ اس سے ہماری صلح کل طبیعت کے بدنام ہونے کا اندیشہ ہے۔ کیونکہ ہم نے اتوار کی عید کو صحیح سمجھتے ہوئے بھی خود عید پیر ہی کے دن کی ہے۔ بعض لوگوں نے ہمیں پیر کو ناظم آباد کی جامع مسجد کی صفوں میں دیکھا تو کچھ تعجب بھی کیا لیکن ہمارے علاوہ بھی بہت لوگ تھے جنہوں نے اتوار کو مسجدیں بند پاکر ناچار پیر کو عید کی نماز پڑھی تھی۔ بات یہ ہے کہ عید کی نماز باجماعت ہوتی ہے۔ آدمی تنہا نہیں پڑھ سکتا۔ خصوصاً ایسا آدمی جو دوسروں کو کن انکھیوں سے دیکھ کر ہاتھ باندھتا اور چھوڑتا ہو۔ ہم نے اتوار کی صبح اپنے دوست جمیل الدین عالی کو فون کیا تو یہ معلوم کر کے رشک آیا کہ وہ تو اطلس کی پھولدار شیروانی پہنے کان میں عطر کا پھویا رکھوا رہے ہیں۔ کیونکہ سامنے ڈیفنس سوسائٹی کی مسجد میں نماز عید کی صفیں درست ہو رہی ہیں۔ ادھر ہمارے ہاں اس روز روزہ تھا۔ یہ فقرہ ہم نے جان بوجھ کر مبہم رکھا ہے۔ اگر آپ اس کا مطلب یہ لیں کہ ہمارا روزہ تھا تو یہ آپ کا حسنِ نظر اور الطافِ عمیم ہے اور اگر اس سے یہ مراد لیں کہ گھر کے دیگر افراد کا روزہ تھا، تب بھی حرج نہیں۔ کیونکہ زیادہ قرین حقیقت یہی ہوگا۔

البتہ ۲۹ کو ہمارا روزہ تھا۔ اس کے علاوہ ہم نے کتنے روزے رکھے' آپ یہ نہ پوچھیں تو اچھا ہے کیونکہ اس طرح بات ذاتیات میں چلی جائے گی۔ اپنے روزے کی پبلسٹی ہم اس لیے نہیں کرتے کہ ایک تو ہم بے ریا آدمی ہیں' دوسرے یہ قباحت ہے کہ

لوگ کہیں گے کہ تم نے روزہ رکھا تو ہمیں روزہ کشائی میں کیوں نہیں بُلایا اور گلے میں ہار ڈال کر اخبار میں تصویر کیوں نہیں چھپوائی۔ بیماری اور سفر میں روزے معاف ہیں اور اسے اتفاق ہی کہیے کہ ہماری اکثر بیماریاں اور اکثر سفر اس مبارک مہینے میں واقع ہوتے ہیں۔ تاہم اپنے اس سال کے روزوں کے بارے میں ہم اتنا اشارہ دے دیں کہ انہیں ایک چھانگا آدمی ایک ہاتھ کی انگلیوں پر گن سکتا ہے۔

☆☆

بعض لوگ تو ہم سے بھی زیادہ صلح کُل نکلے۔ یعنی اتوار کو روزہ بھی رکھا اور عید بھی پڑھی۔ روزہ کراچی کے علمائے کرام کی خوشنودی کے لیے، عید اپنی خوشی کے لیے۔ جو لوگ صبح کو گھر سے عید کی سویاں کھا کر نکلے تھے بعض محلّوں میں انہیں رمضان المبارک کا احترام کرنا پڑا۔ جو شخص ہمارے محلّے میں ڈھول بجا کر سحری کے لیے جگاتا تھا اس نے اتوار کی صبح ہمیں سحری کے لیے بھی جگایا اور دس بجے عیدی لینے بھی آ گیا کہ صاحب عید مبارک۔ بعضوں نے دونوں دن عید کی نماز ادا کی۔

اتوار کو پولو گراؤنڈ میں، پیر کو نشتر پارک میں۔ ہمارے نزدیک تو اس میں حرج کی کچھ بات نہیں۔ محاورے میں تو ہر روز روزِ عید اور ہر شب شبِ برات آیا ہے۔ اگر روزے ۲۹ یا ۳۰ ہو سکتے ہیں تو کیا عید دو دن بھی نہ ہو؟ حلوائے خوش است، دیگر بیارید۔

اب کے ہم اپنی عیدی عربوں کو دینا چاہتے تھے جو روزے رکھ کر بے جگری سے لڑے لیکن اُن کے پاس سُنا ہے خود اتنا پیسہ ہے کہ ہمیں عیدی دے سکتے ہیں پھر ہمیں عیدی امین صاحب کا خیال آیا۔ عربوں کے معاملے میں انہوں نے اتنی دوڑ دھوپ کی ہے کہ ہم نے ان کا ایشیائیوں کا دشمن ہونا معاف کر دیا۔ مشکل یہ ہے کہ انہیں منی آرڈر کس پتے پر بھیجیں کیونکہ وہ آج اس دار الحکومت میں ہیں کل دوسرے میں۔

☆☆☆

ہم تقریر کرنے سے کتراتے ہیں

ہم تقریر کرنے سے کتراتے ہیں بلکہ مشاعرہ بھی اسی باعث نہیں پڑھتے کہ شعر ارشاد کرانے سے پہلے شاعر کا تقریر کرنا اب قریب قریب آداب میں داخل ہو گیا ہے۔ یہ بات نہیں کہ ہم تقریر نہیں کر سکتے۔ ہمت کرے انسان تو کیا ہو نہیں سکتا۔ لیکن اس کے لیے ذرا اہتمام کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک تو یہی کہ ہماری ٹانگوں کو کسی ستون یا کرسی کے پائے سے کس کر باندھنا پڑتا ہے، کیونکہ ہمارے دوسرے اعضائے رئیسہ کی طرح یہ بھی ایسی خدا ترس واقع ہوئی ہیں کہ جہاں تقریر کا موقع آیا تھر تھر کانپنے لگیں۔ نرم دلی کے باعث آواز میں بھی رقت آ جاتی ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ اب روئے کہ تب روئے۔ دوسری وجہ یہ کہ ہمیں دلائل پر قابو نہیں رہتا۔ دلائل ہمارے ذہن میں ایسے بالافراط ہوتے ہیں کہ لب تک آنے کے لیے ایک دوسرے پر پلے پڑتے ہیں۔ بعض تو موقع محل بھی نہیں دیکھتے اور بلا سیاق و سباق وارد ہو جاتے ہیں۔ کئی بار تو ایسا بھی ہوا کہ کئی ایک نے بیک وقت ہماری زبان پر آنے کی کوشش کی تو ایک گچھا سا بن کر ہمارے حلق میں اٹک گئے۔

ایسے میں سطحی نظر والوں کو ہماری تقریر اگر الجھی ہوئی معلوم ہو تو وہ قابلِ معافی ہیں۔ حلق تر رکھنے کے لیے ہمیں پانی بھی بار بار پینا پڑتا ہے پیتے تو اور لوگ بھی ہیں، لیکن

ہمیں اپنی ضرورت کے پیش نظر منتظمین جلسہ سے گزارش کرنی پڑتی ہے کہ اسٹیج پر نلکا لگا دیا جائے۔ اب کتنے لوگ ہیں جو ایسا اہتمام کر سکیں۔ ابھی پچھلے دنوں ایسا اتفاق ہوا کہ بزم تاریخ والوں نے ایک مباحثہ کرایا۔ موضوع ایسا تھا کہ ہمیں بے اختیار تقریر کرنے کی خواہش ہوئی۔ ہم نے اس خواہش کا اظہار کیا تو سیکریٹری صاحب بولے۔

"آپ کا تقریر کرنا ہمارے لیے فخر کا باعث ہوتا لیکن کیا کریں، کے۔ ڈی۔ اے والے نہیں مانتے۔ کہتے ہیں، شہر میں ویسے ہی پانی کی قلت ہے۔"

خدا جانے ہمارے تقریر نہ کرنے کی شہرت ایک مقامی کالج والوں تک کیسے پہنچ گئی کہ انہوں نے ہمیں ایک مباحثہ کا جج بنا دیا۔ ہم نے بہت غور کیا کہ ہم تو خود بولنے سے قاصر رہتے ہیں۔ جج کیا کریں گے جواب ملا کہ ابھی پچھلے دنوں فلاں کالج والوں نے بھی تو ایک مشاعرے کی صدارت ایک ایسے صاحب سے کرائی جو شعر کہنا تو درکنار ایک مصرع بھی موزوں نہیں پڑھ سکتے۔

اس پر ہم لاجواب ہو گئے۔ دلائل ان لوگوں کے پاس اور بھی تھے، لیکن اندیشہ پیدا ہوا کہ جوں جوں وہ سامنے آئیں گے۔ ہمارا ازالہ حیثیت عرفی ہی ہوگا۔ نیک نامی کا کوئی امکان نہیں۔ ہم نے کہا "اچھی بات ہے لیکن ایک بات کی ضمانت دیجیے کہ فیصلے کے بعد مقابلے میں شریک ہونے والے اور انعام نہ پانے والے ہمیں لتاڑیں گے نہیں۔" کیونکہ ایک بار تھیوسوفیکل ہال کی چھت پر ہم نے تقریروں کے ایک مقابلے میں منصفی کی تھی۔ ایک صاحبہ نے جن کے اسکول کو انعام نہ ملا، آنکھیں بند کر کے اور منہ کھول کر ایسی تقریر کی کہ اگر وہ ہماری شان میں نہ ہوتی تو ہم پہلا انعام ان ہی کو دیتے۔

ایک موقع پر ایک صاحبزادے کا ردعمل بھی کچھ اسی قسم کا تھا۔ ان کو انعام نہ ملا تو مٹھیاں بھینچ کر بولے۔

"اب دیکھوں گا آپ کیسے جیکب لائن میں سے گزرتے ہیں روز چلے آ رہے ہیں ترکی ٹوپی لگائے قوالی سننے۔"

جن لوگوں کا خیال ہے کہ ہمارا تصوف سے شغف کم ہو گیا ہے وہ غلطی پر ہیں۔ اب ہم قوالوں کو اپنے گھر بلا لیتے ہیں۔

ہمیں اسکول سے نکلے (خود نکلے تھے، نکالے نہیں گئے تھے) اتنے دن ہو گئے ہیں کہ کچھ اندازہ نہ تھا کہ زبان اردو کتنی ترقی کر گئی ہے۔ ہم پرانے مولویوں سے پڑھے تھے جو لب سڑک اور فوق البھڑک وغیرہ تک کو غلط قرار دیتے ہیں۔ ادب اور صحافت کے کوچے میں مولانا چراغ حسن حسرت مرحوم ایسے سخت گیروں سے پالا پڑا جنہوں نے ایک افسانہ نگار کی عظمت کو محض اس لیے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا کہ اس نے زور بیان میں ہیرو کی زبان سے یہ کہلوا دیا تھا کہ "سلمٰی! میرا پیار پہاڑ کی طرح اٹل ہے اور سمندر کی طرح پایاب ہے۔"

ایک اور مصنف پر وہ عمر بھر اس لیے خفا رہے کہ اس نے کہیں روانی میں لکھ دیا تھا کہ

"اس آگ نے مجھے جلا کر خس و خاشاک بنا دیا ہے۔"

الحمدللہ کہ آزادی کے بعد سے جہاں انگریزوں سے چھٹکارا ملا۔ بات بات پر گرفت کرنے والوں اور تلفظ اور محاوروں میں سندیں مانگنے والوں کا زور بھی ٹوٹا۔ آج کل کے اساتذہ اور طلبہ کی وسیع الخیالی کا اندازہ ہمیں اس روز کی تقریریں سن کر ہوا، ایک صاحب نے تقریر کا آغاز ہی اس جملے سے کیا کہ۔

"جن لوگوں کی زیر نگرانی میں یہ مباحثہ ہو رہا ہے، وہ مستحق تبریک ہیں۔"

ہمارے زمانے میں یا تو زیر نگرانی کہتے تھے یا نگرانی میں، غور کرنے پر زیر نگرانی میں، کہنے کی حکمت کھلی، یہ تقریر کوئی فارسی خواں سن رہا ہو تب بھی سمجھ جائے گا اور فارسی سے نابلد ٹھیٹ اردو بولنے والے کو بھی مجال اعتراض نہ ہوگا۔ ایک اور صاحبہ غالباً فارسی کی

طالب علم تھیں، وہ صدر گرامی قدر گرامی کے نیچے بھی زیر ڈالتی گئی تھیں۔ ان کا صدر گرامی کہنا ہمیں تو بہت بھلا معلوم ہوا۔ متعارف کے معنی میں ہم ایک لفظ روشناس کرتے تھے۔ ہمیں اندازہ نہ تھا کہ اس کا تعلق روشنی سے ہے۔ دو تین طالبات کو روشناس کہتے سنا تو صحیح مطلب سمجھ میں آیا۔ رجعت پسند میں ہم ہمیشہ زیر زبر ہی پڑھتے رہے۔ اپنی اس رجعت پسندی کا احساس اس وقت ہوا جب ایک مقررہ سے رُجعت پسند سنا۔ اگر اتنے دنوں میں زبر ترقی کر کے پیش تک نہ پہنچے تو زبان کی ترقی ہی کیا ہوئی۔ اسی مباحثے میں ہمیں پہلی بار معلوم ہوا کہ صحیح لفظ مدح سرائی نہیں مدّاح سرائی ہے۔

اسکولوں کی عمارتیں کم ہونے کی وجہ سے ہمارے بہت سے اسکول فٹ پاتھوں پر قائم ہیں۔ ہم نے اکثر دیکھا کہ ذرا استاد کلاس سے غائب ہوا اور کوئی بندر نچانے والا یا بلا درد دانت نکالنے والا یا چورن بیچنے والا ان کی جگہ آ بیٹھا۔ یہ بات فائدے سے خالی نہیں، اس سے طلبہ کا ذخیرہ اشعار بڑھتا ہے۔

سچائی چھپ نہیں سکتی بناوٹ کے اصولوں سے

اور............

بشر راز دل کہہ کر ذلیل وخوار ہوتا ہے

اور..........

مدعی لاکھ برا چاہے تو کیا ہوتا ہے

وغیرہ ایسے ابیات ہیں کہ عمر بھر کام آتے ہیں۔ ان اسکولوں کے طالب علم جب فارغ التحصیل ہو کر رکشا یا بس چلاتے ہیں تو ان اشعار کو رکشا اور بس کی پشت پر لکھواتے ہیں۔ یہاں ایک بی بی نے اپنی تقریر کا آغاز اس شعر سے کیا۔

؎ دل میں ایک چبھتی ہوئی تقریر ہونی چاہیے
نالہ کیسا بات میں تاثر ہونی چاہیے

تو ہم نے پوچھ لیا کہ آپ کس کالج سے تشریف لائی ہیں؟ فوراً کہنے لگیں "آپ ان جان بنتے ہیں، جس فٹ پاتھ پر آپ اپنے دفتر کی کھڑکی میں سے گنڈیریوں کے چھلکے پھینکتے ہیں، وہیں تو ہماری کلاس لگتی ہے۔ آپ نے مجھے ضرور دیکھا ہوگا۔"

اس بحث کا موضوع تھا کہ نئی پود کی بے راہ روی کی ذمے داری والدین پر عائد ہوتی ہے۔ بعض طالبات نے اپنی بات میں زور پیدا کرنے کے لیے انگلیوں سے ادھر اشارے بھی کیے، جدھر ان کے والدین بیٹھے تقریریں سن رہے تھے، لیکن سب ہی ایسی نہیں تھیں۔ بعضوں نے ان کو بری کرانے کے لیے زور خطابت صرف کیا۔ ایک صاحبہ نے کہا کہ۔

"حضرت آدم علیہ السلام کے تو والدین ہی نہیں تھے، اس کے باوجود آپ لوگ جانتے ہیں کہ ان سے جنت سے نکالے جانے کے قابل بعض باتیں سرزد ہوئیں۔"

لیکن سب سے موثر استدلال ان صاحبہ کا تھا جنہوں نے کہا۔

"یہ نئی نسل نہایت ناخلف اور نالائق ہے۔ بدراہی کی حرکتیں خود کرتی ہے اور ذمے دار والدین کو ٹھہراتی ہے۔ کار بد تو خود کریں لعنت کریں شیطان پر۔"

اس پر ہمیں بہت دن پہلے کی ایک بات یاد آئی اخبار (ڈان) کی ملکیت کا جھگڑا تھا، آرام باغ میں ایک جلسہ ہوا۔ ایک بہت محترم معمر لیڈر نے صدارت کی۔ ایک مقرر نے نہایت غیظ وغضب میں تقریر کی اور آخر میں فیصلہ صادر کیا کہ ڈان میرے باپ کی ملکیت نہیں، ڈان ایڈیٹر صاحب کے باپ کی ملکیت نہیں۔ ڈان (انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے) صاحب صدر کے باپ کی ملکیت نہیں، بلکہ قوم کی ملکیت ہے۔

(فروری ۷۷ء میں لکھا گیا)۔

☆☆☆

پریس کلب میں تقریب رونمائی

کراچی کا پریس کلب عجب رونق کی جگہ ہے۔ اس کے اندر تو ہمیں کم ہی جانا ہوتا ہے۔ اس کے احاطے میں البتہ اکثر دیکھا کہ ایک کونے میں قوالی کا جلسہ ہے' اگر بتیاں سلگ رہی ہیں اور تالی بج رہی ہے۔ دوسرے کونے میں دھوبی پنچایت کا سالانہ جلسہ ہے۔ مندوبین کلف لگے کپڑے پہنے اکڑے اکڑے پھر رہے ہیں۔ لان میں سائیکل کے پنکچر لگانے والوں کی ایسوسی ایشن کا سیمینار ہے اور چوتھے میں فلسفی لوگ سر جوڑے نطشے کے مابعد الطبعیاتی تصورات پر بحث کر رہے ہیں۔ ایک بار ہم نے بیچوں بیچ کھڑے ہو کر سنا تو کچھ اس قسم کا غلغلہ سنائی دیا۔

پس ہمارا مطالبہ ہے کہ پنکچر لگانے کا سلوشن سستا ہونا چاہیے کیونکہ نطشے کے سارے تصورات ابن عربی سے مستعار ہیں اور اب جب کہ کاسٹک سوڈے کی گرانی نے ہماری کمر توڑ دی ہے' میرے مولا بلالو مدینے مجھے' میرے مولا بلالو مدینے مجھے۔"

☆☆

اس پیر کو پریس کلب میں عبیداللہ علیم کی کتاب "چاند چہرہ ستارہ آنکھیں" کی رونمائی تھا' ہم بھی گیٹ سے داخل ہو کر ایک خالی کرسی پر جا بیٹھے۔ کوئی صاحب تقریر کر
اب دھاندلی نہیں چلے گی۔ ہمیں سال میں سترہ مہینے کا بونس اور دس ماہ کی

بانتخواہ چھٹی ملنی چاہیے اور چھانٹی بند کی جائے۔ اب ہم نے غور سے دیکھا تو جھنڈے' جھنڈیاں' اور ان پر نعرے بھی نظر آئے۔ یہ کسی ٹریڈ یونین کا جلسہ تھا۔ دریافت ہوا کتاب کا جلسہ دوسرے کونے میں ہے۔ وہاں گئے تو واقعی شادی اور بارات کا منظر تھا۔ قناتیں تھیں' دریاں تھیں' چاندنیاں تھیں' جن پر قالین' قالینوں پر شہ نشین' پر مطلا مسندیں اور مائیک' مصنف اور ناشر الے گہلے پھر رہے تھے۔ پانی کی سبیل لگی تھی۔ جانے کیا سمجھ کر' ایک شخص مرغ حلیم اور دہی بڑے کا ٹھیلا لے کر آ کھڑا ہوا تھا۔ نسیم درانی نے کہ کتاب کے ناشر ہیں۔ اسے مشکل سے سمجھا بجھا کر وہاں سے ہٹایا۔ جانتے تھے کہ سب ہی لوگ مرغ حلیم اور چاٹ پر پل پڑیں گے۔ کتاب کوئی نہ خریدے گا۔

☆☆

پروگرام میں تقریریں شامل تھیں' اس کے بعد ٹھنڈی میٹھی بوتلیں اور اس کے بعد موسیقی۔ بادلوں کو معلوم ہوا کہ ملہار گائی جائے گی تو پیشگی اُمڈ آئے بلکہ ٹپ ٹپ بوندیں برسانے لگے۔ اب ہمیں معلوم ہوا کہ ایسے جلسوں میں لوگ کتاب کے ساتھ بروشر یعنی ایک کتابچہ مطبوعہ اشتہارات چھاپتے ہیں تو کیوں چھاپتے ہیں۔ گرمی ہو تو لوگ اس سے پنکھا جھلتے ہیں اور بوندا باندی ہو تو سر پر رکھتے ہیں۔ کرسیوں پر گرد ہو تو سیٹ پر رکھ کر اس پر بیٹھتے ہیں اور تقریریں زیادہ ہی پر مغز ہوں تو منہ پر رکھ کر قیلولہ کرتے ہیں۔ صدارت تو ہمارے دوست ضیا جالندھری کی تھی لیکن اسٹیج پر زرنگار مسندیں قطار در قطار رکھی تھیں۔ سرشار صدیقی نے لوگوں کو بلانا شروع کیا تو ایک وقت میں ہمیں اندیشہ پیدا ہوا کہ سارے حاضرین اسٹیج پر جا بیٹھیں گے تو پنڈال میں کوئی نہ رہ جائے گا۔ پہلے انہوں نے جناب رئیس امروہوی کو بلایا۔ پھر عبیداللہ علیم کو بلایا پھر نسیم درانی کو بلایا۔ ہم بھی تیار ہو رہے تھے کہ چالیسویں پچاسویں نمبر پر ہمیں بھی یاد کیا جائے گا لیکن جمیل الدین عالی کا نام پکارا گیا تو انہوں نے معذرت کر دی اور یوں گیارہ آدمیوں کے اسٹیج

پر بیٹھنے کے بعد یہ سلسلہ بند ہوگیا۔ مجنوں گورکھپوری صاحب ذرا دیر سے تشریف لائے‘ وہ فوراً اسٹیج پر آن بیٹھے۔

☆☆

اب تقریریں شروع ہوگئیں۔ بولنے والے زیادہ تر عبیداللہ علیم کے ہم عصر تھے۔ ان کی تقریریں مختصر تھیں اور ان میں کہنے کی باتیں دلنشین انداز میں کہی گئی تھیں۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ فاضلانہ مقالہ کوئی نہیں تھا۔ لہذا کسی صف سے خراٹوں کی آواز بھی ہم نے نہ سنی ورنہ بعض مقرر تو اسٹیج پر آ کر مائیک کو چسنی کی طرح منہ میں لے لیتے ہیں۔ ان کا دودھ چھڑانا مشکل ہوجاتا ہے۔ ذکاءالرحمان صاحب نے تو کوئی اور موضوع پسند کیا۔ اسد محمد خاں‘ احمد ہمدانی اور جون ایلیا نے شاعر اور کتاب کا ذکر کیا۔ جون ایلیا کی تقریر بالخصوص خیال افروز تھی۔ انہوں نے علیم کو ہیجان ذات کا شاعر قرار دیا اور گفتگو کا سود خور بھی جو ایک سے دو وصول کرتا ہے۔ واقعی علیم لفظ کو برتتے ہیں تو ان کی جان نکال لیتے ہیں۔ البتہ جون ایلیا کی ایک بات پر ہم چونکے کہ عبیداللہ علیم کو دیکھ کر ہمیں قلفی کا خیال آتا ہے‘ ہم سمجھے یہ بے تکلف دوست ہیں۔ اکٹھے جا کر قلفیاں کھاتے رہے ہوں گے لیکن پھر کسی نے بتایا کہ جون ایلیا نے عرفی کہا ہے قلفی نہیں۔ خیر تھوڑی بہت مٹھاس تو عرفی کے کلام میں بھی ہے۔

☆☆

مجنوں گورکھپوری ہمارے ادب کی مایہ ناز ہستی ہیں۔ جثہ ایسا کہ مجنوں یعنی قیس عامری سلمہٗ بھی دیکھتے تو رشک کرتے۔ بظاہر معلوم ہوتا ہے نہ ہاتھ میں طاقت ہے نہ آنکھوں میں دم ہے اور بولتے ہیں تو لوگ حیران ہوتے ہیں کہ از کجا می آید ایں آواز دوست۔ لیکن اخلاق ایسا ہے کہ ہر جلسے میں پہنچتے ہیں انکار نہیں کرتے۔ تقریر بھی کرتے ہیں‘ علم کا دریا ہیں لیکن یہ دریا بعض اوقات تقریر کے کوزے میں پوری طرح

بند نہیں ہو پاتا۔ بہت سا پانی ادھر ادھر بہہ جاتا ہے۔ ہم نے کتابوں کے افتتاح کے کئی جلسوں میں انہیں سنا ہے۔ ان کا پہلا فقرہ عموماً یہ ہوتا ہے کہ یہ کتاب میں نے نہیں پڑھی یا پوری نہیں پڑھی۔ یہاں سے جا کر پڑھوں گا۔ اس کے بعد ادب کی ابدی صداقتوں پر آجاتے ہیں۔ یہاں بھی ان کی تقریر کی یہی شان تھی۔ پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ۔ بولنے کو کھڑے ہوئے تو اسٹیج پر زلزلہ سا آگیا۔ کچھ لوگ سمجھے مائیکروفون گر رہا ہے۔ کچھ سمجھے مجنوں صاحب گر رہے ہیں۔ آخر انہوں نے وضاحت کی کہ میں نہیں گر رہا۔ مائیکروفون کو کوئی آ کر سنبھالے۔

☆☆

ہم بہت دن سے اس کتاب کے چھپوانے اور منظر عام پر لانے میں عبیداللہ علیم کے انہماک کو دیکھ رہے تھے‘ ایک صاحب نے ہمیں بتایا کہ عبیداللہ علیم نے کوئی چھ مہینے ہوئے عہد کیا تھا کہ جب تک کتاب چھپ نہیں جاتی نہ خود بال کٹواؤں گا نہ جلسے میں تقریر کرنے والے کسی اور شخص کو کٹوانے دوں گا۔ لیکن آپ جانتے ہیں‘ فی زمانہ کتنے بزرگ ہیں جو چھوٹوں کے کہنے میں ہیں۔ ضیاء جالندھری اور نسیم درانی تک نے ان کا ساتھ نہ دیا۔ ہاں ہمارے دوست رئیس امروہوی نے ضرور ان کا دل رکھا۔ ان کی فرمائش کا پاس کیا۔ دیکھا کہ ان کی جٹائیں ان کے شانوں پر سے ہو کر ان کے سینے پر آرہی ہیں۔ ہم پہلے سمجھے‘ ہوں گے کوئی قدوۃ السالکین۔ پھر پہچانا کچھ لوگ دنیا کو ترک کردیتے ہیں۔ کچھ کو دنیا ترک کردیتی ہے لیکن ہمارے رئیس صاحب کا شمار تو ان دونوں طبقوں میں نہیں۔ وہ جمال دوست آدمی ہیں۔ بے شک آج کل مابعدالطبیعات اور روحانیت وغیرہ سے ان کو شغف ہے۔ جنوں وغیرہ سے بھی ان کی یاد اللہ ہے۔ حبس دم بھی کرتے ہیں۔ صبح کو آدھا گھنٹہ سر کے بل بھی کھڑے ہوتے ہیں۔ لیکن یہ کوئی بات نہیں۔ سر کے بل ہم بھی کھڑے ہوتے ہیں بلکہ کوچۂ رقیب میں اسی شان سے

جاتے ہیں۔ ہم ان کو ان کے اشغال سے نہیں روک سکتے لیکن یہ گیسو درازی اور جٹا اور بھبوت کی سند نہیں۔ یوں بھی اب عبیداللہ علیم کی کتاب کا افتتاح ہو چکا ہے۔ وہ بال کٹوالیں، اپنی نہیں تو ہماری جمال پرستی کا لحاظ کریں۔ انہیں کچھ نہیں کہا جائے گا۔

☆☆

رئیس صاحب نے اپنی تقریر کا آغاز کچھ یوں کیا کہ الیکٹرانکس کی مدد سے ہم بارہ ارب نوری سال تک دیکھ سکتے ہیں اور ایک نوری سال سات کھرب میل کے برابر ہوتا ہے اور روشنی کی رفتار ایک لاکھ پچاس ہزار میل فی سیکنڈ ہے۔ ہم سمجھے، غلطی سے یہ وہ مقالہ اٹھا لائے ہیں جو کل یونیورسٹی کی فزکس سوسائٹی میں ان کو پڑھنا ہے۔ ہمیں تشویش ہوئی کہ اس کی تلافی کے لیے وہ کہیں سائنس دانوں اور ہیئت دانوں میں عبیداللہ علیم کی شاعری کا ذکر نہ لے بیٹھیں۔ بے شک کتاب کا نام چاند چہرہ اور ستارہ آنکھیں ہے اور چاند ستاروں کی نسبت علم ہیئت سے ہے لیکن یہاں اور چاند مراد ہیں اور دوسری قسم کے ستاروں کی گفتگو ہے۔

☆☆

بہت بڑا مجمع تھا۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو خبر نہیں ہوئی ورنہ دفعہ ۱۴۴ لگاتے اور پولیس کو اطلاع نہ پہنچی ورنہ لاٹھی چارج کرنے کا نادر موقع تھا۔ خوشی ہوئی کہ ایک ادبی کتاب کی پذیرائی کے لیے اتنے لوگ آئے ہیں اور ان میں بہت سے چاند چہرے اور ستارہ آنکھوں والے بھی ہیں۔ عبیداللہ علیم بہت نازک خیال شاعر ہیں اور ایک خوبی ہم نے یہ دیکھی کہ انکسار کو عیب جانتے ہیں اور خودی کو بلند کرنے کے حامی ہیں جس کے لیے وہ انا کا لفظ پسند کرتے ہیں۔ سچ یہ ہے کہ جو شخص اپنی قدر خود نہ کرے گا، دوسرے اس کی قدر کیوں کریں گے۔ بڑے ہو کر یہ بھلے ہی کچھ اور کام کریں۔ اس مجموعے سے معلوم ہوا کہ محبت ان کا کل وقتی کام رہا ہے۔ میر تقی میر کے والد ماجد نے اپنے بیٹے کو نصیحت

کی تھی کہ اے فرزند ساری عمر عشق کرنا اور کچھ کیا تو مجھ سے برا کوئی اور نہ ہوگا۔ معلوم ہوتا ہے عبیداللہ علیم بھی کہیں آس پاس ہی تھے۔ یہ سمجھے کہ ان بزرگ کا خطاب مجھ سے ہے۔ ایسی غلط فہمی ہو ہی جاتی ہے خود ہمیں بھی ہو چکی ہے۔

☆☆

چاند چہرہ ستارہ آنکھیں اندر سے بھی خوب صورت ہے۔ باہر سے بھی خوب صورت ہے۔ اس میں علیم نے زندگی کے عذاب بھی لکھے ہیں، خواب بھی لکھے ہیں اور اچھے لکھے ہیں۔ ان کے کلام میں زندگی کی تازگی اور توانائی ہے۔ حوالے دینے کو بہت جی چاہتا ہے لیکن پھر کالم مشاعرہ بن جائے گا۔

(دخل در معقولات)

(اپریل 1974ء میں لکھا گیا)

☆☆☆

ترقی دھوبیاں کوآپریٹیو سوسائٹی

اپنے کپڑوں سے رہیں سارے نمازی ہشیار!

آپ نے لانڈری میں یا ڈرائی کلینرز کے ہاں بہت بار کپڑے دیے ہوں گے لیکن یوں کہ رسید لی اور تہ کر کے جیب میں رکھ لی۔ اگر کہیں آپ اس کی پشت کے نوشتہ پڑھ لیں تو یقین ہے کہ خود ہی غسل خانے میں چھوا چھو کیا کریں۔ نمونہ کلام ملاحظہ فرمایئے۔

۱۔ اگر کپڑے کے چیتھڑے اڑ جائیں تو لانڈری ذمے دار نہ ہوگی۔

۲۔ اگر استری کرتے میں کوئلے سے کپڑے جل جائیں تو لانڈری پر ذمے داری نہ ہوگی۔

۳۔ اگر کپڑے پر جابجا رنگ یا تارکول کے دھبے پڑ جائیں تو لانڈری ذمے دار نہ ہوگی۔

۴۔ اگر لانڈری کا کوئی ملازم کسی صاحب کے کپڑے پہن کر بارات میں چلا جائے یا انہیں رہن رکھ دے یا بیچ کھائے تو کسی گاہک کو مواخذے کا حق نہ ہوگا۔

دھوبی آخر دھوبی ہے۔ منطقی نہیں ورنہ محض ایک فقرہ لکھنے سے کام چل جاتا کہ

گاہکوں کے کپڑے لے کر واپس نہیں کیے جاتے۔

☆☆☆

ہمارا ارادہ ایک زمانے سے تھا کہ دھوبیوں کے ان سامراجی اصولوں کے خلاف کپڑے دھلانے اور پہننے والوں کو منظم کر کے ایک تحریک چلائیں اور حکومت سے مطالبہ کریں کہ جس طرح اس نے زمینداروں اور جاگیرداروں کو ختم کر دیا۔ ایک سے زیادہ شادیوں پر پابندی لگادی۔ اسی طرح لانڈریوں کے متعلق کوئی قانون بنا دے جس سے کپڑے نہیں تو فی الحال کچھ حقوق ہی واپس مل جائیں لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کے کچھ حقوق ابھی ہمارے ذمے قابل ادا ہیں جن کی وصولی کے لیے انہوں نے پہل کر کے لاہور میں ایک انجمن بھی بنالی ہے۔ ''ترقی دھوبیاں کواپریٹو سوسائٹی''۔

ہمارے گلی کے کونے پر پانچ سال ادھر میاں تاج محمد دھوبی کی کوٹھڑی تھی۔ ایک دن کیا دیکھتے ہیں کہ دیوار پر سفیدی کرا کے لکھ رکھا ہے۔ دہلی دربار واشنگ فیکٹری۔ اب وہی کوٹھڑی۔ اپ ٹوڈیٹ امپیریل ڈرائی کلینرز، کے نام سے موسوم ہے اور ایک طرف شیشے کے کیس کے اندر ایک مشین بھی دھری رہتی ہے جو نہ جانے کپڑے دھونے کی ہے یا آئس کریم بنانے کی۔ بہر حال اسے چلتے کسی نے نہیں دیکھا۔ میاں تاج محمد کپڑے اب بھی گاندھی گارڈن کے گھاٹ پر ٹھنڈے پانی سے ڈرائی کلین کرتے ہیں البتہ ہمارا معیار زندگی انہوں نے بڑھا دیا۔ جس کپڑے کی دھلائی پہلے دو آنے دیتے تھے اب چار آنے دینی پڑتی ہے۔ کلف لگانے کے دو آنے مزید اور استری کرائی کے بھی وہ دوسروں سے الگ لیتے ہیں لیکن ہمارے ساتھ رعایت کرتے ہیں۔ ایک نئی بات یہ ہے کہ گاہکوں کو رسید بھی دیتے ہیں اور اسی کی پشت سے ہم نے اوپر کی شرائط نقل کی ہیں۔

☆☆☆

لانڈری میں جانے کے بعد کپڑے پر کیا گزرتی ہے۔اب تک یہ ایک رازِ سربستہ تھا لیکن ایک مغربی مصنف نے برسوں کی ریسرچ کے بعد کھوج لگا ہی لیا ہے۔اس کا بیان ہے کہ کپڑا سب سے پہلے گلانے کے شعبے میں جاتا ہے جہاں اسے گندھک کے تیزاب میں ڈبویا جاتا ہے۔دوسری مشین اس پر گوبر، تارکول اور مختلف رنگوں کے چھینٹے دیتی ہے۔اس کے بعد کپڑا مشین گن روم میں جاتا ہے جہاں چھید ڈالنے کے لیے گولیوں کی باڑھ ماری جاتی ہے۔اس کے بعد آرا مشین کا نمبر آتا ہے جس میں پھوسڑے اڑائے جاتے ہیں۔اس کے بعد ایک ماہر فن کپڑے کے بٹن نوچتا ہے۔چونکہ یہ ہاتھ کا کام ہے اور محنت چاہتا ہے لہٰذا دھلائی کے نرخ بھی زیادہ ہوتے ہیں۔

☆☆☆

ہمیں معلوم نہیں ہمارے ہاں یہ مشینیں رائج ہیں یا نہیں۔اگرچہ ہمارے دھوبی ان کے بغیر بھی اپنے آزمودہ اور خاندانی نسخوں کی بہ دولت یکساں تسلی بخش نتائج پیدا کر لیتے ہیں۔لیکن مشینوں سے کام جلدی اور آسان ہو جاتا ہے۔ولایت کی لانڈریوں میں تو دوسری بار کپڑا لانڈری میں جائے تو اس میں بارود بھر کر اڑا دیتے ہیں اور damaged کا لیبل لگا کر واپس کر دیتے ہیں۔ہم ابھی پسماندہ ہیں لیکن امید کرتے ہیں "ترقی دھوبیاں کواپریٹو سوسائٹی" کی بہ دولت یہ پسماندگی بھی جلد دور ہو جائے گی۔

ع اپنے کپڑوں سے رہیں سارے نمازی ہوشیار

☆☆☆

اگر میاں مجنوں یہ جنتری دیکھ لیتے

مطلوب کو مشتاق بنانے کی ترکیبیں

دلگیر جنتری میں سب کچھ موجود ہے

ع آمد بہار کی ہے جو بلبل ہے نغمہ سنج۔یعنی بلبل بولتا تھا یا بولتی تھی تو لوگ جان لیتے تھے کہ بہار آئی ہے۔اب گل کھلیں گے دیوانے اپنے کپڑے پھاڑیں گے اور لڑکے بالے دیوانوں کو پتھر ماریں گے۔یہ رسم کچھ ایسی پکی ہوگئی کہ اگر کوئی پتھر نہ مارتا تھا تو لوگ شکایت کرتے تھے۔

دیوانہ براہے رَودو طفلاں بَراہے
یاراں! مگر ایں شہرِ شماسنگ نہ دارد

ہمارا یہ حال ہے کہ ہم نئے سال کی آمد کی فال جنتریوں سے لیتے ہیں۔ابھی سال کا آغاز دور ہوتا ہے کہ بڑی بڑی مشہور عالم، مفید عالم جنتریاں دکانوں پر آن موجود ہوتی ہیں۔بعض لوگ جنتری نہیں خریدتے خدا جانے سال کیسے گزارتے ہیں۔اپنی قسمت کا حال اپنے خوابوں کی تعبیر، اپنا ستارہ (چاند سورج وغیرہ بھی) کیسے معلوم کرتے

ہیں۔ سچ یہ ہے کہ جنتری اپنی ذات سے ایک قاموس ہوتی ہے۔ ایک جنتری خرید لو اور دنیا بھر کی کتابوں سے بے نیاز ہو جاؤ۔ فہرست تعطیلات اس میں، نماز عید، اور نماز جنازہ پڑھنے کی تراکیب، جانوروں کی بولیاں، دائمی کیلنڈر، محبت کے تعویذ، انبیائے کرام کی عمریں، اولیائے کرام کی کراماتیں' لکڑی کی پیمائش کے طریقے، کون سا دن کس کام کے لیے موزوں ہے، فہرست عرس ہائے بزرگان دین، صابن سازی کے گر، شیخ سعدی کے اقوال' چینی کے برتن توڑنے اور شیشے کے برتن جوڑنے کے نسخے اعضا پھڑکنے کے نتائج، کرۂ ارض کی آبادی، تاریخ وفات نکالنے کے طریقے۔ یہ محض چند مضامین کا حال ہے۔ کوزے میں دریا بند ہوتا ہے اور دریا میں کوزہ۔

بصحوائے: وہ جو کہے کہ ریختہ کیونکر ہو رشکِ فارسی

گفتہ غالب ایک بار پڑھ کے اسے سُنا کہ یوں

ہم دلگیر جنتری (جیبی) کا ٹریلر دے رہے ہیں۔ اسی سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ غیر جیبی جنتریاں تو بحرِ ذخار ہوں گی۔

عام لوگ تو اندھا دھند جس دن جو کام چاہیں شروع کر دیتے ہیں۔ یہ جنتری سب کے پاس ہو تو زندگی میں انضباط آ جائے۔ ایک باب اس میں ہے۔ ''کون سا دن کون سے کام کے لیے موزوں ہے۔'' نمونہ:

ہفتہ : سفر کرنے، بچوں کو اسکول میں داخل کرانے کے لیے۔

اتوار : شادی کرنے، افسروں سے ملاقات کرنے کے لیے۔

بدھ : نیا لباس پہننے، غسل صحت کے لیے۔

جمعرات : حجامت بنانے، دعوتِ احباب کے لیے۔

جمعہ : غسل اور شادی وغیرہ کرنے کے لیے۔

گویا ہفتے میں دو دن شادی کے لیے رکھے گئے ہیں۔ یہ قاعدے پُرانے ہیں۔ اب

صرف ایک شادی کرنے کا قانون ہے چاہے اتوار کو کیجیے، چاہے جمعے کو۔ مرتبین کو چاہیے اگلے ایڈیشن میں ترمیم کر لیں۔

غسل صرف جمعے کو واجب ہے اس لیے تو ہمارے بعض دوست فقط جمعے کے جمعے پنڈے پر پانی پڑنے دیتے ہیں۔ بعض لوگوں کو ہر روز یا دوسرے چوتھے کپڑے بدلنے کی لت ہے۔ حالانکہ بدھ کے علاوہ کسی دن ایسا کرنا جائز نہیں۔ غسل صحت کے لیے بھی بدھ ہی کا دن ہے۔ لیکن غسل صحت کی شرائط پوری کرنے کے لیے بیمار کس دن پڑنا چاہیے۔ اس کی صراحت نہیں۔ ہفتہ بچوں کو اسکول داخلہ کرانے کا دن ہے لیکن قباحت یہ ہے کہ کراچی کے بہت سے اسکول ہفتے کو بند رہتے ہیں۔ یہ کسی اور روز بند ہونے چاہئیں تاکہ جنتری کے احکام پر عمل ہو سکے۔ اتوار کے متعلق بھی ذرا اور وضاحت چاہیے تھی کہ شادی کرنے کے بعد افسروں سے ملا جائے یا افسروں سے ملنے کے بعد شادی کی جائے۔ ان نکات پر بھی آئندہ ایڈیشن میں تھوڑی توجہ کی ضرورت ہے۔

ہم جو خواب دیکھتے ہیں وہ بالعموم رسمی قسم کے ہوتے ہیں اور صبح تک یاد بھی نہیں رہتے۔ جنتری سے معلوم ہوا کہ خوابوں میں بھی بڑی تنوع کی گنجائش ہے۔ خواب میں پھانسی پانے کا مطلب ہے بلند رتبہ حاصل ہونا۔ افسوس کہ ہم نے خواب تو کیا اصل زندگی میں بھی کبھی پھانسی نہ پائی۔ بلند مرتبہ نہ مل سکنے کی اصل وجہ اب معلوم ہوتی من نہ کردم شما حذر بکنید۔

گھوڑا دیکھنے کا مطلب ہے، دولت حاصل کرنا۔ قیاس کہتا ہے کہ مطلب وکٹوریہ کے گھوڑے سے نہیں، ریس کے گھوڑے سے ہے۔ خچر دیکھنے سے مراد ہے سفر پیش آنا۔ جو لوگ ہوائی جہاز سے سفر کرتے ہیں ان کو ہوائی جہاز دیکھنا چاہیے۔ بلی کا پنجہ مارنا بیماری کے آنے کی علامت ہے۔ سانپ کا گوشت کھانا' دشمن کا مال حاصل ہونے کی۔ خواب میں کان میں چیونٹی گھس آئے تو سمجھیے موت قریب ہے (خواب کے علاوہ گھس آئے تو چنداں حرج نہیں، سرسوں کا تیل ڈالیے نکل آئے گی) اپنے سر کو گدھے

کا سر دیکھنے کا مطلب ہے عقل کا جاتے رہنا۔ یہ تعبیر ہم خود بھی سوچ سکتے تھے۔ کوئی آدمی اپنے سر کو گدھے کا سر (خواب میں بھی) دیکھے گا تو اس کی عقل جاتے رہنے میں کیا کلام ہے؟ خواب میں مردے سے مصافحہ کرنے کی تعبیر ہے۔ درازیءِ عمر، خدا جانے یہاں عمر فانی سے مراد ہے یا عمر جاودانی سے' ایک بات ظاہر ہے کہ انسان کو خواب سوچ سمجھ کے دیکھنے چاہئیں فقط ایسے کہ دشمن کا مال ملے یا بلند مرتبہ حاصل ہو۔ بے کار قسم کے خواب دیکھنا دانشمندی نہیں۔

ایک باب اس میں جسم کے اعضا کے پھڑکنے اور ان کے عواقب کے بارے میں بھی ہے۔ آنکھ پھڑکنا تو ایک عام بات ہے۔ رخسار شانہِ راست، گوشِ چپ، انگشتِ چہارم، زبان، گلا، گردن بجانب چپ، ٹھوڑی، بغلِ راست وغیرہ ان پچاسی اعضا میں سے ہیں جن کے پھڑکنے پر نظر رکھنی چاہیے۔ ان میں سے بعض کے نتائج ایسے ہیں کہ ہم نقل کر دیں تو فحاشی کی زد میں آ جائیں۔ ایک دو امور البتہ فاضل مرتبین نظر انداز کر گئے۔ نگہِ انتخاب کی پسلی پھڑک اُٹھنا استادوں کے کلام میں آیا ہے۔ اس کا نتیجہ نہیں دیا گیا۔ ہماری رگِ حمیت بھی کبھی کبھی پھڑک اُٹھتی ہے۔ اس کے عواقب کی طرف بھی یہ جنتری رہنمائی نہیں کرتی۔ یہ نقائص رفع ہونے چاہئیں۔

یہ معلومات تو شاید کہیں اور بھی مل جائیں لیکن اس جنتری کا مغز محبت کے عملیات اور تعویذات ہیں جو حکمی تاثیر رکھتے ہیں۔ قیس میاں کی نظر سے یہ جنتری گزری ہوتی تو جنگلوں میں مارے مارے نہ پھرتے۔ ایک نسخہ حاضر ہے۔

"محبت کے مارے کو چاہیے کہ ۱۲ مارچ کو بہ وقت ایک گھڑی بعد طلوع آفتاب مشرق کی طرف مُنہ کر کے نقش ذیل کو نامِ مطلوب بمع والدہَ مطلوب اُلو کے خون سے لکھ کر اپنے دہنے بازو پر باندھے اور مطلوب کو ۲۰ مارچ بہ وقت صبح ایک گھڑی ۴۵ پل پر بعد طلوعِ آفتاب اپنا سایہ دے۔ مطلوب فوراً مشتاق ہو جائے گا۔

۹۱، ۱۱م   و   م۱۰ع   ۱۱ع   ۱۱

نام مطلوب مع والدہ مطلوب' اپنا نام مع نام والدہ

یہاں بعض باتیں جی میں آتی ہیں۔ اگر مطلوب یا محبوب بات ہی نہیں کرتا تو اس کی والدہ اور دیگر رشتہ داروں کے نام کیسے معلوم کیے جائیں؟ پھر اُلو کیسے پکڑا جائے اور ۲۰ مارچ کو بہ وقت صبح عین ایک گھڑی ۴۵ پل بعد طلوع آفتاب مطلوب کو کیسے مجبور کیا جائے کہ طالب کے سایے میں آئے۔ ان باتوں کا اس جنتری میں کوئی ذکر نہیں۔ ہاں جنتری کے پبلشر نے جنتر منتر مکمل نامی جو کتاب بہ قیمت چھ روپے شائع کی ہے اس میں ان کی تفصیل ملے گی۔

جو لوگ ہماری طرح تن آسان ہیں۔ محبت میں اتنا کشٹ نہیں اُٹھا سکتے ان کے لیے مرتب جنتری نے کچھ آسان تر عمل بھی دیے ہیں جن کی بہ دولت محبوب قدموں پر تو آ کر خیر نہیں گرتا لیکن مائل ضرور ہو جاتا ہے۔ ان میں سے ایک تعویذ ہے جسے ہر روز کاغذ کے چالیس ٹکڑوں پر لکھ کر اور نیچے طالب و مطلوب کے نام درج کر کے آٹے کی گولیوں میں لپیٹ کر دریا میں ڈالنا چاہیے۔ اور چالیس دن تک یہی کرنا چاہیے۔ ہم نے حساب لگا لیا ہے۔ از راہِ کفایت آدھے تولے کی گولی بھی بنائی جائے تو ایک پاؤ روزانہ یعنی دس سیر آٹے میں محبوب کو راضی کیا جا سکتا ہے۔ بھارت میں تو لوگ دس سیر آٹے کے لیے محبوب کو بھی دریا میں ڈال دینے پر تیار ہو جائیں گے لیکن ہمارے ہاں یہ عمل چنداں دشوار نہیں۔ البتہ جو حضرات اس میں بھی خست کریں اور اپنی محبت کو بالکل پاک رکھنا چاہیں وہ ایک اور عمل کی طرف رجوع کر سکتے ہیں۔ وہ یہ کہ "جب بھی محبوب سامنے آئے۔ آہستہ سے دل میں بسم اللہ الصمد، دس بار پڑھیں اور آخر میں محبوب کی طرف منہ کر کے پھونک ماریں، اس طرح کہ مُنہ کی ہوا اس کے کپڑوں کو چھو سکے۔ پندرہ بیس مرتبہ ایسا کرنے سے اس کے دل میں قرار واقعی محبت پیدا ہو جائے گی۔"

یہ عمل بہ ظاہر تو آسان معلوم ہوتا ہے لیکن عملاً ایسا آسان بھی نہیں اول تو محبوب کو اتنی دیر سامنے کھڑا رہنے پر مجبور کرنا کہ آپ دس بار عمل پڑھ کر پھونکیں مار سکیں اور وہ بھاگے نہیں، اپنی جگہ ایک مسئلہ ہے پھر آپ پھونکیں ماریں گے اس کی بنا پر محبوب کیا رائے قائم کرے گا۔ اس کے متعلق ہم کچھ نہیں کہہ سکتے زیادہ شوقین مزاج ان دونوں سے قطع نظر کر کے ''محبت کا سرمہ'' استعمال کر سکتے ہیں۔ جس کا بنانا تھوڑی محنت تو ضرور لے گا لیکن اس کا جادو بھی عالمگیر ہے۔ یعنی صرف محبوب ہی پر کاری اثر نہیں کرتا بلکہ لکھنے والے نے لکھا ہے کہ یہ سرمہ ڈال کر ''جس کی طرف بھی صبح سویرے دیکھے وہی محبت میں مبتلا ہو جائے گا۔''

یہ سرمہ بنانے کے لیے حاجت مند کو ۱۹ر فروری کا انتظار کرنا پڑے گا۔ اس روز وہ بہ وقت طلوع آفتاب پرانی داتن کو جلا کر اس کی راکھ میں چمگادڑ کا خون ملائے اور اس سے یہ نقش بہ وقت صبح ایک گھڑی ۱۵ پل بعد طلوع آفتاب لکھے اور اس پر سورۂ فلق گیارہ سو بار پڑھے پھر نئے چراغ میں روغن کنجد (تل کا تیل) ڈال کر جلائے اور اس کی سیاہی آنکھوں میں ڈالے۔ ایک صاحب نے یہ سرمہ دنبالہ دار لگایا تھا اتنا ہم نے بھی دیکھا کہ محبوب انہیں دیکھتے ہی ہنس دیا۔ آگے کا حال ہمیں معلوم نہیں۔

یہی نہیں، صابن اور تیل تیار کرنے، بوٹ پالش بنانے، کھٹمل اور مچھلی مارنے اور مشہور عام ادویہ کی نقلیں تیار کرنے کی ترکیبیں بھی اس میں درج ہیں۔ لوگ اکثر شکایت کرتے ہیں کہ اردو میں کوئی انسائیکلو پیڈیا نہیں، معلومات کی کتاب نہیں۔ انسائیکلو پیڈیا اور کیا ہوتی ہے۔ ادب شرط ہے منہ نہ کھلوائیں۔ ہم نے انسائیکلو پیڈیا برٹینکا وغیرہ دیکھی ہیں۔ الم غلم مضامین کا طومار ہیں۔ اہل دل کے مطلب کی ایک بات بھی نہیں۔ ہمارا یہ دستور ہو گیا ہے کہ باہر کی چیز کو ہمیشہ اچھا جانیں گے۔ اپنے ہاں کے سونے کو بھی مٹی گردانیں گے۔

☆☆☆

ان دنوں ہم ٹیکس دینے میں مصروف ہیں
میر تقی میر کا انتقال کب ہوا؟

ہمارے دوست فرہاد زیدی بہت دن سے تقاضا کر رہے تھے کہ مضمون دو، مضمون دو۔ وہ یہ نہیں سمجھتے کہ مضمون لکھنا کوئی جوئے شیر لانا نہیں ہے کہ جھٹ سے پہاڑ کاٹا اور لے آئے۔ اس کے لیے بڑی کاوکاو کرنی پڑتی ہے۔ اس کے علاوہ پچھلے دنوں ہم عدیم الفرصت بھی تھے۔

وجہ اس عدیم الفرصتی کی یہ ہے کہ آج کل ہم ٹیکس دے رہے ہیں۔ ٹیکس ہم پہلے بھی دیتے تھے۔ لیکن اسے کل وقتی کام کا درجہ حاصل نہ تھا۔ آغاز اس سلسلے کا کوئی دو ہفتے ادھر ہوا۔ صبح صبح ایک انسپکٹر تشریف لائے۔ فرمایا۔ ''آپ نے ٹیکس دیا۔''

''کون سا ٹیکس۔'' ہم نے دریافت کیا۔

''انکم ٹیکس۔''

''کون سی انکم؟'' ہم نے پوچھا۔

اس پر وہ لاجواب ہو گئے۔ آخر یہ طے ہوا کہ جب انکم ہو گی تو انشاء اللہ ٹیکس بھی ضرور دیں گے۔ اس دن سے ہم اس کوشش میں ہیں کہ کوئی انکم نہ ہو جائے۔ ورنہ ٹیکس دینا

پڑے گا۔ جو صاحبان انکم ٹیکس والوں کے ہاتھوں پریشان رہتے ہیں، انہیں یہ نسخہ آزمانا چاہیے۔

☆☆

دوسرے دن ایک صاحب تشریف لائے کہ ہاؤس ٹیکس عنایت ہو۔

ہم نے کہا۔ ”کس مکان کا ٹیکس۔“

”اس مکان کا جس میں آپ رہتے ہیں۔“

”یہ تو میر کا مکان ہے۔“ ہم نے کہا۔

”کون سے میر کا۔“

”میر تقی میر کا۔“

”تو ان کو بلوائیے۔“

”ان کا تو انتقال ہو چکا۔“

”چچ چچ (افسوس کرتے ہوئے بولے) کب ہوا۔“

”سن وفات میں اختلاف ہے۔ رام بابو سکسینہ کچھ کہتے ہیں۔ مولوی عبدالحق کچھ۔ اب تو یہ دونوں صاحبان بھی انتقال کر گئے۔“

ہم نے کہا۔ ”ہم دکاندار تو نہیں۔ کچھ بھی نہیں بیچتے۔ بکری کا کیا کام۔“

بولے۔ ”کچھ تو ضرور بیچتے ہیں۔“

ہم نے کہا۔ دل بیچتے ہیں لیکن اسے آج کل تو کوئی مفت بھی نہیں پوچھتا۔“

فرمایا۔ ”دل و جان کی خرید و فروخت سے ہمیں مطلب نہیں۔ کچھ اور آپ نے بیچا ہوگا۔ یاد کیجیے۔“

ہم نے بہت غور کر کے بتایا کہ ”دسمبر میں ڈیڑھ روپے کی اخبار کی ردی بیچی تھی۔“

فوراً رجسٹر کھول کر بیٹھ گئے۔ ”بولے۔ لائیے آٹھ آنے۔“

☆☆

ان کے بعد روڈ ٹیکس والے آئے۔ ہم نے کہا۔ ”ہمارے پاس موٹر ہی نہیں ہے۔“ ٹیکس کیسا۔ بولے۔

”آپ خود بھی تو روڈ پر چلتے ہوں گے۔ اس سے بھی سڑک گھستی ہے۔ ہم نے کہا کہ ایک زمانے میں چلتے تھے۔ لیکن جب سے ہماری باڈی کا ماڈل پرانا ہوا ہے اور معدے کے گیئر بکس نے کام بند کیا ہے بس گیراج میں، یعنی گھر میں پڑے رہتے ہیں۔ کبھی کبھی دفتر ہو آتے ہیں۔“

”وہ کیسے جاتے ہیں؟“

ہم نے کہا۔ ”ایک کرین ہے۔ وہ ہمیں اٹھا کر بس کی سیٹ پر رکھ دیتی ہے۔ دوسری بس میں سے اٹھا کر دفتر کی کرسی پر بٹھا دیتی ہے۔ ہمارا دفتر دوسری منزل پر ہے۔“

فرمایا۔ ”بہت ہشیار معلوم ہوتے ہیں آپ۔ اگر کبھی سڑک پر چلتے پکڑے گئے تو اگلا پچھلا سب وصول کر لیا جائے گا۔“

☆☆

خدا جانے یہ خبر کیسے مشہور ہوگئی کہ یہاں ایک شخص ٹیکس دہندہ رہتا ہے۔ ایک صاحب تو بہ ظاہر چادریں لنگیاں بیچنے والے کا بھیس بنا کر آئے۔ سائیکل کے پیچھے دکھاوے کو ایک گٹھڑ بھی رکھا تھا۔ ہم نے کہا۔ ”کیا ہے؟“

بولے۔ ”گل ٹیکس بھی ہے۔ نور ٹیکس بھی ہے۔ کریم ٹیکس بھی ہے۔ پیسے نکالیے۔“

ہم نے کہا۔ بھاگ جاؤ اسی وقت ورنہ کتا چھوڑ دوں گا۔

☆☆

ایک جگہ ہم نے روزے بخشوانے کی کوشش کی تو الٹی آنتیں گلے پڑ گئیں۔ ایک بزرگوار کے ڈی اے کی طرف سے آئے تھے اور گراؤنڈ ٹیکس کا مطالبہ کیا۔

ہم نے کہا۔ ''کس گراؤنڈ کا ٹیکس۔ یہ گراؤنڈ تو جناح کالج والوں کا ہے۔ انہی کے طالب علم یہاں گلی ڈنڈا کھیلتے ہیں۔ ہم نہیں کھیلتے۔''

کہنے لگے۔ اس کی بات نہیں کر رہا۔ اس زمین کا ٹیکس چاہیے جس پر آپ کا مکان ہے۔

ہم نے کہا کہ ہم فقط مکان استعمال کر رہے ہیں۔ زمین آپ لے جائیے۔ یہ ہمارے کام کی نہیں۔ عادت سے مجبور ہم نے اقبال کا شعر پڑھ دیا۔ الارض للہ۔

وہ خدایا یہ زمیں تیری نہیں میری نہیں
تیرے آبا کی نہیں تیری نہیں میری نہیں

اس پر وہ اور شیر ہوئے۔ بولے گراؤنڈ ٹیکس تو اپنی جگہ۔ اقبال کا شعر پڑھنے کا ٹیکس بھی دیجیے۔ آپ کو معلوم نہیں ان دنوں نئے نئے ٹیکس لگے ہیں۔ اقبال کے شعر پر پچیس پیسے کسی اور کا ہو تو پندرہ پیسے۔ اپنے شعر پر البتہ رعایت ہے۔ صرف دس پیسے فی شعر۔

یہ آخری مصیبت اپنے سر لانے میں کچھ ہمارا بھی دخل ہے۔ ایک زمانے میں ہم نے تجویز کیا تھا کہ اقبال کا شعر پڑھنے پر ٹیکس عاید کر دیا جائے تو اس کی آمدنی سے علامہ مرحوم کا مقبرہ بن سکتا ہے۔ شروع شروع میں لوگ گھبرائیں گے۔ لیکن پھر عادی ہو جائیں گے۔ جس طرح مہینے کے مہینے نائی اور دھوبی کا خرچ برداشت کیا جاتا ہے۔ اس طرح بجٹ میں اقبال کے شعر پڑھنے کے لیے بھی چند روپوں کی گنجائش رکھی جا سکتی ہے۔ پولیس والوں کو ہدایت کر دی جائے کہ جوں ہی کوئی شخص ممیرے کا سرمہ یا مولی کا نمک بیچنے کے لیے ہانک لگائے۔

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

تو اس سے وہیں چار آنے رکھوا لے۔ رکشا کی پشت یا بیکری کی دیوار پر، یا بس کے اندر ''اللہ کے بندوں کو آتی نہیں روباہی'' ''کارِ جہاں دراز ہے اب مرا انتظار کر۔'' ''مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی۔'' وغیرہ لکھوانے والوں سے سالانہ فیس لی جائے۔ سب سے زیادہ آمدنی بے شک ریڈیو ہی سے ہوگی۔ ہم اکثر سوچتے ہیں کہ علامہ مرحوم اتنے شعر نہ لکھ گئے ہوتے تو ریڈیو والے اپنے موضوعات کے عنوان کہاں سے لاتے۔ قوالیاں کس کی گواتے اور چھپے ہوئے پروگراموں کی جگہ کیا پڑھواتے۔ قوالی میں تو شعر پڑھنے پر چونی اور اس کی تکرار کرنے پر (ایک شعر کی تکرار سترہ اٹھارہ بار ہوتی ہے) دو پیسے لیے جائیں۔

جن شعروں کی مانگ زیادہ ہے۔ ان کا نرخ زیادہ اونچا بھی رکھا جا سکتا ہے۔ الیکشنوں اور سیاسی جلسوں میں لوگ دیگوں جھنڈیوں وغیرہ پر اتنا خرچ کرتے ہیں تو کیا اقبال کے شعروں پر نہیں کر سکتے۔ ایسا ہو جانے پر جلسوں کا بجٹ کچھ اس قسم کا ہوا کرے گا۔

دریاں بچھوانے کا خرچ	۲۵ روپے
حاضرین کو بلوانے کا خرچ	۴۰ روپے
صاحب صدر کے لیے گل دان، اگال دان اور پان	۵ روپے
گیس بتی، مائیکروفون وغیرہ	۵۰ روپے
مولوی صاحب سے تلاوت قرآن مجید کرانے کے	۵ روپے
اقبال کے شعر پڑھنے کا ٹیکس	۳۵ روپے

کسی کو جلسے کی تعریف کرنی ہوئی تو کہا کرے گا۔ تنظیم مہاجرین کے جلسے کی کیا پوچھتے ہو صاحب۔ ساٹھ روپے کے تو وہاں شعر ہی پڑھے گئے۔

ان کے علاوہ بھی کچھ چھوٹی مدیں ہیں۔ مثلاً اقبال کے شعروں سے تاریخیں نکالنا

(دو روپے فی تاریخ) انہیں مزاروں اور محرابوں پر لکھوانا (پانچ روپے) وغیرہ۔

☆☆☆

آمدنی کے علاوہ اس ٹیکس کا فائدہ یہ ہوگا کہ لوگ اٹھتے بیٹھتے کھانستے چھینکتے سوتے جاگتے اشعار کے بے تحاشا استعمال سے احتراز کریں گے۔ ہم تو کہیں گے کہ ٹیکس بھی ہو۔ اور پابندی بھی ہو۔ یعنی راشن کر دیا جائے۔

بالغ آدمی فی ہفتہ	=	دس شعر
چھوٹا بچہ	=	پانچ شعر
شیر خوار بچہ	=	دو شعر

جب طبیعت کلبلائی راشن کی دکان پر گئے، اپنے حصے کا کوٹا لیا اور استعمال کیا۔ البتہ بیاہ شادی، موت، ختنہ، بسم اللہ، روزہ کشائی، مولود شریف وغیرہ کے لیے اسپیشل کوٹے کا سسٹم رائج کیا جا سکتا ہے۔ اقبال کے شعروں کے ساتھ یہ پابندی بھی ضروری ہے کہ ان کے نیچے علامہ مرحوم کا نام لکھا جائے۔ ورنہ بسوں اور رکشوں میں ان کا استعمال ایسا عام ہوا ہے کہ لوگ حسبِ ذیل کلام کو بھی علامہ مرحوم ہی سے منسوب کرنے لگے ہیں۔

ہر بشر کو ہے یہ لازم صبر کرنا چاہیے
جب کھڑی ہوجائے گاڑی تب اترنا چاہیے
مدعی لاکھ بُرا چاہے تو کیا ہوتا ہے
وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے
سچائی چھپ نہیں سکتی بناوٹ کے اصولوں سے
کہ خوشبو آ نہیں سکتی کبھی کاغذ کے پھولوں سے

اور اس قسم کے مصرعوں کو بھی ہارن دے کر پاس کریں (فعلن فعلن فعلن فع)۔

☆☆☆

طریقہ محفل میں بات کرنے کا
......اور عزیزِ جہاں ہونے کا

محفل میں اجنبیوں سے کیسے بات کی جائے۔ ہمسایوں پر خوش اخلاقی کا کیسے سکّہ جمایا جائے۔ اس کے گُر یا تو بخشد خدائے بخشندہ ورنہ ڈیل کارنیگی کی کتابوں کا مطالعہ کیجئے اور کسبِ کمال کر کے عزیز جہاں ہونے کی کوشش کیجئے۔ مختصر لفظوں میں مقبولیت کا نسخہ زریں یہ ہے کہ مخاطب کے ڈھب اور دلچسپی کی بات کرو۔ اپنے ذوق یا دلچسپی سے علاقہ مت رکھو۔

شروع میں ہمیں بھی یہ بھید معلوم نہ تھا۔ ہمارے محلے میں سامنے کے گھر میں غلے اور تیل کے بیجوں کے مشہور آڑھتی روپیہ بھائی پیسا بھائی جام نگر والے رہتے تھے۔ ہم جب اس مکان میں آئے تو انہوں نے بڑے خلوص سے ہمارا خیر مقدم کیا۔ ان کی بی بی بھی محلے میں ہمارے گھر والوں ہی کو پسند کرتی تھیں اور جب کبھی دونی چونی مانگنی ہو یا گھر میں گھی تیل ختم ہو یا سلائی کی مشین چاہیے ہو تو ہمیں سے رجوع کرتی تھیں۔ ہم بھی سیٹھ صاحب کی خوشنودی کے لئے اپنی سی ہر کوشش کرتے تھے۔ پہلی اتوار آئی تو اُن کو دو غزلیں سنائیں، دوسرے اتوار ایک قصیدہ گوش گزار کیا، تیسرے اتوار ہم نے

ان کے لئے ایک طویل مختصر افسانہ تیار کر رکھا تھا جو ایک طرح سے نفسیاتی تحلیل کا شاہکار تھا لیکن سیٹھ صاحب نہ آئے۔ آخر ہم ان کے گھر جا کر سنا کر آئے۔ اس کے بعد جانے کیا ہوا کہ انہوں نے نہ صرف ہمارے ہاں آنا بند کر دیا بلکہ ہم جیب میں اپنے ایک عزیز کی شادی کا سہرا رکھ کر ان سے ملنے گئے تو انہوں نے اندر سے کہلوا دیا کہ نہیں ہیں سیٹھ صاحب...... لاڑکانہ گئے ہیں۔

کچھ اسی قسم کی واردات ہمارے دوسرے پڑوسی کے ساتھ ہوئی۔ وہ ٹریکٹروں کی ایک کمپنی میں کیمیکل انجینئر ہیں یا شاید فورمین ہیں۔ معلوم ہوا جالندھر کے ہیں جس کو علمی ادبی ذوق کی بنا پر شیراز ہند کہا جاتا تھا۔ اسی رعایت سے ہم نے علیک سلیک کے بعد پہلے تو جالندھر کے ہندوستان میں رہ جانے پر ان سے تعزیت کی۔ اس کے بعد اپنا تازہ فارسی کلام سنایا۔ ہمارے تعلقات میں سرد مہری تو اسی روز آ گئی۔ لیکن دوسری بار جو ہم نے اقبال کے فلسفہ خودی کے ماخذ پر بحث چھیڑی تو جانے کیا ہوا کہ اٹھ کر اندر چلے گئے اور پھر سڑک پر ملتے بھی تو دوسرے فٹ پاتھ پر ہو لیتے۔ ہم نے اپنے اقبال پرست دوستوں سے پوچھا بھی کہ یارو فلسفہ خودی میں ایسی کیا بات ہے لیکن کوئی ہمیں مطمئن نہ کر سکا۔ اس کے بعد ہم نے ڈیل کارنیگی کی کتابیں پڑھیں۔

☆☆☆

یہ قباحت، موضوعات گفتگو کی، اصل میں ہم مردوں کے ساتھ زیادہ ہے۔ خواتین میں تو امیر ہوں یا غریب۔ پی ایچ ڈی یا ان پڑھ، پنجابی کہ دکنی۔ گفتگو کے بندھے ٹکے اصول آداب اور موضوعات ہیں۔

اے، بہن یہ ٹیکا بہت خوبصورت ہے کتنے کا بنا؟

اے آپا، یہ کپڑا کتنے کا ہے، لنڈی کوتل سے منگایا ہوگا۔

ماشاءاللہ کتنے بچے ہو گئے۔

آپ بالوں میں کون سا تیل لگاتی ہیں۔

یہ نیل پالش کون سی ہے باجی۔

اری رضیہ تم نے 'مسٹر اللہ دتہ' دیکھی۔ اس میں نیلو کا کام پسند آیا؟

ہائے اللہ کتنے اچھے سلیپر ہیں' کہاں سے لیے۔

کاش مردوں میں کچھ اسی قسم کی مفاہمت ہوتی۔ اب تک تو بالعموم ہی دیکھا کہ دو بھلے مانسوں میں تعارف ہوا اور وہ مزاج شریف کہہ کر رہ گئے۔ پھر سگریٹ پینے لگے وہ بھی یوں کہ یہ اپنا دھواں مشرق کی طرف منہ کر کے چھوڑتے ہیں۔ وہ مغرب کی طرف۔ اس کے بعد اخبار دیکھنے لگے۔ یہ بھی ہو چکا اور خاموشی زیادہ ہی ناگوار معلوم ہوئی تو ذہن پر زور ڈال کر کوئی سوال سوچا۔

آپ کہاں کام کرتے ہیں؟

پی۔ ڈبلیو۔ ڈی میں۔

یہی سڑکیں کھودنے والا محکمہ ہے۔

جی ہاں۔

پھر طویل خاموشی' یہ کم آمیزی اور کم گوئی مشرقی نہیں' بلکہ انگریزی اثر کا نتیجہ ہے۔ کہتے ہیں کہ کسی تباہ شدہ جہاز سے جان بچا کر دو انگریز کسی خالی جزیرے میں جا نکلیں تب بھی ایک دوسرے سے کلام نہ کریں گے تاآنکہ باقاعدہ تعارف کی رسم ادا نہ ہو جائے۔ وہاں کی ریل گاڑیوں میں بھی جس کو دیکھیے اپنی جگہ دوسرے سے بے تعلق اور بیزار بیٹھا ہے۔ آنکھیں نہیں ملاتا۔ ہمسایے کے اخبار کے بیچ کے ورق نہیں کھینچتا۔ اس سے بال بچوں کی تعداد نام اور پتے نہیں پوچھتا۔ اپنے نہیں بتاتا۔ ہم نے یہ کیفیت دیکھی تو وطن عزیز بہت یاد آیا جہاں کراچی سے ٹنڈو آدم تک دو بھلے مانس جائیں تو ایک دوسرے کے شجرہ نسب سے کماحقہ آگاہ ہو چکے ہوتے ہیں' بلکہ باہم رشتے بھی

طے پا جاتے ہیں۔

تقریب اس ساری تمہید کی یہ ہے کہ کل رات مسز جمیل نے جو ہماری بھابی ہیں اپنی ایک سہیلی کو کھانے پر بلایا۔ ساتھ ان کے میاں کو بھی۔ خاتون تو آرٹسٹ ہیں لیکن میاں ان کے تاجر اور زمیندار قسم کے آدمی ہیں۔ مظفر گڑھ میں ان کی ایک شوگر مل ہے' مرید کے میں کھالوں کی رنگائی کا کارخانہ ہے' ملتان میں ولائتی کھاد کی سول ایجنسی ہے اور اس کے علاوہ' بی ڈی کے چیئرمین ہیں۔ گویا جامع حیثیات بزرگ ہیں۔ ان کے مقابلے میں ہمارے دوست میاں جمیل نرے شاعر اور صحافی ہیں۔ انہوں نے اپنی بیگم سے پوچھا کہ تمہاری سہیلی کے میاں کوئی شاعر واعر ہیں کیا؟

''نہیں۔''

''فلسفے سے ذوق ہے۔''

''خدانخواستہ۔''

''تاریخ' علم الکلام اور سیاست مدن میں درک ہے۔''

''تاریخ....؟ میرے خیال میں جیسی صاف تاریخ بغیر تعمیے اور تخرجے کے تم کہتے ہو ویسی وہ نہیں کہہ سکتے۔ ابوالکلام کو بھی اگر پڑھا ہو تو مجھے معلوم نہیں۔ مدن بھائی کو وہ نہیں جانتے۔ باقی رہی سیاست تو کیا معنی اپنی تحصیل کے چوٹی کے سیاست دان ہیں۔ میں نے بتایا نہیں کہ بی ڈی کے چیئرمین ہیں۔

اس پر جمیل میاں نے کہا۔ ''پھر تو بھاگوان تم ہی ان سے گفتگو کرنا مجھے تو رات کو مشاعرے میں جانا ہے۔ زیادہ سے زیادہ انشا صاحب کو بلالو وہ ہر قسم کی گفتگو پر قادر ہیں۔

ہماری بھابی نے کھانے کا تکلف بہت کیا تھا۔ ہم ذرا دیر سے پہنچے۔ مہمانوں سے تعارف بھی نہ ہوا۔ اس کے بعد بھابی تو اپنی آرٹسٹ سہیلی کو ایک طرف لے گئیں اور ان

کے جھمکوں کی تعریف سے گفتگو کا آغاز کیا۔ ہم مردوں کے ساتھ ڈرائنگ روم میں آ بیٹھے۔ ہم نے قیافے سے دریافت کیا کہ ہماری داہنی طرف جو بزرگ لانبی مونچھوں والے بیٹھے ہیں' یہی چودھری خیر دین جنجوعہ ہیں' ان کی سہیلی کے میاں۔ ان کا تفصیلی تعارف بھابی نے فون ہی پر کرادیا تھا۔ لہٰذا ہم نے چھوٹتے ہی پوچھا۔

☆☆

''اب کے گنے کی فصل تو آپ کے ہاں خوب ہوئی۔''

وہ بھونچکے سے ہو کر بولے۔ ''جی؟ کیا فرمایا۔''

ہم نے دوسرا سوال داغا۔

''البتہ کھالوں پر جنگ کی وجہ سے اثر پڑا ہوگا؟''

اس پر وہ چپ رہے۔ ہم نے جانا کہ اپنے تجارتی بھید کو بھید ہی رکھنا چاہتے ہیں۔ لہٰذا موضوع نمبر ۳ لیا۔

''شلجموں کے لیے کون سی ولایتی کھاد موزوں رہتی ہے۔ ہم نے اپنے لان میں شلجم بوئے ہیں۔''

اس گفتگو کی بھنک بھابی کے کان میں پڑی تو وہ بھاگی آئیں' بولیں۔

''یہ آپ کن سے بات کر رہے ہیں۔ یہ تو مشہور مرثیہ نگار شعلہ بنارسی ہیں' میرے بھانجے کے ہمزلف۔ یہ دوسرے میرے تایازاد بھائی کرنل حبیب اللہ ہیں اور یہ میری سہیلی کے میاں چودھری خیر.... ارے یہ تو سو گئے۔ ابھی اٹھیں گے تو ان سے بات کرنا۔''

اس روز کی محفل میں چودھری خیر دین کے خراٹوں کی گونج میں ہم نے دو غزلیں شعلہ صاحب کو سنائیں اور تین قصیدے اور ایک شہر آشوب سے انہوں نے یہ قرض اتارا۔ کرنل صاحب کو ہم نے کچھ دیر بکتر بند گاڑیوں کے اسرار و رموز میں الجھایا۔ اس

کے بعدان کا ہاتھ دیکھ کران کے گھوڑے کے اگلی ریس جیتنے کی خوشخبری دی۔اور جب
چودھری خیر دین جنجوعہ استراحت سے فارغ ہوئے تو سلسلہ کلام کو یوں مربوط کیا کہ
ولایتی کھاد سے نیشکر کی اقسام جدید تک آتے اور بی ڈی کے تازہ ترین الیکشنوں سے
بدیں عنوان گریز کیا کہ رشوت خوری اور بدعنوانی کرنے والوں کی کھال میں بھس
بھروادینا چاہیے یہاں سے سلسلہ گفتگو چودھری صاحب کے ہاتھ میں آیا اور پہلے تو
انہوں نے کھالوں کے مسئلے پر تقریر کی پھر بھُس کی کمیابی کے اسباب بیان کیے۔آخر
میں کچھ ذکر افریقہ اور مشرق وسطےٰ کے حالیہ انقلابوں اور ویت نام کا بھی ہوا۔گفتگو کے
خاتمے تک وہ ہمیں اپنے ہاں کی کھانڈ کی ایک بوری ریویو کے لیے بھجوانے کا وعدہ
کر چکے تھے اور کھالوں کی رنگائی کے سلسلے میں ہم ان کا مشیر اعزازی بننے کی ہامی
بھر چکے تھے۔

☆☆

یہاں ہم گزارش کریں کہ اس تحریر کو خودستائی پر محمول نہ کیا جائے۔من آنم کہ من دانم۔
جس طرح پرانے زمانے میں علوم مجلسی میں یہ شامل تھا کہ ہر شریف زادے کو ہزار دو
ہزار اشعار اساتذہ کے ازبر ہونے چاہئیں۔ کچھ اسی قسم کی یہ سائنس ہے۔جن
صاحبوں کو مزید معلومات درکار ہوں ہمارے ادارہ علوم مجلسی (رجسٹرڈ) میں داخلہ لے
سکتے ہیں۔دس روپے کا منی آرڈر آنے پر پراسپیکٹس مفت بھیجا جاتا ہے۔

اخبار میں آیا ہے کہ فرانس میں بالوں کے فیشن کی ایک نمائش کا افتتاح چوٹی کاٹ
کر کیا گیا۔چوٹی کاٹنا کوئی نئی بات نہیں ہے۔کئی سال ہوئے لاہور میں ایک صاحب
ہروقت قینچی لیے بازار میں کھڑے رہتے تھے۔جو بی بی اُن کو بے پردہ نظر آتیں یا جن
کا لباس ان کی پسند کے مطابق نہ ہوتا۔اس کی چوٹی کاٹنے کو دوڑتے تھے۔لیکن فرانس
کی اس نمائش میں شریک ہونے والوں کی چوٹیاں نہیں کاٹی گئیں بلکہ مختلف رنگوں کے

بالوں کی ایک چوٹی گوندھ کر صدر دروازے کے آر پار تان دی گئی تھی۔اسی کو کاٹا گیا
اور کاٹنے والے کوئی مولانا نہیں تھے۔ایک صاحبہ نے خود قینچی چلائی۔ساتھ ہی ساتھ
انہوں نے ایک تقریر دل پذیر سے بھی حاضرین کو نوازا۔دیکھنے والوں کا کہنا ہے کہ
لوگ کبھی ان کی قینچی کی طرف دیکھتے اور کبھی ان کی زبان کی طرف کہ اُدھر جاتا ہے
یا ادھر آتا ہے۔

خوشی ہمیں اس بات کی ہوئی کہ افتتاح جیسی رسمی رسم میں بھی کوئی پہلو جدّت کا نکلا۔
ورنہ تو عام انداز افتتاح کا یہ ہے کہ پچھلے دنوں اس شہر میں دودھ دہی اور مٹھائی کی ایک
دکان ''جوئے شیر'' کا افتتاح ہوا۔ایک مولانا نے تقریر کی اور حوالوں سے بتایا کہ
ہمارے بزرگان دین شیرینی بہت پسند فرماتے تھے۔جب سے لوگوں نے ان کی تقلید
سے انحراف کیا ہے ملّت پر زوال آ گیا ہے۔اس کے بعد دُعا کی کہ رب العزّت اس
کاروبار میں برکت دے۔حاضرین نے اتفاق رائے سے ایک ریزولیوشن بھی پاس کیا
کہ چربی کی درآمد پر سے پابندیاں اٹھالی جائیں اور کارپوریشن کے احتسابی عملے کو
سخت گیری سے روکا جائے۔ازاں بعد سب حاضرین کو ایک ایک لفافہ تھمایا گیا جس
میں دو دو لڈو تھے اور دو دو امرتیاں تھیں۔

ایک اور مثال لیجیے۔

ابھی چند دن پہلے ہمارے محلے میں فیض عام نائٹ کالج کا افتتاح ہوا تو بس فیتہ کٹا
اور دعائے خیر پر بات ختم ہوگئی۔یہ سچ ہے کہ بعد میں جوتیوں میں دال بٹی لیکن فقط
منتظمین کے درمیان۔شرکائے افتتاح اس سے بھی محروم رہے۔اسی طرح پاپوش نگر
میں گزشتہ ماہ بان کی چارپائیوں کی ایک دکان کا افتتاح ہوا۔ہمارا خیال تھا کہ شریک
ہونے والوں کو یا کم از کم ہم اخباری نمائندوں کو ایک ایک چارپائی تحفتاً پیش کی جائے
گی لیکن چارپائی ایک طرف منتظمین سے یہ بھی نہ ہوا کہ ایک ایک رسی ادوائن کی تقسیم

کر دیتے۔

بس ایک مولانا نے پہلے وعظ کیا کہ اے مسلمانو! حبل المتین کو مضبوطی سے پکڑے رکھو۔ اسی کے بعد دوسری رسیّوں کا ذکر درمیان میں لائے۔ چارپائی کی رعایت سے، انہوں نے شیخ سعدی کے قطعہ ''شاید کہ پلنگ خفتہ باشد'' کی تشریح بھی کی اور شیخ سعدی کی زبان (علیہ الرحمۃ) سے کرتے ہوئے کہا کہ اصل مصرع یوں ہونا چاہیے تھا۔ ''شاید کہ بر پلنگ خفتہ باشد'' اپنے وسیع مطالعہ سے وہ فارسی ادب میں سے اور بھی مثالیں لائے مثلاً ''چارپائی بروکتا بے چند'' پھر ایک خوش الحان صاحبزادے نے غالب کی غزل پڑھی ہے لوگ نالے کو رسا باندھتے ہیں۔

لیکن یہ نہ بتایا کہ وہ رسا کس چیز کا ہوتا تھا۔ اُس کے بعد دعائے خیر پر تقریب ختم۔ اس قسم کے جلسے ہونے لگے تو لوگ آئندہ افتتاح کی تقریبوں میں شریک ہونا ترک کر دیں گے۔

☆☆☆

شرط انصاف یہ ہے کہ جس چیز کا افتتاح ہو اس سے شرکائے محفل کو متمتع ہونے کا موقع ضرور دیا جائے۔ اگر جنرل اسٹور ہے تو کنگھیوں، پوڈر، کریموں، مچھر دانیوں وغیرہ سے تواضع کی جائے۔ اگر قصاب کی دکان ہے تو سب کو آدھ آدھ سیر گوشت یا قیمہ رومال میں باندھ کر دیا جائے۔ ہیئر کٹنگ سیلون ہو تو حاضرین کا سر مونڈا جائے اور چمپی کی جائے۔ یہ کوئی ایسی بڑی بات نہیں۔ صاحب توفیق لوگ کرتے ہی ہیں۔ ہم نے بندر روڈ پر ایک سینما کا افتتاح ہوتے دیکھا ہے۔ سب لوگوں کو مفت فلم دکھائی گئی تھی اور بغدادی محلے میں ایک نئے تھانے کی رسم افتتاح یوں ادا کی گئی کہ رسم میں شریک ہونے والے سبھی صاحبوں کو ایک رات حوالات میں رکھا گیا اور دوسرے روز ضمانتوں پر رہا کیا گیا۔ ہمیں افسوس ہے کہ ہم اس افتتاح میں شریک نہ ہو سکے۔ جو

لوگ ہوئے ان کا بیان ہے کہ اچھی آرام دہ حوالات بنائی گئی ہے۔ افتتاح کی رسم ادیبوں تک بھی پہنچ گئی ہے۔ کوئی شخص رسالہ نکالتا ہے تو میر ہوٹل میں لوگوں کو چائے پلا کر پرچے کی نقاب کشائی کرتا ہے۔ کسی کا دیوان چھپتا ہے تو اسے بھی دعوت کی سوجھتی ہے تا کہ حاضرین میں ایک ایک نسخہ اپنی کتاب کا پیش کر کے پہلا ایڈیشن ختم کر سکے۔ یہ متعدی بیماری غریب غرباء تک بھی پہنچ گئی ہے۔ ہمارے ایک دوست نے جس کے پاس فالتو وقت بہت ہے، پچھلے دنوں برنس روڈ پر گنڈیریوں کی ایک ریڑھی لگائی تو ہمیں اور اپنے سب دوستوں کو بلایا۔ ایک صاحب نے اس موقع پر گنڈیریوں کی تعریف میں فسانہ آزاد میں سے خوجی کے اشعار خوش الحانی سے پڑھے اور دوسرے صاحب نے خود اپنے شعر پڑھے بلکہ اس مصرع سے تاریخ بھی نکالی۔

ہائے کیا خوش مزا گنڈیری ہے

بعد ازاں حاضرین کو ایک ایک گنڈیری تحفتاً پیش کی گئی۔

☆☆☆

تبصرے کے لیے سالن کی دو پتیلیاں آنی ضروری ہیں

جناب مطبخ مرادآبادی کی یہ کتاب مستطاب ہمارے پاس بہ غرض ریویو آئی ہے۔ جو صاحب یہ کتاب لائے وہ نمونہ طعام کے طور پر بگھارے بینگنوں کی پتیلی بھی چھوڑ گئے تھے۔ کتاب بھی اچھی نکلی، بینگن بھی۔ قلت گنجائش کی وجہ سے آج ہم فقط کتاب پر ریویو دے رہے ہیں۔ بینگنوں پر پھر کبھی سہی۔ اس سلسلے میں ہم اپنے کرم فرماؤں کو ریویو کی یہ شرط یاد دلانا چاہتے ہیں کہ کتاب کی دو جلدیں آنی ضروری ہیں۔ اور سالن کی دو پتیلیاں۔

اس کتاب میں بہت سی باتیں اور ترکیبیں ایسی ہیں کہ ہر گھر میں معلوم رہنی چاہئیں۔ مثلاً یہ کہ سالن میں نمک زیادہ ہو جائے تو کیا کیا جائے۔ ایک ترکیب تو اس کتاب کے بموجب یہ ہے کہ اس سالن کو پھینک کر دوبارہ نئے سرے سے سالن پکایا جائے۔ دوسری یہ کہ اس میں کوئلے ڈال دیئے جائیں۔ چولہے میں نہیں سالن میں۔ بعد ازاں نکال کر کھایئے۔ یہاں تھوڑا سا ابہام ہے۔ یہ وضاحت سے لکھنا چاہیے تھا کہ کوئلے نکال کر سالن کھایا جائے یا سالن نکال کر کوئلے نوش جان کیے جائیں۔

ہمارے خیال میں دونوں صورتیں آزمائی جاسکتی ہیں۔ اور پھر جو صورت پسند ہو اختیار کی جاسکتی ہے۔

کھیر پکانے کی ترکیب بھی شامل کتاب ہذا ہے۔ اس کے لیے ایک چرخی' ایک کتے، ایک ڈھول اور ایک ماچس کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ نسخہ امیر خسرو کے زمانے سے آزمودہ چلا آتا ہے۔ لیکن اس میں ماچس کا ذکر نہ ہوتا تھا۔ خدا جانے چرخے کو کیسے جلاتے ہوں گے۔ ٹیڑھی کھیر عام کھیر ہی کی طرح ہوتی ہے۔ فقط اس میں بگلا ڈالنا ہوتا ہے تاکہ حلق میں پھنس سکے۔ اس کتاب میں بعض ترکیبیں ہمیں آسانی کی وجہ سے پسند آئیں۔ مثلاً بادام کا حلوہ یوں بنایا جاسکتا ہے کہ حلوہ لیجیے اور اس میں بادام چھیل کر ملا دیجئے۔ بادام کا حلوہ تیار ہے۔ بینگن کا اچار ڈالنے کی ترکیب یہ لکھی ہے کہ بینگن لیجیے۔ اور بہ طریقہ معروف اچار ڈال لیجیے۔ حلوۂ بے دودھ، سنبوسہ بیسن اور تھالی کے بینگن وغیرہ کی ترکیبیں بھی آسان ہیں لیکن انہیں ہم بہ خوف طوالت نظرانداز کرتے ہیں۔ شائقین اصل کتاب ملاحظہ فرمائیں۔

ہم نے خود مکمل باورچی خانے کی صرف ایک ترکیب آزمائی ہے، وہ ہے روٹی پکانے کی۔ قارئین کرام بھی اسے آزمائیں اور لطف اٹھائیں۔

سب سے پہلے راشن کارڈ بنوایئے۔ اس کے بعد اسے بھول جائیں۔ کیونکہ اب آٹا اس کے بغیر مل جاتا ہے۔ آٹا آ گیا تو اس میں پانی ڈالیے۔ اب اسے گوندھیے۔ گندھ گیا؟ شاباش۔ اب چولہے کے پاس، اکڑوں بیٹھیے۔ اور دھوئیں سے بچنے کے لیے چہرے پر گیس ماسک چڑھا لیجیے۔ خوب۔ اب پیڑا بنایئے۔ اگر آپ کا وطن لکھنؤ رہا ہے تو دو تولے کا۔ اور بنوں کو وطن ہونے کا فخر حاصل ہے تو سیر سوا سیر کا۔ اب اسے کسی ترکیب سے چپٹا اور گول کر کے توے پر ڈال دیجیے۔ اسی کا نام روٹی ہے اگر یہ کچی رہ جائے تو ٹھیک ورنہ کوئلوں پر ڈال دیجے تا آنکہ جل جائے۔ اب اسے اٹھا کر رومال

سے ڈھک کر ایک طرف رکھ دیجیے اور نوکر کے ذریعے تنور سے پکی پکائی دو روٹیاں منگا کر سالن کے ساتھ کھائیے بڑی مزیدار معلوم ہوگی۔

مصنف نے شجرہ نسب بھی دیا ہے۔ ان کا تعلق دو پیازہ کے گھرانے سے ہے۔ شاعر بھی ہیں۔ بیاہ شادیوں پر ان کی خدمات حاصل کی جاسکتی ہیں۔ دیگیں پکانے کے لیے بھی، سہرا کہنے کے لیے بھی۔ ہر ترکیب کے بعد مصنف نے اپنے اشعار بھی درج کیے ہیں۔ جس سے دونوں خصوصیتیں پیدا ہوگئی ہیں۔ باورچی خانہ کا باورچی خانہ۔ دیوان کا دیوان۔

آلو چھیلنے کی ترکیب

سامان:۔ آلو، چُھری، پلیٹ، ناول، ڈیٹول، پٹی۔

آلو لیجیے، اسے چھری سے چھیلیے۔ جن صاحبوں کو گھاس چھیلنے کا تجربہ ہے۔ ان کے لیے یہ کچھ مشکل نہیں۔ چھلے ہوئے آلو ایک الگ پلیٹ میں رکھتے جائیے۔ بعض صورتوں میں جہاں چھیلنے والا ناخواندہ ہو، یہ عمل بالعموم یہیں ختم ہوجاتا ہے۔ لیکن اخبار خواتین' کی اکثر قارئین پڑھی لکھی ہیں لہٰذا آلو چھیلنے میں ابن صفی کے ناول یا فلمی پرچے ضرور پڑھتی ہوں گے۔ ڈیٹول انہی کے لیے ہے۔ جہاں چرکا لگا ڈیٹول میں انگلی ڈبوئی اور پٹی باندھ لی۔ ہمارے تجربے کے مطابق ڈیٹول کی ایک چھوٹی شیشی میں آدھ سیر آلو چھیلے جاسکتے ہیں۔ بعض جزرس اور سلیقہ مند خواتین سیر بھر بھی چھیل لیتی ہیں۔ جن بہنوں کو ڈیٹول پسند نہ ہو وہ سیولان یا ایسی ہی کوئی اور دوا استعمال کرسکتی ہیں۔ نتیجہ یکساں رہے گا۔

شاہی بریانی

بریانی اور شاہی بریانی کی ترکیبیں اخباروں اور رسالوں میں اکثر چھپتی رہتی ہیں لیکن ہم نے دیکھا ہے کہ ان میں طول العمل بہت ہوتا ہے اور اکثر گرہستن بیبیاں اسی لیے ان کو پسند نہیں کرتیں۔ ہمارا نسخہ بہت مختصر اور آسان ہے۔ اس کے لیے فقط ان چیزوں کی ضرورت پڑے گی۔

۱۔ دو نوٹ دس دس روپے کے (پانچ پانچ اور ایک ایک کے ہوں تب بھی کام چل جائے گا)۔

۲۔ ایک باورچی مشاق، بہتر ہے دلّی والا ہو۔

۳۔ ایک خالی ڈونگا۔

باورچی سے کہیے کہ میاں یہ لو پیسے اور جو کچھ لانا ہے لاؤ لیکن ہمیں بریانی کھلاؤ۔ چند گھنٹوں کے اندر لاجواب بریانی تیار ہوگی۔ خالی ڈونگا بازار سے سالن منگانے کے لیے ہے کیونکہ بعض لوگ بریانی میں سالن بھی ڈالتے ہیں۔ ہمارا تجربہ ہے کہ بیس روپے میں آپ اور باورچی دونوں پیٹ بھر کر کھاسکتے ہیں۔ بشرطیکہ چاول، گھی، مرچ مسالے آپ اپنے پاس سے دیں۔ کھاچکیں تو باورچی کو انعام دے کر رخصت کیجیے اور اطمینان سے بیٹھ کر برتن دھوئیے۔

حلوۂ بے دودھ

اس حلوے کی ترکیب نہایت آسان ہے۔ حلوہ پکائیے اور اس میں دودھ نہ ڈالیے۔ نہایت مزیدار حلوہ بے دودھ تیار ہے۔ ورق لگائیے اور چمچے سے کھائیے۔

نہاری

کون ہے جس کے منہ میں نہاری کا لفظ سن کر پانی نہ بھر آئے۔ اس کا رواج دہلی اور لاہور میں زیادہ ہے لیکن دونوں جگہ نسخے میں تھوڑا اختلاف ہے۔ دلی والے نلیاں، پائے، مغز اور بارہ مسالے ڈالتے ہیں جس سے زبان فصیح اور با محاورہ ہو جاتی ہے۔ پنجاب والے بھوسی، بنولے اور چنے ڈالتے ہیں کہ طب میں مقوی چیزیں مانی گئی ہیں۔ گھوڑے اول الذکر نسخے کو چنداں پسند نہیں کرتے، جس میں کچھ دخل صوبائی تعصب کا بھی ہوسکتا ہے لیکن اس تعصب سے دتی والے بھی یکسر خالی نہیں۔ ان کے سامنے دوسرے نسخے کی نہاری رکھی جائے تو رغبت کا اظہار نہیں کرتے، بلکہ بعض تو بُرا بھی مان جاتے ہیں۔

اس بات میں فقط ایک احتیاط لازم ہے۔ کھانے والے سے پوچھ لینا چاہیے کہ آدمی ہے یا گھوڑا۔

☆☆☆

ہمارا ریڈیو بج رہا ہے اور بے آواز ہے
پڑوسی کے ریڈیو سے بھی کام چل جاتا ہے

اخبار میں ایک صاحب کا شکایتی خط چھپا ہے۔ ہمارے پڑوس میں ریڈیو بجتا رہتا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں؟ اور ہماری سمجھ میں بھی نہیں آیا کہ یہ خط ہمیں کیوں لکھا گیا ہے۔ ہمارا ریڈیو مرمت کرنے کی کسی دکان سے کوئی تعلق نہیں کہ کسی مکینک کو بھیجیں اور وہ اسی طرح اس ریڈیو کو ہمیشہ کے لئے خاموش کردے جس طرح فٹافٹ ریڈیو سروس کے ایک مشاق مستری نے ہمارے ریڈیو کو کیا۔

ہمارا یہ ریڈیو چنداں پرانا نہیں اور بہت اچھے ماڈل کا ہے۔ ہم نے دوسری جنگ عظیم کی خبریں شروع سے آخر تک اسی پر سنیں۔ لیکن چند سال سے جانے کیا ہوا۔ اس میں کچھ کھڑ بڑ ہونے لگی تھی۔ جیسے چوہے گھس گئے ہوں۔ ایک بار تو ہم نے اسے کھول کے اس میں بلی بھی داخل کی۔ لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا۔ پھر اس میں چوہا پکڑنے کا شکنجہ کئی روز لگائے رکھا لیکن یہ چوہے ایسی چالاک قوم ہیں کہ پھنس کے نہ دیے۔ آخر کسی نے کہا۔ تم لوگ اناڑی ہو۔ ریڈیو کا ستیاناس کر دو گے۔ اس میں کوئی چوہے وہے نہیں ہیں بلکہ یک پیری و صد عیب۔ اس کے عناصر میں اعتدال نہیں رہا۔ بہتر تو یہ ہے کہ کسی

کباڑی کو بلاؤ ورنہ کوئی مستری مل جائے گا۔ کباڑی والی بات تو ہمارے جی نہ لگی۔
مستری صاحب مل گئے۔ خدا جانے انہوں نے اسے کھول کے کیا جادو کیا کہ ساری کھڑ
بڑ کھڑ بڑ جاتی رہی۔ اس کھڑ بڑ کا تعلق آواز سے تھا۔ جب تک آواز تھی، یہ بھی تھی۔ ان
مستری صاحب نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ میں اوپر کی لیپا پوتی یا ہاتھ کی صفائی کا قائل
نہیں۔ خرابی کی جڑ بنیاد تک پہنچتا ہوں اور پھر اسے اکھاڑ پھینکتا ہوں۔ آدمی صادق
القول تھا جو کہا وہی کر دکھایا۔ آواز نہ رہی تو کھڑ بڑ بھی نہ رہی اور اس شخص نے اپنی محنت
کا ہدیہ کیا لیا؟ فقط پندرہ روپے۔ ہم نے پندرہ روپے کے بجائے اس کی محنت کو دیکھتے
ہوئے اسے ریڈیو دینے کی پیش کش کی تھی۔ لیکن وہ بولا جی نہیں۔ آبائی جائداد سے
انسان کے جذبات وابستہ ہوتے ہیں۔ اسے اپنے پاس ہی رکھیے۔

☆☆☆

اب یہ ریڈیو ایسا کارآمد ہو گیا ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا۔ یہ نہ ہو تو ہم کیا کریں۔ پیچھے
کا ڈھکنا ہم نے اتار دیا ہے اور اس کے اندر سوئی دھاگا، ٹوٹے بٹن، بے کار پنسلیں،
مستعمل بلیڈ اور انتہائی راز داری کے خطوط رکھتے ہیں۔ اب رہا ریڈیو پروگرام سو وہ
کہیں سے بھی سنا جا سکتا ہے۔ ہمارے پڑوسیوں کا ریڈیو ان کے عقبی برآمدے میں
برابر بجتا ہی رہتا ہے۔ لیکن اس کی آواز وہ بہت دھیمی رکھتے تھے۔ اس کا علاج ہم نے
یوں کیا کہ دونوں صحنوں کی درمیانی دیوار کے ساتھ بانس کی ایک سیڑھی لگا دی اور اس پر
جا چڑھے۔ کان اس طرف کو لگا دیے۔ نہ ہینگ لگے نہ پھٹکڑی۔ کئی بار تو ہم وہاں لٹکے
لٹکے سو بھی جاتے تھے۔ لوگوں کو ہمیں ٹانگوں سے پکڑ کر کھینچنا پڑتا تھا۔

یہ بانس کی سیڑھی والی تکلیف بھی۔ اگر کوئی اسے تکلیف سمجھے تو، چند ہی روز رہی۔
اس کے بعد ہم نے ان کے گھر شکایت بھجوائی کہ آپ کا ریڈیو بہت اونچا بجتا ہے۔
ہمارے آرام میں خلل پڑتا ہے۔ اس روز سے وہ اسے پوری آواز سے کھلا رکھتے ہیں۔

ہم گھر کے کسی کمرے میں ہوں حتیٰ کہ غسل خانے میں بھی۔ پوری زناٹے کی آواز
سنائی دیتی ہے۔

ذاتی طور پر ہم ان صاحبہ کی شکایت کو کفرانِ نعمت سمجھتے ہیں۔ سرد وخانہ ہمسایہ سے
لطف اندوز ہونا عین جائز ہے۔ تاہم ان کو موسیقی کا ذوق کم ارزانی ہوا ہو تو ہم مشورہ
دیں گے کہ وہ پڑوس میں اس مضمون کا پرچہ بھجوا دیں کہ ذرا اپنا ریڈیو اونچا رکھا کیجیے
تاکہ ہم بھی پروگرام سن لیا کریں۔ یقین ہے ان کے دل کی مراد بر آئے گی یعنی پڑوسی
ریڈیو کو دھیما کر دیں گے۔

ریڈیو پروگراموں میں ہماری پسند یا تو قوالیاں ہیں یا کمرشل پروگرام۔ قوالیوں کی
چاٹ ایک تو اس وجہ سے پڑی کہ ہم صاحب دل آدمی ہیں۔ دوسرے اس لیے کہ کئی
برس تک جناب پیر حسین بخش عاصی چشتی نظامی نقش بندی کے پڑوس میں رہے ہیں۔
پیر صاحب موصوف کے ہاں جمعے کے جمعے سماع کی محفل تو ہوتی ہی ہے۔ اس کے علاوہ
بھی وہ صلح کل اور وسیع المشرب ہونے کے باعث کسی سلسلے یا فرقے کے کسی بزرگ کو
ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ آج کسی کا یوم ولادت ہے تو کل کسی کا یوم وصال۔ ایک
وجہ اس کی یہ ہے کہ قادر الکلام شاعر ہیں۔ عاصی ان کا تخلص ہی تو ہے۔ خدانخواستہ سچ
مچ کے گنہگار تھوڑا ہی ہیں۔ ہفتے میں پانچ چار قوالیاں وہ لکھ لیتے ہیں اور لکھنے کا کیا فائدہ
اگر جلسہ کر کے کسی باکمال کی زبانی سنی نہ جائیں۔ ہمیں بھی انہوں نے مشورہ دیا تھا کہ
غزل کو چھوڑ قوالی لکھا کرو اور اب یہ پرانی چیز تھوڑی ہی ہے۔ فیض بھی لکھتے ہیں۔ فلموں
میں بھی آتی ہیں چھجو قوال کپور تھلے والے ہمارے مرید ہیں۔ ان سے گوا دوں گا۔ لیکن
ہماری طبیعت ادھر نہیں آئی۔

قصہ مختصر یہ کہ قوالی کچھ اس طرح ہماری روح کا جزو ہوئی ہے کہ بعض اوقات سو رہے
ہوتے ہیں لیکن تالی بجا رہے ہوتے ہیں۔ اگر کہیں ریڈیو نہ ہوتا تو پیر صاحب کے

پڑوس سے اُٹھ آنے کے بعد بڑی تکلیف ہوتی۔ اس وقت بھی جب کہ ہم یہ سطور لکھ رہے ہیں۔ ریڈیو پر قوالی ہی ہو رہی ہے۔ پہلے تو چیف قوال نے یعنی قوال پارٹی کا سرغنہ نے تان اٹھائی۔

خودی کا سر نہاں، لا الٰہ، الا اللہ
خودی ہے تیغ فساں لا الہ، الااللہ

اس میں اینڈ پارٹی یعنی ہمنواؤں نے یہ جوڑ لگایا۔

ہم نے لاکھوں کے بول سہے، ستم گر تیرے لیے

یکا یک قوال اعظم کو خیال آئے گا کہ امیر خسرو کا کلام تو ہوا ہی نہیں۔ چنانچہ اگلا بول شاید یہ ہو۔

کھیر پکائی جتن سے چرخا دیا جلا
آیا کتا کھا گیا تو بیٹھی ڈھول بجا

لیکن سونار کی ایک لوہار کی۔ ہمنوا اس کا جواب بھی بلبلا کر یہی دیں گے۔

ہم نے لاکھوں کے بول سہے۔ ستم گر تیرے لیے

اب رہا کمرشل پروگرام۔ یہ یوں پسند ہے کہ اس میں روحانی غذا بھی ہوتی ہے اور دوسری بھی۔ کیونکہ نغموں کے ساتھ ساتھ بسکٹوں، مٹھائی اور ڈبل روٹیوں کے اشتہاروں کا ٹانکا اس طرح ملایا جاتا ہے کہ سننے والا مسلسل موسیقی سے اکتانے نہیں پاتا۔ ابھی آپ فیض کی غزل سن رہے ہیں۔

چلے بھی آؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے

فوراً بعد ارشاد ہوگا کہ گلشن اسکیم میں پلاٹ لینے کے لیے آپ نے ابھی تک عرضی نہیں دی تو اب دے دیجئے۔ ادھر کسی مغنیہ نے تان اڑائی کہ۔

ے رنگ لاتی ہے حنا پتھر پہ گھس جانے کے بعد

ادھر اعلانچی نے اعلان کیا کہ گل بہار مہندی خریدیے۔ ٹیوب میں آتی ہے۔ پتھر پہ گھسنے کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ ابھی غزل ہو رہی ہے۔

کام یاروں کا بقدر لب و دنداں نکلا

یکا یک آواز لگا کہ دانتوں کی صفائی اور چمک کے لیے افغان فارمیسی کے دندان شکن منجن سے بہتر کوئی چیز نہیں اور گلنار لپ اسٹک ہونٹوں کی جاذبیت کو دوبالا کرتی ہے۔ ادب پر کمرشل پروگرام کے اثرات کا اندازہ اس سے کیجیے کہ جیکب آباد میں میلہ مویشیاں کے موقع پر جو مشاعرہ ہو رہا ہے۔ اس کا مصرعہ طرح یہ تجویز ہوا۔ ع

جہاں ماما ہے وہاں ڈالڈا ہے

☆☆☆

آج کیا پکایا جائے؟
لکھنے کا مسئلہ کیسے حل ہو

آج کیا لکھا جائے؟

یہ مسئلہ ایسا ہی ٹیڑھا اور دشوار ہے جیسا یہ کہ آج کیا پکایا جائے۔ ہم نے اپنے دوستوں کے گھروں میں اس بات پر فساد ہوتے دیکھے ہیں۔ ہوتا یہ ہے کہ میاں سے بیوی صبح ضرور پوچھتی ہیں کہ 'سبزی والا کھڑا ہے، آج کیا پکایا جائے۔'

'جو جی چاہے لے لو۔' وہ نہایت استغنا سے جواب دیتے ہیں۔ لیکن جب دوپہر کو میاں کے سامنے کھانا آتا ہے تو جھلا اٹھتے ہیں۔ ''روز بینگن روز بینگن۔ مجھے کیا سمجھا ہے تم نے؟''

''آلو لے لوں پھر۔''

''قبض کرتا ہے۔''

''گوبھی۔''

''بادی ہے۔''

''چقندر''

''میٹھے ہوتے ہیں۔''

''کریلے''

''کڑوے ہوتے ہیں۔''

''شلجم''

''میں کوئی کشمیری ہوں۔''

''دال؟''

''بیگم! مارے ڈالتی ہو۔ تم جانتی ہو مجھے پہلے ہی گیس کی شکایت ہے۔''

'اچھا تو خالی گوشت پکائے لیتی ہوں۔'

''نابابا۔ تمہیں معلوم نہیں خالی گوشت فاسد خون پیدا کرتا ہے۔ سبزی تو کوئی ہونی ہی چاہیئے۔''

''آخر کون سی سبزی لوں۔''

''کہہ تو دیا جو جی چاہے لے لو'' میاں اخبار میں ضرورت رشتہ کے کالم میں منہمک ہو کر فرماتے ہیں۔

☆☆☆

''تو پھر آج کیا لکھا جائے۔''

ہم ان لوگوں میں سے نہیں جن کے لئے مضمون لکھنا بائیں ہاتھ کا کھیل ہو۔ پہلی بات تو یہ کہ ہم بائیں ہاتھ سے کوئی کام کر ہی نہیں سکتے۔ دوسرے یہ کہ اپنا شمار ان باکمالوں میں کرانا مقصود نہیں جن میں سے ایک سے فرمائش کی گئی کہ قطب مینار پر مضمون لکھو۔ وہ فوراً کھٹ کھٹ مینار کی سیڑھیاں چڑھ گیا اور اوپر سے چیخ کر پوچھنے لگا کہ کس موضوع پر لکھوں؟ بچپن میں جب ہم سے گھوڑے پر مضمون لکھنے کو کہا گیا تھا تو ہم نے بھی اسی طرح تعمیل حکم کی تھی۔ لیکن خرابی یہ ہے کہ گھوڑا قطب مینار نہیں ہے

جانور ہے۔ ہلتا بہت ہے۔ کتنا بھی سنبھل کے بیٹھو قلم رپٹ جاتا ہے۔

ہمیں اپنے ان محترم اور بزرگ افسانہ نویس پر ہمیشہ رشک آیا، جو فرماتے ہیں کہ میں ریڈیو کا فرمائشی پروگرام سن کر افسانہ لکھتا ہوں۔ وہ یوں کہ اس میں سے کوئی مصرع یا بول پسند آ جائے تو اسے بطور عنوان ٹانک کر قلم چلانا شروع کر دیتا ہوں۔ کہیں تو جا کے رُکے گا۔

سفینۂ غم دل۔ جب دیکھتا ہوں کہ سولہ صفحے ہو گئے اور یا تو ہیرو ہیروئن کی دھوم دھام سے شادی ہو گئی یا ان میں سے ایک خودکشی کر کے حرام موت مر گیا تو افسانہ ختم کر کے تہ کر کے ایڈیٹر کو بھیج دیتا ہوں۔ انہوں نے دوسروں کو بھی یہی مشورہ دیا ہے کہ ایسا ہی کیا کریں۔

ہم نے ان کے نئے پرانے افسانوں کا ایک مجموعہ نکال کے دیکھا۔ فہرست مضمون کچھ یوں چلتی تھی۔

۱۔ اس دل کے ٹکڑے ہزار ہوئے۔ ۲۔ میرا کوئی نہیں ہے تیرے سوا۔

۳۔ یہ شام کی تنہائیاں...... ۴۔ پریتم آن ملو۔ ۵۔ لال دوپٹہ ململ کا۔ ۶۔ جب پیار کیا تو ڈرنا کیا۔

ریڈیو عام ہونے سے پہلے وہ یہی کام گراموفون سے لیتے تھے۔ لیکن ان کی بات اور ہے۔ وہ ہماری طرح معمولی ادیب نہیں بلکہ مصور جذبات ہیں اور پبلشروں میں ان کی کتابوں کی اتنی مانگ رہتی ہے کہ وہ بالعموم چار کتابیں ایک ساتھ شروع کرتے ہیں۔ کمرے میں چاروں کونوں میں ایک ایک میز بچھی ہے اور ہر ایک پر ایک کاپی، قلم، دوات، سیاہی چوس وغیرہ دھرا ہے۔ طبیعت میں گرمی آئی تو ناول ''فاتح دمشق'' والی میز پر جا بیٹھے۔ رومان انگیز ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی ہو تو 'بیمار محبت' والی میز پر چلے گئے۔ ایک میز پر انہوں نے ایک تحقیقی کتاب شروع کر رکھی ہے۔ اہل

قرطاجنہ کا فلسفہ مابعد الطبیعات، اور ایک پر، رہنمائے مرغی خانہ، کیونکہ موصوف ریٹائر ہونے سے پہلے سرکاری مرغی خانے کے انچارج تھے۔ یہ سارا کارخانہ بڑی خوش اسلوبی سے چل رہا ہے۔ فقط ایک بار ذرا سی گڑبڑ ہوئی تھی کہ ناول' معرکہ ہلال وصلیب میں ایک مقام یوں آتا ہے۔

''صلاح الدین ایوبی نے تلوار اٹھا کر مجاہدوں سے خطاب کیا کہ بہادرو، آج زندگی اور موت کا سوال ہے۔ یاد رکھو۔ جب مرغی کے چوزے ایک ہفتے کے ہو جائیں تو ان کو روزانہ کنگنی کا چوگا دینا ضروری ہے اور دن میں دو بار پانی بھی ضرور پلایا جائے۔''

جب قارئین کرام کے شکایتی خط آئے تو مصور جذبات نے تحقیقات کی، معلوم ہوا قصور ان کا نہ تھا، کمرا صاف کرنے والے نوکر کا تھا جس نے بے سوچے سمجھے ایک میز کی کاپی اٹھا کر دوسری پر رکھ دی تھی۔ چنانچہ کتاب رہنمائے مرغی خانہ نکال کر دیکھی گئی تو اس میں ایک باب یوں رقم تھا۔

''مرغے کو گھٹنوں میں رکھ کر اس کے سر کو بائیں ہاتھ سے پکڑ لیتے ہیں اور دو چھوٹی انگلیوں سے اس کے پیٹ کی مالش کرتے ہیں۔ ایسا کرنا بہت ضروری ہے، ورنہ یہ عیسائی طاقتیں مل کر اسلام کا نام ونشان دنیا سے مٹا دیں گی۔ بس جوش ایمانی سے ایک ہلہ اور۔

کافر ہے تو شمشیر پہ کرتا ہے بھروسا!
مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی!

بہرحال ہماری مجبوری یہ ہے کہ ہم گراموفون یا ریڈیو کی مدد سے نہیں لکھ سکتے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ریڈیو سراسر بے کار چیز ہے۔ ہم تو حیران ہیں کہ جب ریڈیو پاکستان اور ریڈیو سیلون وغیرہ نہیں تھے اور فرمائشی پروگرام نہ ہوتے تھے تو لوگ اپنے بچوں کے نام کیسے رکھتے تھے۔ ہمارا مطلب جدید قسم کے ناموں سے ہے، ورنہ پرانے لوگ تو

تاریخی نام رکھتے تھے خواہ وہ 'استغفر اللہ' ہی کیوں نہ ہو' یا پھر یہ ہوتا تھا کہ باپ عبدالسلام کہہ کر پکارتے ہیں۔ دادا جان تاریخی نام خدا بخش ظہوری پر مصر ہیں۔ نانا کو علی قلی خان پسند ہے۔ اماں اچھن کہہ کر یاد کرتی ہیں۔ دوست احباب تن و توش پر نظر کر کے موٹو کہتے ہیں۔ لکھتے ہیں مجنوں رومانی کے نام سے اور دفتر میں تعارف ہوتا ہے تو اے۔ ایس چغتائی ہوتے ہیں۔

خیر کہنا یہ ہے کہ کنیز فاطمہ، عنایت بیگم اور الٰہی بخش قسم کے ناموں کے لیے ریڈیو کی ضرورت بے شک نہ تھی لیکن اب تو کشور کشا اور حسینہ عالم وغیرہ لڑکیوں کے نام سنے جاتے ہیں اور لڑکے صریرِ خامہ' نوائے سروش وغیرہ کہلاتے ہیں۔

☆☆☆

لاؤڈ اسپیکر کے لیے پردے کا خاص انتظام ہے

ہمارے ہاں پردہ روز بروز متروک ہوتا جا رہا ہے اور اگر اکبر الہ آبادی کی اطلاع صحیح ہے تو مردوں کی عقل پر پڑتا جا رہا ہے لیکن اس زمانے میں بھی ایسے لوگ موجود ہیں۔ جو اس شعار کی حتی الوسع پابندی کرتے ہیں۔ اخبار میں تلونڈی موسیٰ خاں ضلع گوجرانوالہ کے ایک جلسے کی خبر آئی ہے جس کے آخر میں لکھا تھا کہ ''لاؤڈ اسپیکر اور مستورات کے لیے پردے کا خاص انتظام ہے۔'' اگرچہ مستورات کے لیے اس قسم کا انتظام بھی عجائب وغرائب میں سے ہے۔ مستورات اور پردہ؟ خاصی ان مل اور بے جوڑ بات ہے لیکن لاؤڈ اسپیکر کے لیے پردے کا انتظام تو اور بھی طرفہ بات ہے

اس سے پہلے ہم ایک مشاعرہ دیکھ چکے ہیں۔ جس میں مردوں کے لیے پردے کا خاص انتظام تھا۔ یہ مشاعرہ کراچی کے ایک کالج برائے خواتین میں ہوا تھا اور ایک طرف قناتیں تان کر ان کے پیچھے مردوں کو بٹھایا گیا تھا۔ چوکی پہرے اور پولیس کا انتظام بھی خاصا معقول تھا تاکہ عورتیں پردے کے پیچھے تانک جھانک کر کے مردوں کی بے حرمتی نہ کریں اور ان پر آوازے نہ کسیں' فقط بیبیاں بے پردہ تھیں اور

جہاں تک ہمیں یاد ہے لاؤڈ اسپیکر بھی سب کی نظروں کے سامنے اسٹیج پر رکھا تھا۔ اس کے لیے برقعے یا کسی اور قسم کے پردے کا تکلف نہ کیا گیا تھا۔ یہ سعادت تلونڈی موسیٰ خان ہی کے حصے میں لکھی تھی۔ آج اکبر ہوتے تو خوشی سے پھولے نہ سماتے۔

لاؤڈ اسپیکر کے لفظی معنی ہیں اونچا بولنے والا۔ بعض لوگوں کے نزدیک جن سے ہمارا متفق ہونا غیر ضروری نہیں، اسے بھی خواتین کی ایک خصوصیت قرار دیا جاتا ہے اور کچھ عجب نہیں۔ اسی وجہ سے اس آلے کو جو محض مشین ہے، خواتین کے زمرے میں شمار کیا گیا ہو۔ ہمارے خیال میں یہ مماثلت مبالغے سے خالی نہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ لاؤڈ اسپیکر اونچا بولتا ہے اور جیسا کہ اکثر دیکھا گیا ہے بہت بولتا ہے اور کسی کی نہیں سنتا اور ہمیں یہ بھی تسلیم کہ مردوں کو اللہ تعالیٰ نے یہ خصوصیات فیاضی سے ودیعت نہیں کیں۔ تاہم لاؤڈ اسپیکر محض ایک مشین ہے جو بجلی کے زور سے بولتی ہے اور بلانے سے بولتی ہے۔ جب بجلی کٹ جائے تو یہ خاموش ہو جاتی ہے۔ خواتین اللہ کی ذی روح مخلوق ہیں۔ ان پر بجلی کے کٹنے کا بھی کوئی اثر نہیں ہوتا۔ ہاں زبان کٹ جائے تو مجبوری ہے۔ سائنس دانوں کے بنائے ہوئے ایک آلے کو اتنا بڑھانا ہمارے خیال میں بے سمجھی کی دلیل ہے۔

☆☆☆

مشینوں میں ایک مشین البتہ ہم نے پردے میں دیکھی ہے۔ آپ نے بھی لاہور میں اسپتال روڈ پر اور کراچی میں صدر اور بندر روڈ کے فٹ پاتھوں پر دیکھی ہوگی، وہ ہے کیمرہ۔ یہ کیمرہ مین بھی ایسے متشرع ہوتے ہیں کہ تصویر کھینچتے وقت چہرے پر نقاب ڈال لیتے ہیں تاکہ تصویر کھنچوانے والوں کی نامحرم نظروں سے بچے رہیں۔ سب سے زیادہ بے پردگی اگر ہم نے دیکھی تو اس تصویر کھنچوانے والے طبقے میں۔ اچھی اچھی پردہ دار بی بیاں چہرہ کھول کر بیٹھ جاتی ہیں۔ ہم نے فقط ایک بی بی ایسی دیکھی ہے جس نے برقعہ پورا اوڑھ کر تصویر کھنچوائی تھی۔ ہم نے بھی یہ دیکھی۔ فنی نقطہ نظر سے بہت

صاف اور عمدہ تصویر تھی لیکن صاحبہ مذکور کو پہچاننے میں قدرت دقت ہوتی تھی۔ انہیں خود بتانا پڑتا تھا کہ یہ میری تصویر ہے، برقعے کی جھالر نہیں دیکھتے؟

ہم یہاں تک پہنچے تھے کہ ایک صاحب نے بڑھ کر کہا میاں تم نے خشت اول ہی غلط رکھی ہے جس کی وجہ سے تمہارا سارا مضمون ٹیڑھا جا رہا ہے۔ ہم نے کہا خیر باشد۔ بولے! تلونڈی موسیٰ خان والے جلسے کے اشتہار کا مطلب فقط یہ ہے کہ لاؤڈ اسپیکر کا بھی انتظام ہے اور مستورات کے لیے پردے کا بھی۔ مانا کہ یہ اشتہار کسی ایسے عالم کا لکھا ہوا ہے جسے صرف ونحو سے کم واقفیت ہے لیکن تم تو اسے ملا کر مت پڑھو۔

ہماری ناچیز رائے میں ہم جیسے مصروف آدمی سے یہ تقاضا کرنا کہ ہم ان باریکیوں پر غور کریں گے ذرا زیادتی ہے۔ اس سے کہیں آسان یہ ہے کہ اشتہار لکھنے والوں سے ذرا احتیاط کا مطالبہ کیا جائے۔ اس سے پہلے اسی صرف ونحو کے قصے میں ہم نقصان اٹھا چکے ہیں۔ ایک جگہ سے ہم خالص پنجاب کا گھی، لایا کرتے تھے۔ ہمیں تو کچھ ایسا ناپسند نہ تھا لیکن ایک روز اس میں سے ایک چھلا ہوا آلو ثابت نکل آیا اور ایک چربی کا ٹکڑا بھی تو شکایت کرنی پڑی۔ تب اس بزرگ نے وضاحت کی کہ جناب گھی تو یہ بناوٹی ہے۔ میں نے اس کے اصلی ہونے کا دعویٰ کہاں کیا ہے۔ میں تو صرف اس کا ذمے دار ہوں کہ یہ میں ٹوبہ ٹیک سنگھ سے منگاتا ہوں جو خالص پنجاب میں ہے۔ سندھ وندھ میں نہیں ہے۔ انہی کے پڑوس سے ہمارے ناشتے کے لیے انڈے آیا کرتے تھے کیونکہ اس دکان پر تازہ مرغی کے انڈے کا بورڈ لگا تھا۔ ایک روز جو دو انڈے گندے نکل گئے تو اس اشتہار کا مطلب بھی معلوم ہوا۔ دکاندار نے کہا کہ جناب وہ مرغی جس کے انڈے ہیں، بالکل تازہ ہے۔ سال چھ مہینے سے زیادہ اس کی عمر نہیں، انڈوں کا میں ذمے دار نہیں ہوں البتہ تعجب مجھے بھی ہے کہ آپ کے گھر جا کر گندے کیسے نکل گئے۔ میرے ہاں تو دس بارہ روز سے رکھے تھے کوئی خرابی نظر نہیں آئی۔"

☆☆☆

اہرام بنانے کے لیے قطب مینار سیمنٹ استعمال کیجیے

سیماب اکبر آبادی کہاں کے رہنے والے تھے

صفاچٹ بلیڈ ذرا پہلے ایجاد ہو گئے ہوتے تو کارل مارکس کبھی داڑھی نہ رکھتے

نہ جانے وہ کون لوگ ہیں جو خبروں اور معلومات کے لیے اخباروں اور کتابوں سے رجوع کرتے ہیں۔ ہم نے تو جب کبھی اخبار پڑھا طب چین اور جاپانی انگوٹھیوں وغیرہ کے اشتہاروں کے لیے پڑھا۔ کتابوں سے زیادہ سے زیادہ راتوں کی نیند حرام کرنے میں مدد لی جا سکتی ہے حالانکہ یہ کام کھٹملوں کی مدد سے بہتر اور زیادہ آسانی سے ہو سکتا ہے اور جہاں کھٹمل نہ ہوں، وہاں مچھروں کا ہماری بلدیہ نے ہر بستی میں، معمولی ٹیکسوں کے عوض، معقول انتظام کر رکھا ہے۔ اب رہیں خبریں اور معلومات، یہ ہم فلموں اور ریڈیو کے کمرشل پروگراموں سے اخذ کرتے ہیں بلکہ بعض اوقات تو ان سے بین الاقوامی مسائل کے حل میں بھی مدد مل جاتی ہے۔

☆☆☆

ابھی کل ہی ہم امریکا میں نیگرو لوگوں کے مارچ کا ذکر ایک رسالے میں پڑھ رہے تھے جو وہ سفید فاموں کے خلاف احتجاج کے طور پر کر رہے ہیں۔ ہمارے ایک بزرگ نے کہا۔ یہ کیا کھڑاگ ہے۔ کیا ان لوگوں کو معلوم نہیں کہ پاکستان میں کسی نے کسی

درویشی نسخے کی مدد سے ایسی کریم ایجاد کی ہے کہ کسی نیگرو کے چہرے پر مل دی جائے تو یورپ اور امریکا کے سفید فام منہ تکتے رہ جائیں اور بے اختیار پکار اٹھیں۔ ''تم چودھویں کا چاند ہو یا آفتاب ہو۔'' کمرشل پروگرام ہی سے ہمیں پہلی بار معلوم ہوا کہ قطب مینار میں سیمنٹ کی کیا خصوصیات ہیں۔ مشتہر نے اعلان کیا ہے کہ اگر مصر کے اہرام اس سیمنٹ سے بنائے جاتے تو کہیں زیادہ پائیدار ہوتے۔ اس پر ہمیں اہرام کے معماروں کی جلد بازی پر افسوس ہوا۔ معمولی مسالا اور پتھر استعمال کرنے کی بجائے چار چھ ہزار سال انتظار نہ کر سکتے تھے؟ آخر انہیں معلوم نہ تھا کہ ایک روز پاکستان میں یہ سیمنٹ ایجاد ہونا ہے۔ خیر گزشت آنچہ گزشت۔ اب ہمیں اہرام بنانے ہوں گے تو ضرور یہی سیمنٹ استعمال کریں گے۔

ریڈیو کے اسی اشتہار سے معلوم ہوا کہ یہ سیمنٹ کوئی آج کی ایجاد نہیں بلکہ تیس سال سے استعمال ہو رہا ہے۔ اشتہار میں یہ دعوٰی بھی کیا گیا ہے کہ کراچی کے سبھی آثار قدیمہ اسی سیمنٹ سے بنے ہیں۔ ہم نے کمپنی ہذا کے منیجر سے پوچھا کہ فریر ہال کی تعمیر میں کتنا سیمنٹ لگا ہوگا۔ بولے وہ تو معمولی چونے پتھر کا ہے دیکھ لیجیے گا دو تین سو سال میں گر جائے گا۔ ہم نے پوچھا کہ پھر کراچی کے کن آثار قدیمہ کی طرف آپ کا اشارہ ہے۔ بولے۔ ''وہ جو پچھلے تیس سال میں بنے ہیں۔'' ادھر سے مطمئن ہو کر ہم نے مصر کے اہرام کی بات چھیڑی تو منیجر صاحب نے کہا آپ اور میں زندہ ہیں تو انشاءاللہ میں دکھا دوں گا کہ یہ اہرام دس بارہ ہزار سال اور کھینچیں گے اس کے بعد ان میں کہیں نہ کہیں دراڑیں پڑیں گی یا پتھر کھسکنے شروع ہوں گے۔ ہم اپنے سیمنٹ کے ساتھ گارنٹی دیتے ہیں کہ فلاں مدت کے اندر عمارت میں نقص ہو جائے تو اس کی مرمت کے لیے سیمنٹ دس فی صدی رعایت پر دیں گے۔ کیا آپ تاج محل، اہرام مصر لنڈن ٹاور وغیرہ کے متعلق اس قسم کی گارنٹی پیش کر سکتے ہیں؟

☆☆☆

ہم نے ایک بار ایک آرٹ اسکول میں داخلہ لیا تھا۔ کئی سال ضائع کیے لیکن تصوبر بنانی نہ آئی۔ اب آ گے اس کی وجہ معلوم ہوئی۔ بھلا گھوڑا مارکہ پنسل کے بغیر تصویر بن سکتی ہے۔ بے شک مائیکل اینجلو وغیرہ' نے قرون وسطےٰ میں تصویریں بنائیں لیکن و کیا تصویریں ہیں۔ نہ سر نہ پیر۔ ہمارے دس سالہ بھتیجے نے پہلے ہی روز اس پنسل کی مدد سے ایک ابسٹر یکٹ آرٹ کا شاہکار بنا ڈالا اور پہلا انعام حاصل کیا۔ انعام ملنے میں کچھ دخل اس بات کا بھی ہوسکتا ہے کہ وہ تصویر نمائش میں الٹی ٹنگی تھی۔ فریم بنانے والے کو الٹا سیدھا معلوم نہ ہوا تو جس طرف جی چاہا لٹکانے کی کنڈی لگا دی ادھر ہمارے پاس بھی اتنا وقت نہ تھا کہ اس کا رخ تبدیل کرتے لیکن نقادوں کی دور رس نگاہوں نے فوراً پہچان لیا کہ آرٹسٹ نے اپنی دانست میں جو ہاتھی بنایا ہے وہ اصل میں طوطا ہے۔ لیکن بنیادی کریڈٹ اس پنسل ہی کو جاتا ہے۔ کیا عجب کہ پکاسو جو تصویریں بناتے ہیں اس کے لیے زر کثیر خرچ کر کے خفیہ طور پر یہیں سے گھوڑا مارکہ پنسلیں منگاتے ہوں۔ کمرشل سروس ہی سے ہمیں معلوم ہوا کہ اگر صفاچٹ بلیڈ ذرا پہلے ایجاد ہو گئے ہوتے تو کارل مارکس اور سرسید احمد خان کبھی ڈاڑھی نہ رکھتے۔

☆☆☆

ہمیں نظر کرم کی بھیک ملے

سنا ہے ایک مولانا منبر پر کھڑے خیرات کے فضائل پر وعظ کر رہے تھے دیکھا کہ پچھلی صف میں ایک سیٹھ اتنا متاثر ہوا کہ مارے رقت کے زار و قطار رو رہا ہے۔ حضرت مولانا نے اس سے پوچھا اے نیک مرد۔ وہ کیا بات تھی کہ تیرے جی کو لگی۔ آنسو پونچھ کر بولا کہ مجھے اب تک معلوم نہ تھا کہ خیرات اتنی اچھی چیز ہے۔ اب میں کل سے خود بھی خیرات لینا شروع کر دوں گا۔

بخشیش ہر چند کہ خیرات کے زمرے میں نہیں آتی۔ خیرات ضرورت مندوں کے لیے ہوتی ہے اور اس کے دینے میں ثواب کی بھی امید ہے۔ بخشیش میں ثواب کا معاملہ ذرا مشتبہ ہے کیونکہ یہ ہم بعض اوقات ایسے لوگوں کو بھی دیتے ہیں جن کی آمدنی ہم سے کئی گنا زیادہ ہوتی ہے۔ تاہم بخشیش پر اخبار میں جو مضمون چھپا ہے اسے پڑھ کر بے اختیار جی چاہا کہ ہم بھی بخشیش لینا شروع کر دیں۔ اب تک ہم نے دنیا میں صرف ایک ملک دیکھا جہاں بخشیش کا کوئی سوال نہیں اور وہ ہے چین۔ لیکن چین جیسا کہ سب کو معلوم ہے ایک کمیونسٹ ملک ہے۔ ہم خدانخواستہ کمیونسٹ تھوڑا ہی ہیں۔ لہذا بہ ذریعہ تحریر ہذا اعلان کرتے ہیں کہ اگر کوئی ہمیں بخشیش دینا چاہے تو ہمیں کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ اس کے لیے ہمارا پتہ معرفت ایڈیٹر خواتین رہے گا۔ ہم نے ادارہ اخبار ہذا کو

بھی ترغیب دی تھی کہ اسی قسم کا اعلان کر دے لیکن یہ لوگ پرانے خیال کے ہیں۔
بہر حال مضمون نگار کا ایڈیٹر کی رائے سے متفق ہونا ضروری نہیں۔ قارئین کرام! دل کھول کر بخشیش دیجیے۔

☆☆☆

معلوم ہوتا ہے ہم میں اس قسم کا رجحان شروع ہی سے ہے۔ جس کا ثبوت ہمیں اپنا کلام دیکھنے سے ملا۔ جس طرح لوگ عشق مجازی کے مضامین باندھتے ہیں حالانکہ ان کا مقصود عشق حقیقی ہوتا ہے۔ اسی طرح ہم نے بھی اپنے ذوق گدائی کو حسن وعشق کے پیرائے میں چھپانے کی کوشش کی ہے یعنی ان کے لفظی معنی لینے کی ضرورت نہیں۔
دوسرا نکتہ یہ ہے کہ ہم نے بالعموم معاملے کے اس پہلو پر زور دیا ہے کہ ''جانام خدا دے جا' جا تیرا بھلا ہوگا۔'' یعنی ہمارے نفع نقصان کی اس میں کوئی بات نہیں' تجھی کو ثواب ملے گا۔ بعض لوگ شبہ کریں گے کہ اس بہانے ہم اپنا کلام اس پرچے میں چھاپنا چاہتے ہیں جو ویسے نظمیں غزلیں نہیں چھاپتا اور اب بڑی مشکل سے لوگوں کی پسند کا ایک ایک شعر چھاپنے لگا ہے۔ یہ بات نہیں ہے' ہم بلا تقریب بھی آپ کو اپنا کلام سنانا چاہیں تو آپ رواداری اور اخلاق کریمانہ سے کام لے کر منع تھوڑی کریں گے۔ بہر حال عرض کیا ہے۔

کب سے کھڑے ہیں بر میں خراج عشق لیے سر رہ گزار
روز حساب قریب ہے لوگو کچھ تو ثواب کا کام کرو

☆☆☆

دل والوں کی دور پہنچ ہے' ظاہر کی اوقات نہ دیکھ
ایک نظر بخشیش میں دے کر' لاکھ ثواب کماتی جا

☆☆☆

انشاء جی اسے روک کے پوچھیں۔ تم کو تو مفت ملا ہے حسن
کس لیے پھر بازار وفا میں تم نے یہ جنس گراں کی ہے؟

☆☆☆

نگری نگری گھوم رہے ہیں' سخیو اچھا موقع ہے!
روپ سروپ کی بھکشا دے دو' ہم اک پھیلا دامن ہیں!
وغیرہ

ہمیں احساس ہے ہمارے کلام میں ابھی اتنی صفائی نہیں آئی جتنی مثلاً اس مصرعے میں ہے۔ مجھے نظر کرم کی بھیک ملے۔ لیکن امید ہے ہم باقاعدگی سے ریڈیو پاکستان کا کمرشل اور فرمائشی پروگرام سنتے رہے تو ہماری درخواست میں بھی ایسی ہی وضاحت اور طنطنہ پیدا ہو جائے گا۔
بخشیش دینا اتنا اختیاری فعل نہیں جتنا عام طور پر سمجھا جاتا ہے۔ ہمیں یاد ہے فرینکفرٹ کے ہوائی اڈے پر ہمارا سامان دس گز دور اٹھا لے جانے والے پورٹر کو جس نے ہمارے نہ نہ کرتے ہوئے بھی ہمیں اپنا سوٹ کیس خود اٹھانے کی اجازت نہ دی تھی' ہم نے ایک مارک نذر کیا تو وہ راستہ روک کر کھڑا ہو گیا کہ واہ صاحب! اچھے آئے کہیں کے یہاں دو مارک سے کم ٹپ نہیں ہوتی۔ ایسا ہی ایک سانحہ لندن میں پیش آیا کہ ٹیکسی ڈرائیور نے کہا جناب آپ کے پاس پیسے کم ہیں تو بے شک کرایہ نہ دیجیے۔ لیکن میری بخشیش میں آپ کتر بیونت نہیں کر سکتے کہ یہ اصول کا سوال ہے' یورپ میں ہمیں بعض اوقات کھانا یا ناشتہ ترک کر دینا پڑتا تھا تاکہ ہوٹل چھوڑتے وقت بیروں کو ٹپ دینے کے لیے پیسے رہیں۔
کراچی میں ٹیکسی ڈرائیور اور رکشا ڈرائیور ٹپ لینے پر اتنا اصرار نہیں کرتے جس پر ہمیں شروع میں تعجب ہوا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ میٹر میں معمولی سی تبدیلی کر کے یہ

انتظام کرلیا جاتا ہے کہ اس میں کرایہ بھی جمع ہوتا رہے اور بیس پچیس فیصدی بخشش بھی۔ ہمیں یہ بات پسند آئی کیونکہ ٹپ کے نام سے الگ پیسے دیتے وقت دینے والے کو جو احساس زیاں اور لینے والے کو جو معمولی سا احساس ممنونیت ہوتا ہے۔ اس سے فریقین محفوظ رہتے ہیں۔

کراچی کے ریستورانوں میں بھی ٹپ کا رواج ہے۔ بل دیجیے تو ٹپ بھی دیجیے۔ اس لیے اس قباحت سے بچنے کے لیے ہمیں بعض اوقات بل دیے بغیر بغلی دروازے سے نکل جانے ہی میں عافیت نظر آئی۔ لیکن ہم اس کا مشورہ اپنے قارئین کو نہ دیں گے کیونکہ اکثر ہوٹلوں کے بیرے بہت تیز نظر' تیز دوڑنے والے اور جیم وشحیم ہوتے ہیں اور ہاتھ چھوڑتے وقت ہر قسم کے آداب واخلاق بالائے طاق رکھ کر یہ بھی نہیں دیکھتے کہ مار کھانے والا معاشرے میں کتنی اہم حیثیت رکھتا ہے اور لوگ اس کے ریختے گلیوں میں پڑتے پھرتے ہیں۔ اصل تجربہ ہمیں ٹپ دینے کا ڈھاکے میں ہوا جہاں ایک ہی اچھا ہوٹل ہے اور ہمیں وہاں ٹھہرے بنا چارہ نہیں۔ سو جب تک ٹھہرے بالعموم خیریت رہی۔ کبھی صبح کمرے کے دروازے پر کوئی بیرا ناول پڑھتا نظر آ گیا' کبھی کسی نے لفٹ میں سوار ہوتے وقت ماتھے کی طرف ہاتھ لے جا کر مکھی سی اڑا دی۔ ورنہ عام طور پر کسی چیز کے لیے کمرے میں سے گھنٹی بجائی جائے تو بیرے مسافر کے آرام میں مخل ہونے کے خوف سے کاریڈور کے دوسری طرف نکل جاتے ہیں۔ لیکن جونہی ان کو پتا چلا کہ اب اس مسافر کا چل چلاؤ ہے تو فوراً مستعد ہو جاتے ہیں اور آپ ہوٹل کے دفتر میں اپنا حساب صاف کرنے اور اپنی جیب صاف کرانے کے بعد اپنا سامان اٹھانے اور در و دیوار پر حسرت کی نظر کرنے کے لیے آخری بار کمرے میں آتے ہیں تو اپنے دروازے کے باہر وردی پوش اور مستعد بیروں کی ایک لمبی قطار پاتے ہیں جو نہایت خندہ پیشانی سے آپ کو سلیوٹ کرتے ہیں۔ سلام صاحب' ان میں سے ایک آدھ بیرے کی

صورت تو آپ پہچان لیتے ہیں اور کہتے ہیں۔ ''اچھا بھئی تم تو ہوئے۔ یہ کون لوگ ہیں۔'' اس پر وہ تعارف کراتا ہے کہ ''جناب یہ آپ کی غیر موجودگی میں آپ کے کمرے میں آ کر آپ کے جوتے پر رومال پھیرتا تھا۔ یہ دونوں جمعدار ہیں۔ ایک صبح آپ کے غسل خانے میں آتا تھا ایک شام کو یہ ہوٹل کا باورچی ہے اور یہ دونوں اس کے اسسٹنٹ' یہ شخص کاریڈور میں جھاڑو دیتا ہے۔ یہ دونوں پورٹر ہیں۔ اس نے ایک روز آپ کو اخبار لا کر دیا تھا۔ یہ صبح کی چائے والا ہے' یہ شام کی چائے والا ہے۔ اگر کسی پر آپ کو شبہ ہو تو وہ تصدیق کرتا ہے کہ نہیں صاحب یہ آتا تھا۔ آپ اس وقت شہر گئے ہوتے تھے۔''

بعد میں تو خیر ہم پیسے کا انتظام کر کے چلتے تھے لیکن پہلی بار ہمارے پاس ان صاحبوں کو دینے کے لیے پچیس روپے کی گنجائش نہ نکلی' آخر ایک بھلے مانس نے بیچ میں پڑ کر قسطیں کرا دیں اور ہم پانچ مہینے تک پانچ روپے ماہ بہ ماہ کراچی سے منی آرڈر کرتے رہے۔

☆☆☆

بیراگیری میں آمدنی کا سلسلہ تو ہے ہی۔ اس کے علاوہ دھلی دھلائی کلف لگی وردی اور پگڑی بھی ملتی ہے جسے دیکھ کر اکثر رشک سے سینے پر سانپ لوٹ جاتا ہے لیکن آسامیاں اتنی نہیں ہوتیں کہ سب کی کھپت ہو سکے۔ چار و ناچار لوگوں کو بزنس یا نوکری کرنی پڑتی ہے۔ کوئی اخبار نکال کر گزارا کرتا ہے' کوئی کالم لکھنے لگتا ہے۔ روٹی تو کما کھائے کسی طور پر مچھندر' سو ان پیشوں میں تنخواہ یا آمدنی تو ہو جاتی ہے' لیکن بخشش کا سلسلہ نہیں کہ اصل وجہ کشش ہے۔ کام کیے پر جو ملے وہ تو محنتانہ ہوا' کبھی اس پر بھی کسی کو خوشی ہوئی ہے یا ہو سکتی ہے۔

لاہور کافی ہاؤس میں تو سنا ہے بیرے سود پر روپیہ چلاتے ہیں اور ان کے موکل زیادہ

تر شاعر ادیب اور دانشور ہیں جو کافی ہاؤس کی سرپرستی کرتے ہیں۔ بعض ان میں بڑے دریا دل اور کریم النفس بھی ہوتے ہیں۔ ہمیں یاد ہے کہ ایک بار ہم نے کافی کا بل دیا لیکن خالی بل بیرے نے کہا جناب بخشیش۔ ہم نے کہا کہ آج تو جیب خالی ہے۔ بس اتنے ہی پیسے تھے۔ مودب ہو کر بولا آپ برا نہ مانیں تو آج میں آپ کو بخشیش دوں ہر چند کہ اس میں مضائقہ نہ تھا ہم نے اتنی بار اسے بخشیش دی تھی۔ ایک بار اس سے قبول کر لیتے تو کیا ہو جاتا۔ بس یونہی حجاب سا آ گیا۔ یوں بھی اس وقت تک بخشیش کے فضائل پر ہم نے کوئی مضمون نہ پڑھا تھا۔

☆☆☆

مصوری میں گھوڑا مارکہ پنسل کی اہمیت

انصاف سے دیکھا جائے تو فلمیں اس افادیت میں، ریڈیو کے کمرشل پروگرام اور اخباروں کے اشتہاروں سے کہیں آگے ہیں۔ چند دن قبل ہم فلم ''وومن بائی نائٹ'' دیکھنے گئے جس میں یورپ کے نائٹ کلب دکھائے گئے ہیں تو مولانا کرامت اللہ سے جو حج کے لیے بسیں چلاتے ہیں اور محلے کی مسجد میں امامت بھی کراتے ہیں مڈبھیڑ ہو گئی۔ بولے دیکھا مغرب بے شرمی کی کس منزل کو پہنچ گیا ہے؟ اسے دیکھ کر عبرت ہوتی ہے۔ اس کے بعد ہم نے مولانا کو اسی قبیل کی اور فلموں کا پتا دیا جن سے وہ اور زیادہ عبرت پکڑ سکتے تھے۔ ایک روز کہنے لگے میں نے سنا ہے کہ یہاں کے نائٹ کلبوں میں بھی ایسی ہی بے شرمی ہوتی ہے لیکن اپنی آنکھوں دیکھوں تو یقین کروں۔ آخر انہیں ایک نائٹ کلب کا فلور شو بھی دکھانا پڑا۔ بے چارے سارا وقت اگلی سیٹ پر بیٹھے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر عبرت پکڑتے اور استغفر اللہ کا ورد کرتے رہے۔

☆☆☆

خیر یہ تو غلط مبحث ہو گیا۔ ہمارا کہنا یہ تھا کہ ہماری فلموں سے طالب علموں کو بہت مدد مل سکتی ہے، خصوصاً تاریخ کے مضمون میں۔ ابھی کل ہم کسی تقریب سے ملکہ نور جہاں کا ذکر کر رہے تھے۔ ایک صاحبزادے بولے۔ یہ آپ ملکہ نور جہاں کا ذکر کر رہے ہیں یا

ملکہ ترنم نور جہاں کا۔ جس نے میرے ڈھول سپاہیا اور منڈیا سیالکوٹیا وغیرہ لازوال نغموں کو جنم دیا ہے۔ ہم نے کہانی الوقت تو ذکر ملکہ نور جہاں کا ہے' بولے میں سمجھ گیا۔ یہ وہی خاتون ہیں نا جنہوں نے فلم ''انصاف کا گھنٹہ'' میں مشہور ہیرو توپ کمار یعنی شہزادہ سلیم کے کبوتر اڑائے تھے اور بعد میں جہانگیر بادشاہ سے شادی کر لی تھی۔ ہم نے کہا۔ بالکل آپ ہی سوچیے کہ فلمیں نہ ہوتیں تو اس عزیز کو ایسی قطعی اور موثق معلومات کہاں سے حاصل ہوتیں۔

☆☆☆

ہمیں معلوم نہیں کراچی یونیورسٹی میں وسعت معلومات کے لیے کیا نسخہ استعمال کیا جاتا ہے۔ جب بھی کبھی انعامی معلومات کا مقابلہ ہوا کراچی یونیورسٹی کے طلبا نے شہر کے کالج کے طالب علموں کے مقابلے میں ممتاز حیثیت حاصل کی۔ ایک مقابلہ تو ہم نے بھی سنا جس میں اسے تیسرا درجہ حاصل ہوا جب کہ دوسرے کالج پہلے اور دوسرے نمبر پر رہے۔ آگے نہ بڑھ سکے۔ اس مقابلے کو سن کر ہمیں پہلے پہل ڈھاکے کی بندرگاہ کا پتا چلا۔ یہ بھی یونیورسٹی ہی کے ایک فرزند نے بتایا کہ ایٹم بم آبدوزوں کو ڈبونے کے کام آتا ہے اور اسی جامعہ کے ایک ہونہار طالب علم نے بتایا کہ سکندر اعظم نے ہندوستان پر سترہ حملے کیے تھے۔ اس مسئلے پر بعد میں تھوڑا اختلاف بھی ہوا۔ کیونکہ ایک طالبہ کو اصرار تھا کہ سترہ حملے سکندر اعظم نے نہیں بابر نے کیے تھے۔ ایک اور صاحب نے جہانگیر کا نام بھی لیا۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ کسی نہ کسی بادشاہ نے ہندوستان پر سترہ حملے ضرور کیے تھے۔ سولہ یا اٹھارہ نہیں۔ اس قطعی اور درست جواب کے بعد یہ مسئلہ محض ضمنی اور فروعی حیثیت اختیار کر لیتا ہے کہ وہ بادشاہ کون تھا۔ یہ اتنی پرانی بات ہے کہ اس بحث میں جانا محض گڑے مردے اکھاڑنا ہے۔

☆☆☆

یہ نہ سمجھا جائے کہ ان طالب علموں کا دائرہ معلومات محض تاریخ تک محدود ہے۔ جب پوچھنے والے نے پوچھا کہ یہ شعر کس کا ہے۔

چل بسا ہے داغؔ' میت اس کی زیب دوش ہے
آخری شاعر جہان آباد کا خاموش ہے

تو ایک طالب علم نے فی الفور جواب دیا کہ داغ کا۔ خیر آپ کہیں گے کہ اس کا بوجھنا کیا مشکل تھا' تخلص جو موجود ہے۔ اس طرح یہ بتانا بھی غالباً کوئی بڑا کمال قرار نہ پائے گا کہ۔

ع بڑھتا ہے یہاں ذوق گناہ ہر سزا کے بعد

استاد ذوق کا مصرع ہے۔ تخلص خود بول دیتا ہے لیکن حیرت یہ ہے کہ ان طالب علموں نے حسب ذیل سوالات کے جواب بھی بالکل صحیح صحیح دیے۔

''سیماب اکبرآبادی کہاں کے رہنے والے تھے۔''

''دیوان مومن کس کا مجموعہ کلام ہے۔''

البتہ اس مصرع پر ضرور کچھ تامل ہوا کہ کس کا ہے۔

ع غالب خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں

سو وہ بھی ایم اے اردو کے ایک طالب علم نے بتا ہی دیا کہ یہ خستہ ہاپوڑی کا ہے جس کا غیر مطبوعہ دیوان انڈیا آفس میں ہے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ بڑے بڑے پڑھے لکھے اس مصرع کو غالب کے نام سے منسوب کر دیتے ہیں۔ شاید غالب کے لفظ سے دھوکا کھا جاتے ہیں۔

☆☆☆

کچھ آداب مجلس کے بارے میں

ہمارے ہاں آداب مجلس سے بے اعتنائی اور بے نیازی کا رجحان خطرناک صورت اختیار کرتا جا رہا ہے۔ ابھی پچھلے ہفتے ہم نے زر کثیر خرچ کر کے کچھ ادب دوست احباب کی دعوت کی۔ اس کی تقریب ہم نے کچھ اور بتائی۔ اصل امر یہ تھا کہ ہم نے حال ہی میں کچھ تازہ غزلیں کہی ہیں جو ہماری ناقص رائے میں اردو ادب میں بیش بہا اضافے کا حکم رکھتی ہیں۔ آداب مجلس کی خلاف ورزی کا آغاز تو کھانے کے دوران ہی میں ہوگیا۔ کسی نے کہا یہ مچھلی ہے یا مگرمچھ؟ کوئی مرغ کے متعلق پوچھ رہا تھا کہ یہ شتر مرغ ہے کیا؟ محض اس لیے کہ پوری طرح نہ گلا تھا۔ بعضے کوفتوں کو کھا کر سی سی کرنے لگے کہ مار ڈالا۔ کتنی مرچیں جھونک رکھی ہیں۔

اس کے مقابلے میں دیکھیے کہ ابھی پچھلے دنوں ہم نے ایک جرمن دوست اور ان کی بیگم کی دعوت کی تھی اور اس میں بھی مرچوں اور مسالوں کا تناسب یہی تھا۔ ان کی آنکھیں ضرور سرخ ہوگئیں اور پانی بھی بار بار پیتے تھے لیکن ہم نے جب پوچھا کہ کیا مرچیں لگ رہی ہیں تو بولے ''جی نہیں۔ ایسی تو کوئی بات نہیں پاکستانی کھانے بہت عمدہ ہوتے ہیں''۔ یہ ہوتے ہیں آداب۔

ہمارے ان مہمانوں نے روٹیوں کے جلنے اور گھی کے بناسپتی ہونے کی بھی شکایت

کی اور کھیر کے تھوڑی ہونے کی بھی' حتیٰ کہ بعد میں فرمائش کی کہ کنجوسی مت کرو۔ آم منگاؤ اور ہمیں کھلاؤ۔ ہم ہنس ہنس کر طرح دیتے رہے جس پر ایک صاحب تو جز بز بھی ہوئے کہ کیا آپ ہماری باتوں کو مذاق جانتے ہیں جو یوں منہ کھول کر ہنسے جا رہے ہیں۔

خیر کھانا ختم ہوا۔ اب ہم منتظر تھے کہ کوئی صاحب کلام کی فرمائش کریں گے۔ فرمائش کرانے کے کئی طریقے ہیں' مثلاً کھانسنا' پہلو بدلنا' زیر لب گنگنانا یا حاضرین میں سے کسی سے کہنا کہ آپ آج کل کیا لکھ رہے ہیں۔ کوئی تازہ غزل وزل ہوئی؟ اس پر نکتہ سنج اور اشارہ فہم لوگ میزبان سے فوراً فرمائش کرتے ہیں کہ اچھا اب کچھ تازہ کلام عنایت ہو اور وہ کان پر ہاتھ رکھ کر رات بھر گاتا ہے۔ چونکہ آج کل اشارہ فہم لوگوں کی کمی ہوتی جا رہی ہے لہٰذا زیادہ تجربہ کار شاعر میزبان اپنے ساتھ ایک بچہ جمورا رکھتے ہیں جو ایسے موقع پر یاد دلاتا ہے کہ حاضرین مجلس آپ کی تازہ غزلیں سننے کے مشتاق ہیں اور اصرار کیے جاتا ہے کہ اور سنائیے۔ فلاں غزل بھی سنیں گے' فلاں بھی' مکرر ارشاد وغیرہ۔

ہم نے ایک دو لطیف اشارے تو کیے' لیکن حضرات برابر بجٹ' مہنگائی' وزارتی تبدیلیوں' مسئلہ کشمیر وغیرہ کی بحثوں میں جٹے رہے اور خواتین ایک دوسرے کے غراروں اور دوپٹوں کے بھاؤ پوچھتی رہیں یا بندوں اور چوڑیوں کو ہاتھ لگا لگا کر جانچتی رہیں کہ واقعی سونے کی ہیں یا کہنے والی جھوٹ کہہ رہی ہیں۔ آخر ہمارے صبر کا پیمانہ بھی لبریز ہوا اور ہم نے دتین جماہیاں لے کر کہا کہ صاحبو نان کہ خوردی خانہ برد۔ اب جاؤ' رات کے بارہ بجے ہیں ہمیں سونا بھی ہے اور صبح صبح یہ کرسیاں اور برتن جو خاص اس دعوت کے لیے مستعار لیے گئے تھے' دھودھا کے ہمسایوں کو واپس بھی کرنے ہیں۔

☆☆☆

دوسپاسنامے جناب گاؤ کی آمد اور
حضرت خر کی رفت کی تقریب میں

خطبے، سپاس نامے، سہرے وغیرہ بھی اب آداب مجلس ہی کی ذیل میں آتے ہیں۔ ان کے کہنے سننے کے لگے بندھے طریقے ہیں۔ پچھلے دنوں کچھ چھوٹے بڑے افسروں اور عہدیداروں کی تبدیلیاں ہوئیں اور سپاسناموں کی مانگ ایسی بڑھی کہ ڈاک خانے اور کچہری کے سامنے بیٹھنے والے منشیوں اور رنگین چھپائی کرنے والے پریسوں کا کاروبار چمک اٹھا۔ خیال خاطر احباب سے کچھ سپاسنامے ہمیں بھی تصنیف کرنے پڑے اور اس دوران ہمیں خیال آیا کہ ان کی عبارت مقرر کر کے رفاہ عام کے لیے شائع کر دی جائے تو بہتوں کا بھلا ہوسکتا ہے۔ ضرورت مند حضرات فقط اس میں ناموں وغیرہ کی تبدیلی کر کے استعمال میں لاسکتے ہیں۔ ان عبارتوں میں فقط الفاظ ہمارے ہیں نفس مضمون ہم نے ان جلسوں کی تقریروں سے اخذ کیا ہے جو پچھلے دنوں اس سلسلے میں ہوئے۔ یاد رہے کہ آج کل بہ نظر کفایت' آنے والے اور جانے والے دونوں کو ایک ہی جلسے میں بلا لیا جاتا ہے۔ رس گلے اور پکوڑے کھانے سے پہلے یا بعد (کہ پروگرام کا سب سے دلچسپ اور ہردلعزیز حصہ یہی ہوتا ہے) میزبانوں کا نمائندہ

اولاً جانے والے افسر یا عہدے دار کی طرف روئے سخن کرتا ہے۔

حضرت خراس محکمے سے دوسال تک وابستہ رہے ہیں۔ ان کا دور ہر طرح سے سنہری دور تھا۔ اس ملک میں ان کا نعم البدل ملنا مشکل ہے۔ ان کے جانے کے بعد ہم لوگ خود کو یتیم محسوس کریں گے کیونکہ یہ سوچنا کہ اس قحط الرجال میں ایسا یا اس کے پاسنگ بھی لائق اور مہربان افسر پھر کبھی نصیب ہوسکتا ہے۔ خیال است و محال است و جنوں۔ لہذا ہمیں ان کے رخصت ہونے کا دلی افسوس ہے۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

تالیاں بجتی ہیں اور لوگ بچے کھچے پکوڑے اور رس گلے چٹ کر کے بیروں سے ایک ایک کوکا کولا کی مزید فرمائش کرتے ہیں ادھر میزبان اپنا روئے تخاطب آنے والے کی طرف کرتا ہے۔

"اسی کے ساتھ ہم جناب گاؤ کے آنے کا دلی خیر مقدم کرتے ہیں۔ ان کی قابلیت اور شرافت اظہر من الشمس ہے۔ ان کی تعریف کرنا سورج کو چراغ دکھانا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ وہ ہمارے محکمے کے حق میں مسیحا ثابت ہوں گے اور اسٹاف کو ماضی میں بعض کھلی ہوئی بے انصافیوں، بے قاعدگیوں اور صوبائی تعصب کی بنا پر جو شکایات پیدا ہوتی رہی ہیں۔ ان کا ازالہ فرمائیں گے۔ فی الحقیقت محکمہ کے لوگ ایک مدت سے دست بہ دعا تھے کہ ان کو بھی ایسا مہربان اور منصف المزاج حاکم نصیب ہو۔"

اب آداب کا تقاضا یہ ہے کہ رخصت ہونے والا افسر شکریے کے کچھ کلمات کہے۔ حضرت خر فرماتے ہیں۔

"مجھے آپ صاحبوں سے جدا ہونے کا دلی افسوس ہے لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں آپ کو کبھی فراموش نہ کرسکوں گا۔ میری کوٹھی جو آپ کے محکمے سے وابستگی

کی مختصر سی مدت میں تعمیر ہوئی اور یہ کار بھی جسے خریدنے کا میں اسی دوران قابل ہوا۔
ہمیشہ آپ لوگوں کی یاد دلاتی رہے گی۔ حق تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ایک بار پھر مجھے آپ
لوگوں کے ساتھ کام کرنے کا موقع عطا فرمائے۔''

اب جناب گاؤ پر بھی واجب ہے کہ وہ اس موقع پر کچھ کہیں۔

''میں خود کو آپ لوگوں کے درمیان پا کر بہت خوش ہوں۔ میں اس سے پہلے بہت
جگہ کام کر چکا ہوں۔ بعض محکمے ایسے بھی ہوتے ہیں جن میں اوپر سے نیچے تک سب
کے منہ کو پیسہ لگا ہوتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ محکمہ ایسا نہیں اور چونکہ آں را کہ حساب
پاک است از محاسبہ چہ باک۔ آپ لوگ میرے اس فیصلے کا یقیناً خیر مقدم کریں گے
کہ میں سب سے پہلے اس بات کی تحقیق کراؤں گا۔ آیا اس محکمے کے چھوٹے بڑے
افسر رشوتیں لے لے کر جائدادیں تو نہیں بناتے رہے۔ تحقیقات بالکل بے لاگ
ہوں گی اور مجرموں کو کیفر کردار کو پہنچایا جائے گا۔

ان الفاظ کے ساتھ ہی میں باری تعالیٰ سے دعا کروں گا کہ مجھے اپنے دوست اور
پیشرو حضرت خر کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔''

اس پر سب لوگ تہ دل سے آمین کہتے ہیں۔ آخری دعائیہ فقرے پر ان لوگوں کی
جان میں جان آتی ہے جو پہلا حصہ سن کر کچھ بے چینی محسوس کرنے لگے تھے۔ اب
آنے والا بھی اور جانے والے بھی جی کڑا کر کے چہرے پر مسکراہٹ لاتے ہیں اور
ہاتھ ملاتے ہیں۔ بیرے ایک ایک کوکا کولا لا کر سامنے رکھ دیتے ہیں۔

☆☆☆

بحث کچے اور پکے گانوں کی

ایک مراسلہ نگار نے اخبار میں شکایت کی ہے کہ ہم بیرون ملک تو موسیقاروں
اور رقاصاؤں کے جتھے بھیجتے ہیں لیکن اسکولوں میں ان پر پابندی ہے۔ خط میں دلیلیں تو
بہت مضبوط ہیں لیکن یہ پتا نہ چل سکا کہ مکتوب نگار کا منشا کیا ہے۔ آیا اسکولوں میں
رقص و موسیقی کو جائز قرار دیا جائے یا بیرون ملک وفد بھیجنے بند کر دیے جائیں۔ اپنی
وضاحت کر دینی ضروری ہے کیونکہ بعض اوقات ابہام کا نتیجہ وہی ہوتا ہے جو
مرزا غالب کے ساتھ ہوا تھا۔ انہوں نے ایک روز چاؤ میں آ کر محبوبہ سے فرمایا کہ بزم
ناز چاہیے غیر سے تہی۔ اُس ستم ظریف نے ان کو اٹھا دیا کہ اچھا یہ بات ہے۔ تو جاؤ۔
ہوا کھاؤ۔

افسوس کہ رقص و موسیقی کے بارے میں ہماری معلومات بہت محدود ہیں۔ ناچ تو ہم
نہ تگنی کا ناچ سکتے ہیں نہ کوئی اور گانوں کے متعلق البتہ اتنا معلوم ہے کہ دو طرح کے
ہوتے ہیں۔ ایک کچے دوسرے پکے۔ کچے گائے جاتے ہیں اور پکے گانوں غرارہ کیا جاتا
ہے۔ ہمیں یاد ہے کہ بچپن میں ایک بزرگ ہمارے مہمان ہوئے تھے۔ ان کا کمرہ
ہمارے کمرے کے ساتھ ملا ہوا تھا۔ صبح دم عجیب عجیب آوازیں سن کر ہماری آنکھ کھل
گئی۔ چونکہ مویشیوں کا باڑہ بھی اوپر ہی تو تھا لہذا پہلے خیال ہوا کہ بیل ڈکرا رہا ہے لیکن

بیچ کا دروازہ ذرا سا کھول کے دیکھا تو معلوم ہوا کہ نہیں۔ ہمارے مہمان عزیز ہیں۔ ایک کان ہاتھ پر ہے دوسرا اوپر اٹھا ہوا ہے۔ اس سے پہلے ہم نے ایک جگہ مرگی کا ایک مریض دیکھا تھا۔ اس لیے بھاگے بھاگے پڑوس میں حکیم صاحب کو بلا لائے کہ ان کا کچھ کیجیے۔ انہوں نے آ کر دیکھا تو الٹا ہمیں ڈانٹا کہ بے وقوف یہ تو تاجدار موسیقی استاد تان توڑ خان ہیں۔ یہ بنکار نہیں رہے بلکہ ریاض کر رہے ہیں۔ بھاگیشری کا خیال گا رہے ہیں۔

☆☆☆

استاد کے متعلق کہا جاتا تھا کہ پارس ہیں۔ پتھر کو سونا بنا دیتے ہیں لیکن ہماری بدقسمتی کہ ان سے فیض نہ حاصل کر سکے۔ ورنہ سینکڑوں شاگرد ان کے اس وقت ملک کی فلم کمپنیوں کی خدمت کر رہے ہیں۔ ایسی ایسی دھنیں ایجاد کرتے ہیں کہ لوگ سر دھنتے ہیں جو آزاد منش ہیں یعنی نوکری پسند نہیں کرتے وہ سارنگی یا اکتارا لے گلے میں جھولی ڈال گلیوں میں نکل جاتے ہیں۔ کوئی نہ کوئی اللہ کا بندہ تانبے کا پیسہ یا مٹھی بھر آٹا دے دیتا ہے اور چین سے گزر ہو جاتی ہے۔ استاد کا ایک لڑکا اس وقت میوزک ڈائریکٹر ہے۔ ابھی پچھلے دنوں اخبار میں آپ نے پڑھا ہو گا کہ فلم ”گھسیارے کی بیٹی“ میں ناظرین۔ گیت سن کر ایسے وجد میں آئے۔ ایسے آپے سے باہر ہوئے کہ کرسیاں اسٹیج پر کھینچ ماریں۔ اس فلم میں اسی عزیز کا میوزک ہے۔ دوسرے نے ایک بینڈ پارٹی بنا رکھی ہے اور بیاہ شادیوں میں بلایا جاتا ہے۔ ہفتہ میں پانچ چھ دن پانچوں گھی میں رہتی ہیں۔

ایک لڑکا ان کا البتہ نالائق نکلا۔ نالائق تو نہ کہیے کیونکہ سگریٹ پیتا تھا تو کان سے دھواں نکالتا تھا اور پتنگ کی ڈور کو مانجھا لگانے میں اس کا ثانی نہیں تھا۔ ہاں آواز اس کی بے ہنگم اور پھٹی ہوئی سی تھی۔ نہ وہ فلم کمپنی کے کام کا تھا نہ بیاہ شادیوں کی محفلوں کے۔

آخر باپ نے سوچ سوچ کے اسے پکے گانے کی راہ پر لگا دیا۔ اب وہ ریڈیو پاکستان کا ایک نامی گویا ہے اور دنیائے موسیقی میں بڑے بانس علی خان کے نام سے مشہور ہے اگر کسی گھر میں بچے چپ نہ ہوتے ہوں تو ماں کہتی ہے۔ ”کھولوں ریڈیو، سنواؤں استاد بانس علی خان کو“ وہ فوراً سہم کر چپ ہو جاتا ہے۔ ریڈیو کے سامعین کے اصرار پر آج کل ان کا پروگرام دن میں نہیں بلکہ نیم شب کے قریب ہوتا ہے۔ جن کو اعلا درجے کی موسیقی کا ذوق ہے وہ ریڈیو اپنے ساتھ غسل خانے میں لے جاتے ہیں اور جی بھر کر لطف اندوز ہوتے ہیں۔

☆☆☆

پچھلے دنوں ریڈیو پاکستان کے ہفتہ خواتین میں بھی کچے پکے گانوں کا اہتمام ہوا لیکن ریڈیو والوں نے افراط تفریط سے کام لیا۔ کچے گانے بہت ہی کچے رہ گئے تھے اور پکے زیادہ ہی پک گئے تھے بلکہ جل گئے تھے۔ پھر بھی کچے گانوں کی حد تک خیریت رہی البتہ پکے گانوں پر ریڈیو نے تھرتھرانا اور بم چخ کرنا شروع کیا جو بچے چپ تھے رونے لگے اور جو رو رہے تھے یکا یک چپ ہو گئے۔ ایک بزرگ دوڑے آئے کہ کیا ہو رہا ہے۔ ہم نے کہا کچھ نہیں ہو رہا، بس بھاگیشری کا خیال ہو رہا ہے۔ بولے یہ بی بھاگیشری کون ہیں اور اظہار خیال کا یہ کون سا طریقہ ہے۔ ابھی ہم جواب سوچ ہی رہے تھے کہ ایک اور بزرگ پرانے خیال کے آ گئے اور دو تین منٹ تک کھڑے بغور سنتے رہے۔ اس کے بعد یہ فرما کر چل دیے کہ آج سمجھ میں آیا اسلام نے موسیقی کو کیوں حرام قرار دیا ہے۔

کسر نفسی کی بات اور ہے۔ یہ خیال کرنا درست نہ ہو گا کہ ہمیں موسیقی سے یکسر لگاؤ نہیں ہے۔ سازوں میں ہمارا محبوب ساز ریڈیو ہے اور گانوں میں ہم قوالی اور کمرشل پروگرام کے عاشق ہیں۔ پہلے قوالی سے ہمیں رغبت نہ تھی۔ لیکن مزار حضرت گھوڑے

شاہ کے سجادہ نشین میاں حمید اختر نے ہمیں پچھلے دنوں اپنے (یعنی اپنے پیر کے) عرس سراپا قدس پر بلایا اور فیض احمد فیض کی قوالیاں سنوائیں تو ہمیں حال آ گیا۔ اب کمرشل پروگرام کے گانے ہمیں اس لیے پسند ہیں کہ سہل ممتنع ہوتے ہیں۔ سیدھے گولی کی طرح دل پر آ کر لگتے ہیں۔ ہمارے جن ہم عصروں نے یہ لازوال نغمے تخلیق کیے ہیں وہ یوں بھی مزے میں ہیں۔ مرزا غالب ہی سے مقابلہ کر لیجیے کہ اپنی طرف سے نوائے سروش لکھتے تھے، لیکن لوگ ان کو مشکل گر دانتے تھے اور اپنے زمانے کا عبدالعزیز خالد کہتے تھے۔ معاش کا یہ حال کہ قرض خواہ جینے نہ دیتے تھے۔ اس زمانے میں کلب بھی نہ ہوتے تھے کہ آدمی سر عام جوا کھیل سکے۔ چوری چھپے کوشش کی تو جیل میں پہنچا دیے گئے۔ کمرشل پروگرام کے شاعروں سے نہ کوئی مشکل گوئی کی شکایت کرتا ہے نہ انہیں جیل ہوتی ہے (یہ الگ بحث ہے کہ وہ اس کے مستحق ہیں یا نہیں) آج مرزا غالب زندہ ہوتے تو ملکہ وکٹوریا یا صاحب ڈپٹی کمشنر کے قصیدے لکھنے اور پھر بھی انعام سے محروم رہنے کے بجائے ڈبل روٹی، بناسپتی گھی، ٹوتھ پیسٹ یا معجون قبض کشا بنانے والے کسی کارخانے دار کے در دولت سے وابستہ ہو جاتے اور چین کرتے۔

☆☆☆

بات گانے سے شاعری تک پہنچ گئی، اس لیے کہ دونوں کے درمیان جو میکموہن لائن ہے وہ متنازعہ ہے۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ ہم شاعر نغز گو و خوش گفتار تو ہیں لیکن مشاعروں میں نہیں جاتے۔ پس منظر اس کا یہ ہے کہ ایک نشست میں جہاں معززین شہر جمع تھے۔ ہمارے بعض احباب نے کلام پڑھا اور ترنم سے پڑھا۔ ہم سے کہا گیا تو ہم نے قدرے تکلف سے کام لیا۔ اس پر ایک سیٹھ صاحب نے ہمارا دل بڑھانے کو کہا کہ "آپ نہیں گاتے؟ ارے صاحب گایئے نا" خیر ہماری بات الگ ہے سبھی ایسے پھسپھو نہیں ہوتے۔ ہمارے دوست جمیل الدین عالی شاعر بے بدل جس طرح آنکھ

بند کر کے لکھتے ہیں اسی طرح آنکھیں بند کر کے ترنم سے پڑھتے بھی اچھا ہیں۔ وہ ایک محفل کی بات سناتے ہیں کہ میں نے اپنی اچھی سی اچھی غزلیں دوہے اور گیت پڑھے اور آوازیں بھی پنچم مدھم ہر سر میں نکالیں، لیکن شرکائے محفل کہ کاروباری دنیا کی جان تھے اور زیادہ تر جوڑیا بازار کے آڑھتی بے چینی سے پہلو بدلا کیے۔ آخر ایک نے اپنے جی کی کہی کہ عالی صاحب اب کوئی فلمی گیت بھی ہو جائے۔ عالی صاحب کہتے ہیں کہ دل کی کیفیت تو کیا عرض کروں لیکن خیال خاطر احباب سے جب پیار کیا تو ڈرنا کیا۔ مورا لال دوپٹہ ململ کا۔ اور تانگے والا خیر منگدا' وغیرہ گائے اور سب خوش خوش اٹھے۔ اب میں کسی محفل میں جاتا ہوں تو پہلے پوچھ لیتا ہوں کہ کسی آڑھتی یا سیٹھ کو تو نہیں بلایا۔ بلایا ہے تو فلمی گیتوں کی کاپی ساتھ لے لوں۔

☆☆☆

شعر لکھوا لیجیے یا پنکچر لگوا لیجیے

لاہور لاہور ہے۔ اس کے قائل ہم اب کے لاہور جا کر ہوئے۔ ادب اور کلچر اس کی گھٹی میں پڑے ہیں۔ ہم ایبٹ روڈ سے داہنے ہاتھ منٹگمری روڈ کو مڑے ہی تھے کہ غالب آٹوز کا بورڈ نظر آیا۔ معلوم ہوا وہاں موٹریں اور کاریں مرمت کرنے والے بھی دیوان غالب سے فال لیتے ہیں۔ تھوڑی دور آگے میر ہیئر کٹنگ سیلون تھا۔ ہم نے ٹھٹک کر سنا تو معلوم ہوا کہ استاد ایک گاہک کی شہ رگ پر استرا رکھے اسے میر تقی میر کے ابیات سنا رہے ہیں اور باقی لوگ آہیں بھر رہے ہیں اور آگے گئے تو مصحفی انجینئرنگ ورکس نظر آیا جہاں ٹیوب ویل کے پرزے بنتے ہیں اور بارعایت نرخوں پر سپلائی کیے جاتے ہیں۔ ناسخ فرنیچر اسٹور اور آتش لانڈری اور حالی سویٹ مارٹ بھی نظر آئے حتیٰ کہ گڈیوں کی ایک دکان دیکھی جس پر شائقین کا ہجوم تھا۔ معلوم ہوا کہ یہ شبلی نعمانی پتنگ اسٹور ہے اور مالک اس کے ادیب فاضل پاس ہیں۔ ادبی ذوق کی یہ ریل پیل کچھ اب کے نظر آئی ورنہ اس سے پہلے تو یہی ہوتا تھا کہ مزنگ میں ایک صاحب نے دکان کھولی اور اس کا نام رکھا 'حاجی دی ہٹی' چند دن بعد اس کے سامنے دوسری دکان کھل گئی۔ وہاں بھی چارپائی کا بان بکتا تھا۔ نام تھا "حاجی دے ابے دی ہٹی۔"

ایک اور بات جو مشاہدے میں آئی، یہ تھی کہ دکان ایک ہوتی ہے لیکن اس پر کاروبار کئی کئی ہوتے ہیں۔ مثلاً انارکلی میں ایک دکان ہے جس کا عنوان ہے۔ "مرزا عینکوں والے اور دانتوں والے" پہلے ہم کو تعجب ہوا کہ یہ کیا پہچان کرانے کا طریقہ ہے۔ عینک تو ہم بھی لگاتے ہیں اور دانت خدا کے فضل سے ہمارے بھی سلامت ہیں۔ اس میں مرزا صاحب کی تخصیص کیا ہے۔ پتا چلا کہ نہیں، نہ مرزا صاحب عینک لگاتے ہیں نہ ان کے منہ میں دانت ہیں۔ یہ تو ان کا کاروبار ہے۔ جس کا جی چاہے ان سے عینک لگوا لے۔ جس کا جی چاہے دانت اکھڑوا لے یا بنوا لے۔ آگے ایک اسٹور نظر آیا جہاں ہر قسم کے عطریات اور گھوڑوں کے لیے چارہ ملتا ہے۔ اکبری منڈی میں گڑ شکر کے ایک تاجر سے ملاقات ہوئی جو فالتو وقت میں اصلاحی فلمیں بناتے ہیں۔ میکلوڈ روڈ پر ایک شخص کو دیکھا کہ سائیکلوں کے پنکچر لگاتا ہے۔ لیکن اس کے بورڈ پر جہاں ہر دلعزیز سائیکل ورکس لکھا ہے، وہیں ایک کونے میں شاعری کالج بھی مرقوم ہے۔ ہم جو ازراہ تجسس ان کے قریب رکے تو بولا۔ فرمایئے کیا خدمت کروں۔ سائیکل کو پنکچر لگوانا ہے یا مشاعرے کے لیے غزل لکھوانی ہے۔ پنکچر کا ریٹ چار آنے ہے اور غزل تین آنے فی شعر۔ ہم نے دریافت کیا کہ پنکچر کا ایک آنا زیادہ کیوں ہے۔ شعر کے برابر کیوں نہیں، فرمایا۔ پنکچر میں تو ولایتی سلوشن استعمال ہوتا ہے جو خاصا مہنگا ہوتا ہے۔ شعر لکھنے میں کون سا مسالا لگتا ہے۔

☆☆☆

ماہنامہ فنون کا دفتر اب تو خیر انارکلی ہی میں اور جگہ چلا گیا ہے۔ پہلے گرجا کے سامنے ایک چوبارے میں تھا۔ اسی میں حکیم حبیب اشعر صاحب مطب بھی کیا کرتے تھے۔ سامنے کے برآمدے میں احمد ندیم قاسمی صاحب تشریف رکھتے اور اہل ذوق کا مجمع چائے کے خم لنڈھاتا۔ دوسرے میں حکیم صاحب قارورے دیکھتے اور دوائیں دیتے۔

راستہ بہرصورت ندیم صاحب ہی کے کمرے میں سے جاتا تھا۔لوگ پہلے آ کر انہی کے پاس بیٹھتے۔ وقفے وقفے سے ندیم صاحب اعلان کر دیتے کہ جو حضرات کھانسی زکام وغیرہ کے سلسلے میں آئے ہیں' دوسرے کمرے میں تشریف لے جائیں۔ان کے پاس فقط ادب کے مریض رہ جاتے۔ایک روز کی بات ہے کہ بہت سے لوگ تو یہ اعلان سن کر اندر چلے گئے۔ایک صاحب اجنبی صورت بیٹھے رہ گئے۔قاسمی صاحب نے فرمایا۔آپ شاید کوئی غزل یا نظم لے کر آئے ہیں۔اس پرچے میں تو گنجائش نہیں اگلے پرچے کے لیے غور کریں گے۔اگر آپ کاتب ہیں تو نمونہ چھوڑ جایئے اور اگر ایجنٹ ہیں تو بتایئے آپ کے شہر میں کتنے فنون کی کھپت ہو سکتی ہے اور اگر آپ مالک مکان کی طرف سے کرایہ وصول کرنے آئے ہیں تو ایک مہینے کی مہلت اور دیجیے قاسمی صاحب نے اپنی دانست میں اس شخص کی منطقی ناکہ بندی کر دی تھی۔لیکن وہ مرد شریف سنی ان سنی کر کے ان کے کان کے پاس منہ لا کر بولا۔حکیم صاحب دو روز سے دست آ رہے ہیں۔ان کے بند کرنے کی کوئی ترکیب کیجیے۔

ادھر حکیم حبیب اشعر صاحب کو شکایت ہے کہ ندیم صاحب اپنے مریضوں کو میرے پاس بھیج دیتے ہیں۔فرماتے ہیں کہ ایک روز ایک بزرگ تشریف لائے۔میں نے ان کی نبض پر ہاتھ رکھا اور کہا زبان دکھایئے۔اس نے کہا جناب میری زبان پر آپ حرف نہیں رکھ سکتے' میرے گھرانے کی زبان سے ایک دنیا سند لیتی ہے۔یہ غزل میں لایا ہوں آپ خود ہی اندازہ کر لیں گے۔''

حکیم صاحب نے کہا۔غزل کی بات تو مجھے معلوم نہیں لیکن آپ کو قبض معلوم ہوتی ہے۔یہ نسخہ لے جایئے۔نہار منہ طباشیر کے ساتھ استعمال کیجیے۔انشاءاللہ صحت ہو گی۔

حکیم صاحب کا کہنا ہے کہ شفا تو اللہ کے ہاتھ میں ہے لیکن اس مریض کو واقعی صحت ہو گئی۔اس کے بعد اس نے کوئی غزل نہیں لکھی۔

☆☆☆

بھائی دروازے کے سامنے سے گزریے تو ایک جگہ پہلوان لسی اسٹور و بک سیلرز' کا بورڈ نظر آئے گا۔ہم نے پہلوان صاحب سے ملاقات کی۔انہوں نے لسی کا ایک قد آدم گلاس پیش کرتے ہوئے بیان کیا کہ لسی بنانا ان کا خاندانی پیشہ ہے اور کتابیں اس لیے بیچتے ہیں کہ خود بھی تصنیف و تالیف کے شوقین ہیں۔انہوں نے ہمیں ایک پمفلٹ بھی دیا۔''فوائد لسی'' اس کا نام ہے اور دیدہ زیب چھپا ہے۔معلوم ہوا وہ لسی گزٹ کے نام سے ایک ماہوار رسالہ بھی جاری کرنا چاہتے ہیں اور ڈیکلریشن کے لیے درخواست دے رکھی ہے۔ہم نے ''فوائد لسی'' کا سرسری مطالعہ کرتے ہوئے کہا کہ آپ نے بعض اہم نکات چھوڑ دیے ہیں۔ہمہ تن توجہ ہو کر بولے۔فرمایئے۔ہم نے کہا'' حکما کا قول ہے کہ لسی پینے والے کے گھر میں کبھی چوری نہیں ہو سکتی۔لسی پینے والے کو کتا نہیں کاٹتا اور لسی پینے والا کبھی بڈھا نہیں ہوتا ہے'' ہمہ تن اشتیاق ہو کر بولے۔''اس اجمال کی تفصیل ارشاد کیجیے''۔ہم نے جان کی امان پا کر عرض کیا کہ لسی پینے والوں کو مسلسل کھانستے دیکھا ہے سو جس گھر میں ایک بھی آدمی رات بھر کھانستا ہے وہ چور کے کام کا نہیں۔پھر یہ کہ بادی کی وجہ سے چند دن میں اس کا بدن جڑ جاتا ہے اور ہاتھوں میں رعشہ آ جاتا ہے۔لاچار اسے چلنے کے لیے ہاتھ میں چھڑی یا لاٹھی لینی پڑتی ہے۔آپ جانتے ہیں کتا لاٹھی سے ڈرتا ہے۔اب استاد نے پوچھا کہ بڈھا کیوں نہیں ہوتا۔ہم نے کہا لسی پینے والا اس عمر کو پہنچ ہی نہیں سکتا جہاں سے بڑھاپا شروع ہو جاتا ہے۔اس سے بہت پہلے خالق حقیقی سے جا ملتا ہے۔

☆☆☆

اسکولوں میں داخلہ نہیں ملتا تو

بچوں کو بزنس مین بنا دیجیے

چند ترکیبیں تعلیم سے محفوظ رکھنے کی

اسکولوں میں داخلوں کی مشکلوں کے متعلق اخباروں میں پچھلے دنوں بہت کچھ آتا رہا ہے۔ ہمارے بعض کرم فرماؤں نے ہم سے اصرار کیا کہ تعلیم اتنا بڑا مسئلہ ہے' اس پر آپ بھی کچھ لکھیے۔ ہم نے بہت عذر کیا کہ ہم خود چنداں تعلیم یافتہ نہیں ہمیں معاف رکھا جائے۔ لیکن اس کا جواب یہ ملا کہ اسی لیے تو آپ سے کہہ رہے ہیں۔ کسی مسئلے پر بے لاگ اور موثق رائے وہی دے سکتا ہے جس کا اس سے تعلق نہ ہو۔ بعضوں نے مثالیں بھی دیں کہ دیکھو فلاں سیٹھ نے جو کچھ لکھا پڑھا نہیں' فلاں مشاعرے کی صدارت کس خوبی سے کی۔ فلاں شخص جو ساری عمر عربی کا مدرس رہا ہے' اس نے حکومت کی ایکسپورٹ امپورٹ پالیسی کی حمایت میں کتنا اچھا مراسلہ اخبار میں لکھا ہے۔

یہ دلیلیں اپنی جگہ صحیح ہیں اور ہمیں اس مسئلے پر لکھنے کا واقعی حق پہنچتا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ کس پہلو سے لکھیں۔ یہ مسئلہ لوگوں کا اپنا پیدا کردہ ہے۔ حکومت یا کوئی اور تو انہیں

مجبور نہیں کرتا کہ اپنے بچوں کو اسکول بھیجو۔ اور اپنے لیے اور معاشرے کے لیے مسائل پیدا کرو۔ بچہ اسکول جائے گا تو اس کے لیے کپڑے' وردی' فیس' چندے سب چیزوں کی ضرورت پڑے گی۔ نہیں جائے گا تو نہیں پڑے گی۔ ایک سیٹھ سے ہماری یاد اللہ ہے۔ انہوں نے اپنے بچوں کو گنتی سکھا کر کاروبار میں لگا دیا اور وہ کامیاب بزنس مین ثابت ہو رہے ہیں۔ ان سے ہم نے پوچھا تو انہوں نے کہا ہمیں تو اسکولوں میں داخلے کی مشکلات کے متعلق کوئی شکایت نہیں۔ لوگ تو خواہ مخواہ شور مچا رہے ہیں۔ کیوں نہیں اپنے بچوں کو بزنس میں لگاتے۔ ان کے لیے آئل ملیں اور کھالیں رنگنے کے کارخانے کھولتے۔

ایک اور بزرگ ان کے ہم رائے تھے۔ انہوں نے کہا۔ ہمارے زمانے میں تعلیم عام نہ تھی تو لوگ سچ بولتے تھے اور پورا تولتے تھے۔ انہوں نے اکبر الہٰ آبادی کے اشعار کے حوالے بھی دیے کہ وہ کتابوں کو قابل ضبطی سمجھتے تھے اور ان کا خیال تھا کہ اگر فرعون بچوں کو تیغ تلوار کے گھاٹ اتارنے کی بجائے کالج کے گھاٹ اتارتا تو اس کا منشا پورا ہو جاتا اور قتل کی تہمت بھی نہ آتی۔ لیکن مشکل تو یہی ہے کہ لوگ عقل کی بات نہیں سنتے اور عُلموں بس' نہیں کرتے سو خود کردہ را علاج نیست چرا کارے۔ حکومت کو تو تب الزام دیا جائے اگر اس نے تعلیم کا لازمی قرار دیا ہو۔

☆☆☆

پچھلے دنوں کئی امتحانات کے نتیجے شائع ہوئے۔ ہم نے جس زمانے میں پڑھا ہے پاس ہونا اور نئی کلاس چڑھنا معیوب نہ سمجھا جاتا تھا۔ بلکہ اکثر لوگ تو اس پر مبارک بادیں دیتے اور وصول کرتے تھے اور بعض انتہا پسند مٹھائی وغیرہ بھی بانٹتے تھے جو والدین زیادہ بردبار اور سنجیدہ طبع تھے' وہ بھی کم از کم اس بات پر صف ماتم نہ بچھاتے تھے۔

ہمارے ایک دوست کے بیٹے نے اب کے سیکنڈری بورڈ کا ایک امتحان دیا تھا اور اس کا رول نمبر اتفاق سے ہمارے پاس تھا۔ اب کے اتوار کو نتیجہ نکلا تو ہم نے دیکھا کہ صاحبزادے پاس ہو گئے ہیں۔ ہم ابھی پرانی روایات کے عادی حالات حاضرہ سے بے خبر مٹھائی کا ایک ڈبا لئے مبارک باد دینے پہنچ گئے۔ وہاں کچھ اور ہی حال دیکھا۔ چاندنی بچھی تھی۔ اگر بتیاں سلگ رہی تھیں اور کچھ لوگ منہ لٹکائے ماتمی صورت بنائے بیٹھے تھے۔ ہم نے کہا خیر باشد؟ کہیں عزیز فیل تو نہیں ہو گیا۔ اخبار میں تو اس کا رول نمبر پاس ہونے والوں میں ہے۔ ہمارے دوست بولے یہی تو رونا ہے۔ نالائق پاس ہو گیا ہے اور یہ تقریب اس کے داخلے کے مسئلے کی تقریب میں ہے۔ اب کے ہم نے اس کو فلمیں بھی خاصی دکھائی تھیں۔ ٹیڈی لباس بنوا کر ایک اسکوٹر بھی لے دیا تھا۔ گھر میں ریڈیو تو تھا ہی۔ کمرشل پروگرام اور فرمائشی پروگرام بھی باقاعدگی سے سنواتے تھے۔ فلمی پرچوں کا بھی ہمارا گھر باقاعدہ خریدار ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ چھپ چھپا کر اسکول کی کتابیں پڑھتا رہا ہے۔ ہم سے کہتا تھا کہ دریا پر مچھلی پکڑنے جا رہا ہوں۔ یار دوستوں کے ہاں تاش کھیلوں گا یا فلاں جگہ زندہ ناچ گانا اور تمبولا ہے لیکن اصل میں لائبریری یا اسکول چلا جاتا تھا۔ گھر میں بھی یہ چالاکی کرتا تھا کہ باہر جاسوسی ناول کی جلد ہوتی تھی۔ ہمیں کیا خبر تھی کہ اندر گرائمر یا تاریخ کی کتاب ہے۔ امتحان ہوا تو اس وقت بھی اس نے ہمیں دھوکے میں رکھا کہ پرچے خراب ہوئے ہیں۔ آپ فکر نہ کیجیے ضرور اچھے نمبروں میں فیل ہوں گا۔ لیکن اب اس کے کرتوت سامنے آ گئے ہیں۔ نہ صرف پاس ہوا ہے بلکہ سیکنڈ ڈویژن بھی لی ہے۔ بورڈ سے نمبر نکلوانے کے لیے عرضی تو دی ہے کہ ممکن ہے غلطی سے پاس ہو گیا ہو، نمبر جوڑنے میں چوک ہو گئی ہو۔ لیکن امید کوئی نہیں ہے، ہماری تو قسمت پھوٹ گئی۔

☆☆☆

ثابت ہوا کہ یہ ایک بڑا سماجی مسئلہ ہے۔ کیونکہ سب لوگ تو ایسے خوش قسمت نہیں کہ ان کے بچے فیل ہو جائیں اور داخلے کے مسائل سے بے نیاز وہ نتیجہ آتے ہی گھی کے چراغ جلائیں یا مٹھائی بانٹیں۔ والدین اس سلسلے میں حکام تعلیم کو بڑی حد تک قصور وار گردانتے ہیں اور کہتے ہیں کہ امتحان کے پرچے طالب علموں کی صلاحیت کو دیکھتے ہوئے نہیں بنائے جاتے بلکہ فاضل ممتحن اپنی صلاحیت کے مطابق بناتے ہیں لہٰذا وہ نہایت آسان ہوتے ہیں۔ ان کو کوئی بچہ بھی حل کر سکتا ہے۔ پھر وہ ہوتے بھی نصاب کی کتابوں میں سے ہیں، باہر سے نہیں، رہی سہی کسر پرچہ دیکھنے والے پوری کر دیتے ہیں۔ ان میں اکثریت ایسے بے درد اور شقی القلب لوگوں کی ہے کہ کسی کو فیل ہی نہیں کرتے ایسا لگتا ہے جیسے ان کی اپنی اولاد ہی نہ ہو۔

ہم نہیں کہتے کہ سبھی ممتحن ایسے منتقم المزاج ہوتے ہیں۔ ان میں اچھے لوگ بھی ضرور ہوں گے جس کا ثبوت یہ ہے کہ بہت سے لڑکے فیل بھی ہوتے ہیں لیکن یہ شکایت بے بنیاد بھی نہیں۔ ایک ممتحن کو ہم خود جانتے ہیں کہ بیوی سے اس کا سخت جھگڑا ہوا تھا۔ قرض دار بھی پریشان کر رہے تھے اور اسکول میں اس کی ترقی بھی رکی ہوئی تھی اس کا بخار انہوں نے غریب طالب علموں پر نکالا۔ جس کا پرچہ سامنے آیا اسے ستر اسی فیصدی نمبر دیے گئے۔ حالانکہ بعض طالب علموں نے بڑی محنت سے سوالات کے جواب غلط لکھے تھے اور بعض نے تو پرچے کورے چھوڑ رکھے تھے۔ کسی سوال کو ہاتھ ہی نہ لگایا تھا۔

☆☆☆

اس کا حل ہماری سمجھ میں یہی آتا ہے کہ اسکول اور کالج بند کر دیے جائیں اور بورڈ اور یونیورسٹیاں توڑ دی جائیں۔ چور چوری سے جائے ہیرا پھیری سے نہ جائے۔ اکا دکا لوگ پھر بھی گھروں یا مسجدوں میں پڑھنے سے باز نہیں آئیں گے لیکن داخلے میں مشکلات کی شکایتیں کم از کم نہ رہیں گی۔

اس سلسلے میں ایک بات ہمیں اپنے تعلیمی اداروں سے بھی کہنی ہے۔ پچھلے دنوں بعض اسکولوں نے اپنے پھاٹک بند کر کے باہر سنتری بھی تعینات کر دیے تھے کہ طالب علم یا ان کے والدین اندر نہ گھس آئیں۔ بعض جگہ تو سنا ہے۔ ہلکا سا لاٹھی چارج بھی ہوا۔ بے شک ہم مانتے ہیں کہ اسکولوں میں طالب علموں کا کیا کام۔ اگر طالب علموں نے داخلہ لینے کی کوشش کی تو یہ ان کی زیادتی ہے لیکن سبھی لوگ تو اتنے سمجھ دار نہیں ہوتے کہ اپنا برا بھلا سمجھ سکیں۔ ان کو محبت اور ملائمت سے سمجھانا چاہیے کہ تعلیم کے کیا نقصانات ہیں اور تعلیم کا پھیلاؤ معاشرے کے لیے کیوں خطرہ ہے۔ حکومت کو بھی چاہیے کہ جس طرح اس نے جا بجا فیملی پلاننگ سنٹر کھول رکھے ہیں اس طرح کے مرکز کھولے جن میں مانع تعلیم ترکیبیں بتائی جائیں۔

☆☆☆

جنگ نہیں ریہرسل تھی

روداد ایک حربی اور ضربی مشاعرے کی

بھارت کی افواج قاہرہ ادھر سے مار کھانے کے بعد دانت تیز کر رہی تھیں کہ مشرقی پاکستان کا رخ کیا جائے۔ لیکن کرنا خدا کا ایسا ہوا کہ چین نے الٹی میٹم دیا کہ ''تم نے جو چھپن ناجائز چوکیاں ہماری سرحد کے اندر بنا رکھی ہیں اٹھاؤ ان کو ورنہ'' بھارت کی فوراً چیں بول گئی۔

پہلے تو بھارت نے کہا۔ ''ہماری کوئی چوکیاں وہاں نہیں''۔ چین والے کھنکارے تو کہا۔ ''اگر ہیں تو بہت چھوٹی چھوٹی ہیں۔'' چین نے پھر آنکھیں دکھائیں تو بولے ''اگر چھوٹی نہیں بھی تو ان میں سپاہی تھوڑا ہی ہیں۔'' جب یہ ثابت ہوگیا کہ سپاہی ہیں تو کہا ''بالفرض ہیں بھی تو کیا ہوا۔ چین ہم سے پہلے کہتا ہم پہلے چوکیاں خالی کر دیتے۔ اتنی اے بے تبے کی کیا ضرورت تھی۔ آخر ہم بھی عزت دار ہیں۔''

سنا ہے بہت سے بھارتیوں کو تو پتا بھی نہ چل پایا کہ یہ کیا قصہ ہے۔ وہ چوکیوں کو وہ چوکیاں سمجھے جو غسل خانے یا باورچی خانے میں استعمال ہوتی ہیں۔ اسی لیے تو انہوں نے شور مچایا۔ اے ہے کیا غضب ہوگیا۔ چوکیاں ہی تو ہیں یہاں بچھالیں یا وہاں بچھا

لیں۔مشکل یہ ہے کہ چین والے جو پینتیس چالیس سال سے لڑ رہے ہیں چوکی کے اور کوئی معنی سوائے فوجی چوکی کے جانتے ہی نہیں۔ہم نے اپنے ایک چینی دوست سے ایک روز کہا کہ ہم نے اپنے گھر کے لیے ایک چوکی بنوائی ہے پوری ساگوان کی لکڑی ہے۔اس نے کہا اچھا' کتنا گولا بارود رکھا ہے اس میں؟

جب چین کے الٹی میٹم کے بعد بھارت میں قبض کشا دوائیں بکنی بند ہوئیں تو ایک روز بھارتی لیڈروں نے مسکوٹ کی کہا یہ تو عجیب ملین بلکہ مہمل شے ہے' اس سے ہماری بڑی ہیٹی ہوئی۔خیر چین نے ہمارے ساتھ یہ داؤ کیا ہے تو ہم پاکستان کے ساتھ کریں۔چنانچہ انہوں نے پاکستان کو ایک الٹی میٹم بھجوا دیا۔

الٹی میٹم بھجوانے کے بعد بھارتی لیڈروں نے انتظار کرنا شروع کیا کہ اب پاکستانی زعما دوپٹہ گلے میں ڈالے آتے ہیں کہ ہمارا قصور معاف کیا جائے۔آئندہ غلطی نہ ہوگی۔لیکن جب کچھ بھی نہ ہوا تو ناچار ایک احتجاج بھجوایا۔''کہ ہم نے تمہیں الٹی میٹم بھیجا تھا تم ڈرے کیوں نہیں؟''

لڑائی میں جو ہوا سب کو معلوم ہے۔آخر ایک روز نندہ جی کو اعلان کرنا پڑا کہ سجنو۔یہ جنگ تو فقط ریہرسل تھی جو جنگ اب شروع ہوگی' وہ فیصلہ کن ہوگی۔یہ ایک طرح سے اعتراف تھا کہ پچھلی بار ہم سے لڑنے میں کسر رہ گئی۔

اس پر لوگوں کو ایک لطیفہ یاد آیا کہ ایک ہوائی مشق میں ایک ہوا باز جہاز سے محض ایک جانگیہ پہن کر کودنے کو تھا اس کے افسر نے کہا تمہارا پیراشوٹ کہاں ہے؟ اس نے کہا وہ میں نہیں لایا۔وہ تو سچ مچ کی لڑائی میں استعمال ہوتا ہے یہ تو محض ریہرسل ہے۔

لیکن جاتی پر نندا جی کی تقریر کا اثر الٹا ہوا۔لوگوں نے کہا نابابا۔جب ریہرسل میں اتنی مار پڑی ہے تو اصلی مجلد اور باتصویر لڑائی میں تو نہ جانے کیا ہوگا؟

☆☆☆

بدل کر مریضوں کا ہم بھیس غالب

اس ہفتے پھر ہمارے دشمنوں کی طبیعت خراب رہی، جو لوگ اردو محاورے کی نزاکتوں سے واقف نہیں وہ جان لیں کہ یہ ہم اپنی طبیعت کی بات کر رہے ہیں۔یہ ایک پیرایہ گفتگو ہے اور اس کا موقع استعمال خاص ہے۔ہم نے ایک بار زیادہ نستعلیق بننے کی کوشش میں ایک صاحب کو جا کر بایں الفاظ مبارک دی تھی کہ سنا ہے، آپ کے دشمنوں کی ترقی ہوگئی ہے۔مٹھائی کھلوایئے، وہ بجائے خوش ہونے کے ہم پر خفا ہوگئے۔

☆☆☆

ہم بالعموم بیمار پڑنے سے احتراز کرتے ہیں۔کچھ تو عدیم الفرصتی کے باعث' کچھ اخراجات کے ڈر سے۔لیکن کبھی کبھی خلقِ خدا کا خیال آ ہی جاتا ہے یعنی یہ لحاظ کہ ہم بیمار نہ ہوئے تو اتنے یونانی' عبرانی' ایلوپیتھی' ہومیوپیتھی اور فٹ پاتھی معالجین کیا کریں گے،کہاں سے کھائیں گے۔ایک صاحب کا قول اسی مضمون کا ہے کہ میں بیمار ہوتا ہوں تو ڈاکٹر سے نسخہ لکھواتا ہوں اور اس کو اس کی فیس دیتا ہوں کیونکہ اس کا گزارا اسی پر ہے۔اسے بھی جینا ہے پھر کیمسٹ کے ہاں جاتا ہوں اور مکسچر اور پڑے بندھواتا ہوں اور اس کا حق اسے ادا کرتا ہوں کیوں کہ اسے بھی جینا ہے۔پھر باہر آ کر نسخہ اور دوائیں

بدرو میں پھینک دیتا ہوں۔ کیونکہ مجھے بھی جینا ہے، زندگی مجھے بھی عزیز ہے۔

دیکھا جائے تو دنیا میں پیشہ کوئی بھی بے کار نہیں حتیٰ کہ ڈاکٹر اور گورکن کا بھی نہیں ، کیونکہ بیماری اور موت سبھی کے ساتھ لگی ہے۔ اس حقیقت کے اعتراف کے طور پر ہمارے محلے کے ایک ڈاکٹر صاحب نے اپنے مطب کے دو حصے کر دیے ہیں۔ ایک میں وہ خود بیٹھتے ہیں، دوسرے میں ان کا لڑکا لٹھا اور کافور بیچتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے ہاتھ میں اللہ نے ڈگری نہیں دی نہ سہی۔ وہ بھی انہوں نے بہ ذریعہ ڈاک کہیں سے حاصل کر ہی لی ہے۔ لیکن برکت ضرور دی ہے کیونکہ مجمع ہم نے مطب کے دونوں حصوں میں کثیر دیکھا۔ بعض لوگ یہ بات بھول جاتے ہیں کہ شفا فقط اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ ڈاکٹر تو بس فیس مشورہ اور دوا انجکشن کے پیسے لینے کا گنہگار ہے۔ وہ خدائی معاملوں میں کیوں دخل دینے لگے۔ لاہور کے ایک مشہور حکیم کا تعارف کسی نے ہم سے ان لفظوں میں کرایا تھا کہ ان کا نام تم نے سنا ہوگا۔ بہت نامی گرامی شخصیت ہیں۔ علامہ اقبال انہی کے ہاتھوں مرے تھے۔ یہاں بھی ایک ڈاکٹر ایک روز ایک محفل میں ازراہِ تعلّی کچھ ایسا ہی فرما رہے تھے کہ فلاں فلاں وزیر، امیر اور سیٹھ میرے زیر علاج رہے ہیں۔ ہمیں بھی یہ اشتیاق ہوا کہ علاج کرا کر ان بڑوں کی صف میں داخل ہو جائیں لیکن غور کرنے پر معلوم ہوا کہ ان مشہور مریضوں میں سے اب کوئی بھی بہ قید حیات نہیں ہے تو محض اتفاق کی بات لیکن ہم ڈر گئے کہ خود بھی کہیں اتفاقات کی لپیٹ میں نہ آ جائیں۔

☆☆☆

آج کل لوگ اپنی بکری بڑھانے کے لیے طرح طرح کے جتن کرتے ہیں۔ مثلاً ایک دکاندار نے اعلان کیا ہے کہ آپ دو جوڑے جوتوں کے ہمارے ہاں سے خریدیں تو آپ کو ایک جوتا ہم اپنی طرف سے دیں گے۔ یہ دکاندار دلّی کا ہے لہٰذا محاورہ یہاں

بھی استعمال کر گیا ہے۔ آپ اگر ایمپریس مارکیٹ کی پشت کے بازار سے گزریں تو ایک جگہ یہ لکھا پائیں گے کہ دو بڑے کفن خریدنے والے کو ایک چھوٹا کفن بچے کا مفت ملے گا۔ ہمیں معلوم نہیں اس نادر موقع سے فائدہ اٹھانے والے کتنے ہیں۔ لیکن سنا ہے دو بڑی قبریں کھدوانے پر گورکن حضرات بھی ایک چھوٹی قبر مفت میں کھود دیتے ہیں۔ افسوس کہ ڈاکٹروں نے جن کے پیشے کا تعلق ان امور سے اتنا قریب کا ہے، کبھی یہ رعایت نہ دی کہ دو بڑوں کا علاج پیسے لے کر کریں تو چھوٹے بچے کا علاج مفت کر دیں۔ غالباً ڈاکٹروں کی اسی بے مروتی اور کج خلقی کے باعث ہی لوگ ان کے پاس جانے کی بجائے رعایت دینے والے مذکورہ بالا دکانداروں کے پاس سیدھے چلے جانا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ وقت بھی بچتا ہے پیسے بھی۔

☆☆☆

لوگ پوچھتے ہیں کہ ہمیں کون سا طریقہ علاج زیادہ پسند ہے۔ ذاتی طور پر ہمیں کسی طریقہ علاج کے خلاف تعصب نہیں بشرطیکہ دوا ہمیں مفت ملے۔ چونکہ ہماری طبیعت صلح کل ہے۔ لہٰذا بیماری کا اثر ہوتے ہی ہم سب سے پہلے اپنے دوست حکیم طبابت حسین کو جا کر نبض دکھاتے ہیں اور خمیرہ گاؤزبان چاٹ کر ان کے حقّے کے دو کش لیتے ہیں۔ آگے ڈاکٹر سرور کی دکان پڑتی ہے۔ وہ دیکھتے ہی ہمیں تھرمامیٹر لگا کر یہ معلوم کرتے ہیں کہ ہم سے پرانا بل مانگا گیا تو ہمارا درجہ حرارت کیا ہوگا۔ پھر اسٹیتھسکوپ لگانے کے بہانے ہماری جیب ٹٹولتے ہیں اور اگر وہ خالی ہو جیسی کہ اتفاق سے ہمیشہ ہوتی ہے تو کہہ دیتے ہیں کہ بھلے چنگے ہو تمہیں کوئی بیماری نہیں۔ چلتے بنو۔ اگلی گلی میں ہمارے کرم فرما ڈاکٹر ایم ایم خاں کا ''ہنومان کلینک'' ہے۔ نام ان کا میاں محمود خاں ہے، لیکن ایسے بھی لوگ ہیں جو ایم ایم خان کو ملک الموت خاں کا مخفف گردانتے ہیں۔ ڈاکٹر ان کے ہاں بڑے حرفوں میں لکھا رہتا ہے اور ہومیو چھوٹے لفظوں میں۔ پہلے

ہمارا خیال تھا کہ 'ہومیو' کا لفظ ہوم سے نکلا ہے یعنی جو شخص گھر بیٹھے بیٹھے ڈاکٹر بن جائے۔ وہ ہومیو لکھنے کا مستحق ہے لیکن پھر معلوم ہوا کہ یہ طب کی ایک باقاعدہ اور اہم شاخ ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے بورڈ لکھنے والے سے کہا تھا کہ ''ہینی مان کلینک' لکھ کے لاؤ' کیونکہ ہینی مان صاحب ہومیو پیتھی کے بانی تھے۔ وہ شخص کم پڑھا لکھا تھا اور پاکستان بننے سے پہلے رام لیلا اور دسہرے کے لیے تصویریں بنایا کرتا تھا۔ وہ ''ہنومان کلینک'' لکھ لایا۔ خرابی اس نام میں اور تو کوئی نہیں، ہاں بعض مریض ڈاکٹر صاحب کی شکل سے دھوکا کھا کر یہ خیال کرنے لگتے ہیں کہ شاید ان کا سلسلہ نسب ہنومان تک جاتا ہے ہمارے خیال میں یہ غلط ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

☆☆☆

ہوائی سفر بھی کوئی سفر ہے؟

نہ نام پتا پوچھا جا سکے نہ ولدیت نہ بچوں کی تعداد نہ ان کی عمریں

آج یہ ستم دیکھا جائے تو یہ سفر بھی کوئی سفر ہے کہ ابھی لبوں پر رخصت کرنے والوں کے لیے خدا حافظ' پھر ملیں گے اگر خدا لایا' وغیرہ ہوتے ہیں۔ اور ان کے رومال آنکھوں سے پوری طرح اوجھل نہیں ہوتے کہ پیشوائی کرنے والوں کے رومال اور صورتیں نظر آنے لگتی ہیں۔ جب تک یہ تیز رفتار جیٹ جہاز نہ چلے تھے کہ ناشتا کھائیں کراچی میں تو لندن میں ٹفن کو سچ کر دکھائیں۔ تب تک کم از کم ہم کراچی سے لاہور آتے جاتے میں ایک دو صفحے کسی رسالے کے پڑھ لیتے تھے۔ ایک آدھ پیالی چائے کی، کسی مُسکراتی ہوئی ایئر ہوسٹس کے نازک ہاتھوں سے ہمارا شرفِ قبول پاتی تھی۔ کبھی کبھی ہم ساتھ بیٹھے مسافر کا نام بھی پوچھ لیتے تھے۔ اب تو یہ عالم ہے کہ ہم سیٹ پر بیٹھ کر حفاظتی بند باندھ ہی رہے ہوتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے منزل آ گئی ہے۔ کرم نما وفرو دخا کہ خانہ کانہ ءتُست۔ جو ایئر ہوسٹس ذرا تیز بولتی ہیں وہ تو جلدی جلدی دونوں طرح کے اعلان کر لیتی ہیں۔ ایک یہ کہ ہم آپ کو خیر مقدم کہتے ہیں اور اس کے بعد دوسرا یہ کہ منزل آ گئی اتریے۔ لیکن پچھلی بار لاہور سے آتے میں ایک ایئر ہوسٹس صاحبہ کہ ذرا آہستہ چلتی اور آہستہ بولتی تھیں قلتِ وقت کے باعث ایک ہی اعلان کر

پائیں۔ ''خواتین وحضرات۔ ہم پی آئی اے کی پرواز نمبر فلاں پر آپ کو خوش آمدید کہتے ہیں۔ اپنے حفاظتی بند باندھ۔ میرا مطلب ہے کھول لیجیے۔ کیونکہ لاہور آ گیا ہے۔ امید ہے آپ کا سفر خوشگوار ہوگا۔ السلام علیکم۔''

سفر کا اصل مزہ ریل ہی میں ہے۔ جہاز کے سفر میں ہمارے ساتھ چالیس پچاس مسافر ہوتے ہیں۔ لیکن کبھی کسی شخص کے متعلق کماحقہ معلومات حاصل نہ ہوئیں۔ اس کا موقع ہی نہ ملا۔ کون کیا کرتا ہے۔ اس کی ولدیت قومیّت اور سکونت کیا ہے۔ بچوں کی تعداد کیا ہے۔ عمریں کیا ہیں۔ کتنے ماشاءاللہ شادی شدہ ہیں۔ وہ کیا کرتے ہیں۔ لڑکیوں کی کیا کیفیت ہے۔ آپ کے شہر میں آٹے دال کا کیا بھاؤ ہے۔ تمبا کو اور اصلی گھی کی دستیابی کی کیا صورت حال ہے۔ وغیرہ بس جہاز سے اترے اور اپنے اپنے سوٹ کیس اُٹھا گھروں کو روانہ ہوگئے۔ یہی تو وجہ ہے کہ آج کل انسانوں میں باہم محبت اور انس نہیں ہے اور یہ تہذیب کا لازمہ سمجھا جاتا ہے کہ کسی سے کچھ کلام نہ کرو۔ منہ باندھے گردن اکڑائے بیٹھے رہو۔ یہ خیال نہیں کہ آپ کے پاس جو بھلا مانس بیٹھا ہے اس کے بھی کچھ پرابلم ہوں گے۔

کیا عجب اس شخص کو اسی کی ضرورت ہو۔ آپ غزل کہتے ہیں ممکن ہے یہ شخص صاحب ذوق ہو۔ سوز و گداز والے کلام کا قدردان ہو۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اُس کی جیب میں آپ کے پسندیدہ سگریٹ ہوں۔ اس سارے خلا ملا کے لیے جو وقت درکار ہے وہ سوائے ریل کے کہیں بھی نہیں مل سکتا۔ ہم نے یہاں تک دیکھا کہ دو اجنبی ایک ساتھ ریل میں بیٹھے اور اگلے اسٹیشن پر اترتے اترتے ایک دوسرے کے سمدھی بن چکے تھے۔

سفر کے ساتھ لوازم سفر بھی ہوتے ہیں۔ لیکن ہوائی جہاز کا سفر اگر سفر ہو تو اس کے لوازم بھی ہوں۔ بستر کی ضرورت نہیں' لوٹے کی حاجت نہیں۔ حقہ ہوائی جہاز کے اندر

بیٹھ کر پینے کا رواج نہیں۔ ریل کے سفر میں رخصت کرنے والے بالعموم کہا کرتے ہیں کہ جاتے ہی خط لکھنا۔ تاکید ہے۔ بھول نہ جانا۔ اور رستے میں سامان پر نظر رکھنا۔ اب جانے والا کہتا ہے کہ گھنٹے بھر میں لاہور پہنچ جاؤں گا۔ وہاں سے فون کردوں گا۔ اب تو ڈائرکٹ لائن ہے۔ سامان کے نام سے ایک سوٹ کیس ہے۔ سو نیچے جہاز کی ڈگی میں ہے۔ ایک بریف کیس ہاتھ میں ہے۔ اس قسم کا کسی چھوٹے قصبے میں نکل جائیں تو لوگ آپ سے بال کٹوانے کا اشتیاق ظاہر کریں۔ ناشتے دان تک ساتھ نہیں رہتا'

☆☆☆

ہم نے جب سے ریل کا سفر ترک کیا ہے۔ انڈوں پراٹھوں کو ترس گئے ہیں۔ یہ ہمارے ریل کے سفر کا لازمہ تھا۔ صبح کے ناشتے کے لیے ہمارے گھر والے انہیں ثقیل سمجھتے ہیں۔ سب سے بڑی تکلیف یہ ہے کہ ہوائی جہاز میں پیک تھوکنے کی جگہ نہیں۔ جب تک سفر میں رہو۔ پان کو ترسو، منہ باندھے بیٹھے رہو۔ یہی لیل و نہار رہے تو کوئی دن مشرقیت ہمارے درمیان سے بالکل ہی اُٹھ جائے گی۔

☆☆☆

ہم منگولیا نہیں گئے تھے

پڑھو گے لکھو گے تو ہو گے خراب جب ہفتے کا ساتواں دن ختم ہوتا ہے

ہم نے پچھلے ہفتے اپنے کراچی سے باہر جانے کا ذکر کیا تھا۔ ہم لاہور گئے تھے' منگولیا وغیرہ نہیں گئے تھے۔ اپنے جانے کی اطلاع گو ہم نے ایک مصلحت کی وجہ سے عام کرنا پسند نہ کی تھی۔ بلکہ جانے کے روز اے پی پی دوسری نیوز ایجنسیوں اور اخباروں کو فرداً فرداً فون کر کے کہہ دیا تھا کہ ہم کتاب میلے کے افتتاح کے لیے لاہور جا رہے ہیں۔ اس کی خبر نہ چھاپیے گا۔ اور اگر چھاپے بنا نہ رہ سکیں تو معمولی طور پر صفحہ اول پر چوکھٹے میں دے دیجیے گا۔ دو کالمی سہ کالمی سرخی لگانے کی ضرورت نہیں کیونکہ ہم ذاتی پبلسٹی کو ناپسند کرتے ہیں۔ ریڈیو والوں کو بھی ہدایت کر دی کہ اپنے بلیٹن کی خاص خاص خبروں میں ہمارا نام نہ لائیے گا۔ ہاں دوسری خبروں کی حد تک ہم اتنی سختی سے آپ کو منع نہیں کرتے کہ آپ کو برا معلوم ہو۔

ان لوگوں کو منع کرنے کی احتیاط ہم نے اس لیے کی کہ اخبار والے ہمیشہ رہتے اسی کھوج میں ہیں کہ کون کہاں جا رہا ہے۔ کیوں جا رہا ہے؟ آپ خود ہر روز اخبار میں دیکھتے ہوں گے کہ آج صدر ایوب کراچی پہنچیں گے۔ یا گورنر محمد موسیٰ کا پرسوں

سرگودھا سے واپسی کا پروگرام ہے۔ کوئی پوچھے کہ آپ کو کسی کے آنے جانے سے کیا مطلب؟ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جہاں یہ حضرات جاتے ہیں لوگ جلوس اور جھنڈیاں لے کر پہنچ جاتے ہیں۔ اور بعض اوقات ٹریفک رک جاتا ہے۔ خیر اور کسی کی ذمے داری ہم نہیں لیتے۔ ہم یہ کسی صورت نہیں چاہتے کہ ہماری وجہ سے ایسی خرابی پیدا ہو۔ ٹریفک رکنا تو ایک طرف۔ ہمیں یاد نہیں پڑتا کہ ہماری وجہ سے کبھی دفعہ ۱۴۴ کی خلاف ورزی بھی ہوئی ہو۔ ہمیں لینے اور چھوڑنے والوں کی تعداد ہمیں اور سامان اٹھانے والے قلی کو شامل کر کے کبھی پانچ سے متجاوز نہیں ہو پائی۔

یہاں اس بات کا اعتراف کرنا ضروری ہے کہ اخبار والوں نے اب کے ہم سے ہماری توقع بلکہ ہدایات سے زیادہ تعاون کیا۔ ہم ہفتے بھر تک تمام اخبارات بڑے غور سے پڑھتے رہے ہیں۔ کہیں ان میں ہماری آمد و رفت کی طرف اشارہ نہیں ملا حالانکہ ہمارے جاپان جانے کے موقع پر انہی اخباروں نے ہم سے بری طرح عدم تعاون کیا تھا۔ ہم نے اپنے جانے کی اطلاع فوٹو کے ساتھ کہ ہمارے پاس بہت سے بے کار پڑے تھے' ہر نیوز ایجنسی اور اخبار کو بھیج دی تھی۔ اپنے پروپیگنڈے کے لیے نہیں جس کا بحمد اللہ ہمیں کبھی شوق نہیں رہا بلکہ عوام الناس کی اطلاع کے لیے لیکن نہ کسی نے خبر چھاپی نہ تصویر۔ ایک دو روزناموں نے اتنا کہا کہ آپ چاہیں تو ہم اسے بہ طور اشتہار اجرت پر چھاپ دیں۔ لیکن یہ ہمیں منظور نہ ہوا۔ ان لوگوں کو کیا معلوم کہ ہم تو اپنے کنج خلوت اور گوشہ گمنامی میں مست رہنے والے آدمی ہیں۔

بایں ہمہ احتیاط معلوم ہوتا ہے۔ ہمارے جانے کی خبر کسی نہ کسی طرح نکل گئی اور پولیس والوں تک پہنچ گئی۔ نتیجتاً انہوں نے لاہور میں ہفتہ ٹریفک کا آغاز کر دیا تاکہ اگر ہمیں ہوائی اڈے پر لینے والے لوگ ہجوم کی شکل اختیار کر جائیں تو اسے سنبھالا جا سکے۔ ہم ان لوگوں کی سادگی پر بہت ہنسے کہ ان لوگوں نے ہمیں بھی دوسرے بڑے

آدمیوں کا سا سمجھا۔ ہم نے تو لاہور کے ہوائی اڈے پر پہنچ کر سوائے اس کے کہ مائیکروفون پر ایک دو بار اعلان کیا یا کسی کو کانوں کان اپنے آنے کی خبر نہ ہونے دی۔ چھپ چھپاتے وہاں سے نکلے اور ٹیکسی میں بیٹھ کر گھر پہنچ گئے۔

عالم ہمہ افسانہ مادار و ماہیچ

☆☆

ہمارے ملک میں لوگوں کو بھیڑ چال کی عادت ہے۔ یہ نہیں کہ اپنے ذہن سے کوئی بات پیدا کریں۔ ہم نے کتاب میلے کے ہفتے کا اعلان کیا تو پولیس والوں کو ٹریفک کا ہفتہ منانے کی سوجھی۔ ریلوے والوں نے کہا ہم کیوں پیچھے رہیں انہوں نے پابندی وقت کے ہفتے کا اعلان کر دیا۔ ہفتہ صفائی کا غلغلہ بھی بلند ہوا حتیٰ کہ لاڑکانہ والوں نے بھی یہ اشتہار دیا کہ ہم ہفتہ روپوش اشتہاری ملزمان مناتے ہیں۔ ہمیں معلوم نہیں یہ ہفتہ کیسے منایا گیا۔ آیا روپوش ملزموں کے اشتہار دیے گئے یا اشتہاری ملزموں کو روپوش ہونے کی آسانیاں بہم پہنچائی گئیں۔ بہر حال سنا ہے یہ ہفتہ بھی بہمہ وجوہ کامیاب رہا۔

کراچی میں ہفتہ صفائی ہماری واپسی سے ایک روز پہلے ختم ہو گیا تھا۔ ہم نے جو صبح صبح اپنے جمعدار گھسیٹے خاں سے کہا کہ میاں ہمارے دروازے پر سے کوڑا اٹھاؤ۔ ''اکیلے نہ جانا'' کے گیتوں کی کاپی پھر پڑھنا تو وہ حیران ہو کر بولا کہ صاحب آپ اخبار نہیں پڑھتے۔ ہفتہ صفائی تو کل ختم ہو گیا۔

☆☆☆

کتاب میلے کے ہفتے میں ہمیں ہر طرف بچے ہی بچے اور کتابیں ہی کتابیں نظر آئیں۔ بچے آخر بچے ہیں۔ کتابوں پر پلے پڑ رہے تھے۔ جوں جوں بڑے ہوتے جائیں گے سر حقیقت ان کے ہاتھ آتا جائے گا اور ان میں سے چند ایک یقیناً اس رتبہ اعلا کو پہنچیں گے جو ہمارے ایک مشہور ماہر تعلیم نے حاصل کیا تھا۔ ان کے جاننے

والوں کا بیان ہے کہ وہ فخر یہ کہتے تھے میرے گھر میں کوئی کتاب نہیں سوائے ٹیلی فون ڈائرکٹری کے۔ آخری کتاب انہوں نے ۱۹۲۵ء میں پڑھی تھی جب کہ لندن میں زیر تعلیم تھے۔ یہ بات ان کی ترقی درجات میں بہت ممد ہوئی۔ آج کچھ ہیں کل ترقی کر کے کچھ ہو گئے۔ پھر تو ان کی اس میدان میں عظمت کا ایسا شہرہ ہوا کہ تعلیم اور کتابوں کے متعلق کوئی کام ان کے مشورے کے بغیر نہ ہو پاتا تھا۔ کراچی کے ایک مشہور سیٹھ سے ہماری ایک بار گفتگو ہو رہی تھی۔ ہم ان سے یہ سن کر خوش ہوئے کہ جب تک وہ رات کو اپنے دفتر کی تمام کتابیں نہ پڑھ لیں، ان کو نیند نہیں آتی۔ ہم نے ان کتابوں کے نام پوچھے تو پتا چلا کہ ان کا مطلب اکاؤنٹ بکس سے ہے یعنی کھاتے کی کتابیں۔ انہیں کی زبانی معلوم ہوا کہ یہ اتنی دلچسپ ہوتی ہیں کہ بار بار پڑھ کر بھی طبیعت سیر نہیں ہوئی۔ واللہ اعلم بالصواب۔

لیکن اس کتاب میلے کا تعلق نہ ٹیلی فون ڈائریکٹریوں سے تھا نہ ہی کھاتے کی کتابوں سے۔ اس کا مقصد ان کتابوں کا فروغ تھا جو ہم آپ پڑھتے ہیں بلکہ یہ کہنا زیادہ درست ہوگا کہ نہیں پڑھتے۔ ادیبوں کے لیے تو یہ بات قابل معافی ہے۔ اگر وہ کتابیں پڑھنے لگیں تو لکھیں کس وقت؟

لیکن کتاب میلے میں تقریریں کرنے والے بہت سے صاحبوں اور صاحباؤں نے بتایا کہ ہمیں ہمارے والدین باقاعدہ منع کیا کرتے تھے کہ یہ کتابیں لے کر بیٹھ جاتے ہو۔ اور کوئی ڈھنگ کا کام کرو۔

بیگم ستنام محمود نے کہ مشہور ماہر تعلیم ہیں اور کتاب میلے کے مذاکرے کی ڈائریکٹر تھیں، بتایا کہ ''ایک بار میں نے صوبے کے مختلف اسکولوں کا اچانک دورہ کیا۔ اور ہر جگہ جا کر پہلا سوال یہی کیا کہ مجھے اس اسکول کی لائبریری دکھاؤ۔ پچانوے فیصد اسکولوں میں یہی جواب ملا کہ جناب وہ الماری جس میں کتابیں ہیں اس کی چابی گم ہو گئی ہے۔ کوئی

کہتا ہے کہ کلرک کے پاس ہے۔ اور کلرک لمبی چھٹی پر گیا ہے۔ کوئی یہ عذر کرتا ہے کہ سابقہ ہیڈ ماسٹر صاحب ہمارے ساتھ بے ایمانی کر گئے۔ ریٹائر ہوئے تو اس کی چابی بھی ہمراہ لے گئے۔'' انہی بیگم ست نام نے بتایا کہ ''میں جب ہوائی میں تھی اور مکان کی تلاش میں تھی تو جو شخص کسی مکان کی سفارش کرتا ان الفاظ میں کرتا کہ اس سے چند منٹ کے فاصلے پر ایک بہت اچھی لائبریری ہے۔ ایک صاحب نے کہا کرایہ تو کچھ زیادہ ہے۔ لیکن آپ فلاں مکان لیجیے۔ اس کے پڑوس میں دو تین لائبریریاں ہیں۔''
ست نام محمود نے ایک بات اور پتے کی کہی۔ فرمایا میں بہت سیمیناروں اور مذاکروں میں شریک ہوتی رہی ہوں جن کے لیے یا جن کے متعلق وہ ہوتے ہیں بس وہی ان میں نہیں ہوتے۔ اگر کوئی سیمنار دیہاتیوں کے لیے ہے تو اس میں سبھی ٹائی کوٹ والے صاحب ہوں گے۔ دیہاتی ایک بھی نہ ہوگا۔ بچوں کے کتاب میلے کے متعلق بھی مجھے یہی گمان تھا کہ یہاں بس بڑے بڑے تعلیم یافتہ گدھ ہوں گے۔ بچے نہیں ہوں گے۔ لیکن کتنی خوشی کی بات ہے کہ یہاں تو ہر طرف بچے ہی بچے ہیں۔'' ایک جہاندیدہ بزرگ کو یہ گفتگو پسند نہ آئی۔ بولے۔ ''یہ آپ کیسی بچوں کی سی باتیں کرتی ہیں؟'' ہمارا خیال تھا وہ ناراض ہوں گی۔ الٹا ہنس دیں اور بولیں۔ ''شکریہ۔ میں آپ سے یہی کہلوانا چاہتی تھی۔''

قباحت ہفتے منانے میں یہ ہے کہ ہفتہ صرف سات دن کا ہوتا ہے اور گزر جاتا ہے۔
ٹریفک کے ہفتے کے دوران میں تو حادثوں کا زور رہتا ہے۔ اس کے گزرنے پر کم ہو جاتا ہے۔ درخت لگانے کا ہفتہ ختم ہوتے ہی' کار پردازانِ ہفتہ درختوں کی ٹہنیاں اکھاڑ پھینکتے ہیں جو بہ طور پودوں کے سڑکوں کے دورویہ نصب کی جاتی ہیں۔ پچھلے سال جو بسوں والوں نے ہفتہ خوش اخلاقی منایا تو اس میں ہم نے دیکھا کہ جو کنڈیکٹر ہے باچھیں پھیلائے آپ' جناب' حضور بندہ نواز کہہ کر بات کر رہا ہے۔ اس ہفتے کے

آخری روز وقت اختتام یعنی بارہ بجے سے ایک دو منٹ پہلے ہم نے ایک کنڈیکٹر کو دیکھا کہ گھڑی بھی دیکھے جا رہا ہے اور مسافروں سے بھی خطاب کر رہا ہے کہ حضرات۔ زحمت نہ ہو تو ذرا ٹکٹ لے لیجیے۔ بی بی' بہنو ذرا سمٹ سمٹ کر۔ میاں جی ذرا فٹ بورڈ سے ادھر تشریف لے آیئے۔'' اس کے بعد یکایک کڑکتی ہوئی آواز آئی۔ ''اے بابو بس تیرے باوا کی ہے جو یوں پھیل کے بیٹھا ہے۔'' یہ اعلان تھا اس بات کا کہ بارہ بج گئے ہفتہ خوش اخلاقی بہ خیر و خوبی اختتام کو پہنچا۔ پھر ملیں گے اگر خدا نے ملایا۔

قیس اور فرہاد سمجھ دار آدمی تھے
مرتے مر گئے' عمر بھر شادی نہ کی

یہ مہینہ شعبان کا خیر و برکت کا مہینہ ہے۔ مذہبی نقطہ نظر سے تو ہے ہی ہمارے سیکولر یعنی دنیاداری کے نقطہ نگاہ سے بھی۔ آپ بھی مٹکے میں سے اپنی اچکن نکالیے' ایک رات تکیے کے نیچے رکھنے کے بعد اسے زیب تن کیجیے اور سر پر دوپلی ٹوپی جما' دیدوں میں سرمے کی تحریر کھینچ' بھلے آدمیوں کی سی صورت بنا شہر میں نکل جایئے اور اللہ کی قدرت کاملہ اور شانِ رزاقی کا تماشا دیکھیے۔

جہاں آپ کو اودے اودے نیلے نیلے' پیلے پیلے پیرہن اور تمبو قناتیں نظر آئیں' بس وہیں رک جایئے۔ وہی آپ کی منزل ہے آپ اب بھی نہیں سمجھے؟ ہمیں تو آپ کی ذہانت پر بہت اعتماد تھا۔

ارے صاحب یہ جگہ جہاں خیمہ و خرگاہ برپا ہے' بریانی کی خوشبو دشمنِ ایمان و آگہی اور رہ زن تمکین و ہوش ہے اور بینڈ باجے کی آواز فردوسِ گوش ہے' شادی کا گھر ہے۔ کس کی شادی کا۔ اس سے آپ کو غرض نہ ہونی چاہیے۔ بہر حال آپ کی نہیں۔
اس تمبو کے نیچے شادی کا رن یا تو پڑ چکا یا ابھی پڑے گا۔ بہر حال خانہ' بے تکلف ہے تشریف رکھیے۔ ان لوگوں نے اگر آپ کو نہیں بلایا تو یہ ان کی غلطی ہے۔ آپ ان کی

دعوت میں نہ شریک ہوں گے تو یہ آپ کی غلطی ہوگی کیونکہ کسی دوسرے کی شادی غمی' بالخصوص شادی میں شریک نہ ہونا تقاضائے انسانیت کے خلاف ہے۔ یہ دوسرے پری چہرہ لوگ کہ شیروانیاں پھٹکارتے پھر رہے ہیں سب کے سب مدعو تھوڑا ہی ہیں' ان میں سے اکثر آپ ہی کی طرح جذبہ انسانیت سے مجبور ہو کر آ گئے ہیں' اور دعوت کھا کر اپنے اپنے گھروں کی راہ لیں گے۔

ہمیں تو اس سارے مہینے میں شام اور دوپہر کے کھانے کا تردد کرنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ ایک آدھ دعوت سے اٹھا بھی دیے گئے تو حرج نہیں۔ تو نہیں اور سہی' اور نہیں اور سہی بلکہ ہم سوچتے ہیں کہ یہ لوگ جو اتنا خرچ کرتے ہیں' اگر ناشتے کا اہتمام بھی رکھا کرتے تو مزید خیر و برکت کا موجب ہوتا۔ ان کے حق میں بھی' ہمارے لیے بھی۔

وجہ شادیوں کی اس ریل پیل کی قربِ قیامت نہیں' قرب رمضان شریف ہے۔ جن لوگوں کو اپنی زندگیاں بنانی یا بگاڑنی ہیں اس مبارک مہینے کی آمد سے پہلے اس کا سامان کر لینا چاہتے ہیں۔ ورنہ پھر عید کے بعد یہ بات جاری رہے گی اور شاعر کہہ گیا ہے۔

ولے کہ عاشق و صابر بود مگر سنگ است
زعشق تا بہ صبوری ہزار فرسنگ است

ہم آدمی نرم طبیعت کے ہیں لہٰذا جب بھی کسی کی شادی میں شریک ہوئے دولہا میاں پر ترس آیا کہ بے چارا اس وقت انجام سے بے خبر کیا خوش خوش بیٹھا ہے۔ کوئی دن میں یہ ساری عشق و عاشقی کی چوکڑی بھول جائے گا اور منڈی میں آٹے دال کا بھاؤ پوچھتا نظر آئے گا۔ ایک بچہ کاندھے پر ہوگا' ایک گود میں اور دو انگلی تھامے ہوں گے پھر بھی خیال ان بچوں میں لگا ہوگا جنہیں گھر پر چھوڑ آیا ہے۔ اس وقت اسے احساس ہوگا کہ قیس اور فرہاد ایسے بدھو نہ تھے۔ جیسے داستانوں میں نظر آتے ہیں شادی کرنا چاہتے تو بخوبی کر سکتے تھے لیکن دانش مند تھے لہٰذا صحرا کی خاک چھاننا اور پہاڑ

کاٹنا منظور کر لیا۔ لیکن عمر بھر کا روگ پالنے سے پرہیز کیا۔ اب دیکھیے باراتی تو کھانے کے بعد خوشبودار پان کھا کر پلاؤ میں بناسپتی گھی ہونے کی شکایت کرتے ہوئے ایک ایک کر کے کھسک جائیں گے۔ دولہا بچارے کو تمبوؤں اور دیگوں کا کرایہ چکانا پڑے گا۔ سقے اور باورچی سے حساب فہمی کرنی پڑے گی اور ازدواجی زندگی کے دوسرے اور تیسرے مرحلے کے لیے تیار ہونا پڑے گا۔ داناؤں نے ان مرحلوں کی تفصیل یہ بیان کی ہے کہ شادی سے پہلے مرد بولتا ہے اظہار محبت وغیرہ کرتا ہے اور عورت سنتی ہے۔ شادی کے بعد عورت بولتی ہے اور مرد سنتا ہے۔ پھر ایک روز یہ دونوں بولتے ہیں اور محلے والے سنتے ہیں۔ جس زندگی میں یہ تینوں مرحلے نہ آئیں اسے مکمل یا کامیاب نہیں سمجھا جاتا۔

☆☆☆

شادیوں میں ہم دولہا دلہنوں کو دیکھتے ہیں اور ان کا جی رکھنے کو یہ بھی کہتے ہیں کہ آپ کی زندگی بہت خوشگوار گزرے گی۔ دروغِ مصلحت آمیز بہ از راستی فتنہ انگیز۔ لیکن رشک ہمیں اس سارے ہنگامے میں اگر آتا ہے تو رولد محمد دین اینڈ سنز اور ان کے ہم پیشگان پر جنہیں اپنے کرایے سے مطلب ہے۔ اس سے غرض نہیں کہ دولہا گنجا ہے یا دلہن گنجی ہے' دونوں شیعہ ہیں یا سنی' پنجابی ہیں یا یوپی کے شریف گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ پابند صوم صلوۃ ہیں یا میاں سیدھا میخانے سے اٹھ کر آیا ہے اور سہرا اتارتے ہی سیدھا جوا خانے میں پہنچے گا۔ ہم نے شادی کا اہتمام کرنے والوں میں بھی ایک فریق تمبو قناتوں والوں کا دیکھا جو ازدواجی زندگی کی قباحتوں سے محفوظ رہتا ہے۔ اور امیر خسرو سے تعویذ لکھوا کے لایا ہے۔

مرا جاشد خرم رانیز جاشد
زنِ دہقان زاید یا نہ زاید

☆☆☆

آج کل اصلاح معاشرہ والے برابر یہ آواز بلند کر رہے ہیں کہ شادیوں کا خرچ گھٹنا چاہیے۔ جہیز پر پابندی ہو' مہمانوں کی تعداد محدود کردی جائے۔ اس آخری بات کے تو ہم حق میں نہیں لیکن دوسری مدوں میں تخفیف کی کچھ نہ کچھ گنجائش ہے۔ خیراب وہ پہلے زمانے کا سا کروفر نہیں' بالخصوص شہروں میں۔ دولہا میاں کسی کی کار ادھار مانگ لیتے ہیں' پٹرول ڈلوا لیتے ہیں۔ کار والا مفت کھانا کھانے کے لالچ میں کار دے دیتا ہے۔ باقی لوگ ٹیکسیوں' رکشاؤں میں آجاتے ہیں یا بس کرائے کی لی جاتی ہے۔ باجے گاجے کا دستور بھی اٹھتا جا رہا ہے۔ اور لارنس روڈ کے باجے والے اب مکھیاں مارتے ہیں اور کارپوریشن کو فروخت کرتے ہیں۔ جہیز پر اب بھی کہیں کہیں پابندی ہے۔ دولہا کہلوا بھیجتا ہے کہ بیس ہزار روپے سے کم کا نہ ہو اور اس میں یہ یہ چیزیں شامل ہونی چاہئیں۔ جہاں پابندی نہیں ہوتی وہاں دلہن والے جو چاہتے ہیں دے دیتے ہیں۔ بعض اوقات تو دلہن کو میکے سے بیشتر کپڑے وہی ملتے ہیں جو ان کی والدہ کو اپنی والدہ سے ملے تھے۔ وہ دور اندیش بڑی بی پہلی جنگ عظیم سے کچھ پہلے جب یہ کپڑے اپنے میکے سے لائی تھیں اسی وقت سوچ لیا تھا کہ پوتی کو دیں گے۔ آج کل اس زمانے کی سی چیزیں ملتی کہاں ہیں۔ آج کل کا کپڑا تو آج خریدو پانچ چار سال میں پھٹ جاتا ہے۔

پرانے زمانے میں دولہا گھوڑے پر سوار ہوتا تھا بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ چار آدمی مل کر اسے گھوڑے پر چڑھاتے تھے اور بہ نظر احتیاط زین کے ساتھ باندھ دیتے تھے کہ گر نہ جائے یا ایک آدمی کو پیچھے بٹھا دیتے تھے جو اسے پکڑے رہتا تھا اور شہ بالا کہلاتا تھا۔ موٹروں اور مشینوں سے چلنے والی دوسری گاڑیوں کو شادی کے مبارک موقع پر خلاف وضع سمجھا جاتا تھا اور لوگ پالکیوں' بہلیوں اور تانگوں وغیرہ کا بندوبست کرتے تھے۔

ہمارے ایک جز رس دوست شرفا کے ایک قدیم خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کو پرانی روایات کا پاس بہت ہے جسے انہوں نے اپنی شادی میں بھی ملحوظ رکھا۔ ہم اس جلوس کا آنکھوں دیکھا حال بیان کرتے ہیں۔ بس ایک وکٹوریہ کے کوزے میں سارا دریا بند تھا۔ دلہن اور دوسرے قریبی رشتے دار وکٹوریا کے اندر تشریف رکھتے تھے۔ یہ دولہا بنے چہرے پر ہار۔ اس اہتمام سے ڈالے کہ قرض خواہ دیکھیں بھی تو پہچان نہ سکیں۔ اس وکٹوریہ کے گھوڑے پر تن کر بیٹھے تھے۔ باجے والے ''گھوڑی چڑھیا نی مائیں'' کی دھن بجا رہے تھے۔ کوچوان کے ہاتھ میں مورچھل تھا جسے وہ چابک کی طرح ان کے سر پر لہرا رہا تھا تاکہ جہاں جہاں ان کی پوشاک پر سالن یا میٹھا گرا ہے' اس پر مکھیاں بیٹھ کر انہیں تنگ نہ کریں۔ ہم چونکہ شہ بالا تھے۔ لہٰذا باقی باراتیوں کو پیدل چھوڑ کر ہمیں وکٹوریہ کے پیچھے کی اس سیٹ پر جگہ دی گئی جس پر لڑکے بالے ازراہِ شرارت اچک کر سوار ہوتے ہیں اور کوچوان کے چھانٹا کھانے پر بھاگ جاتے ہیں۔ اس کم خرچ بالانشین مثال سے اور لوگ بھی سبق حاصل کر سکتے ہیں۔ کم از کم عبرت تو پکڑ سکتے ہیں۔

☆☆☆

سچ کے پاؤں نہیں ہوتے

قرض دینے سے محبت بڑھتی ہے فلسفہ روزے اور چاولوں کا

پچھلے دنوں ایک اخبار کے کالموں میں یہ بحث دیکھنے میں آئی کہ آیا ہر موقع پر سچ بولنا چاہیئے یا کبھی کبھی تبدیلی ذائقہ کے لیے جھوٹ بولنے میں بھی حرج نہیں۔ ایک محترمہ نے کالم میں لکھا کہ وہ ہر موقع پر سچ بولنے کے حق میں ہیں۔ اس سے بعض غلط فہمیاں بھی پھیلیں یعنی لوگوں نے سمجھا کہ اس اصول کا اطلاق ان پر بھی ہوتا ہے یا کم از کم آئندہ ہوگا۔ یہ بات نہیں انہوں نے تو ایک زریں اصول بیان کیا تھا' لوگ ناحق اسے ذاتیات کی طرف لے گئے۔ وہ اس کی تردید کرنا چاہتی تھیں۔ لیکن چونکہ طبیعت مرنجاں مرنج پائی ہے اس لیے خاموش رہیں۔ خیر ان کی طرف سے ہم یہ وضاحت کرر ہے ہیں کہ روزہ اپنی جگہ ہے' چاول اپنی جگہ۔ یعنی ہم اپنے قارئین کو ان بزرگ کا قصہ یاد دلاتے ہیں جو رمضان شریف میں لوگوں کو تلقین کیا کرتے تھے کہ روزہ کسی حال میں نہ چھوڑنا چاہیے۔ ایک روز کوئی ہم سا نیاز مند کسی مسئلے مسائل کے سلسلے میں ان کے در دولت پر پہنچا۔ دستک دی تو بزرگ تھوڑی دیر میں میں داڑھی جھاڑتے ہوئے تشریف لائے اور دروازہ کھولا۔ احتیاط تو انہوں نے کی لیکن ایک گستاخ چاول پھر بھی

ریش مبارک میں کہیں اٹکا رہ گیا۔ نیاز مند نے کہا۔ قبلہ آپ لوگوں کو روزہ رکھنے کی تلقین کرتے ہیں اور خود آپ کا عمل یہ ہے کہ دن میں بیٹھے کھانا کھا رہے ہیں۔ بزرگوار نے کہا' کون کافر کہتا ہے کہ میرا روزہ نہیں ہے۔ نیاز مند نے چاول کی طرف اشارہ کیا' انہوں نے ڈانٹا۔ اے بھلے آدمی غلط بحث کیوں کرتا ہے۔ روزہ اپنی جگہ' چاول اپنی جگہ۔

☆☆☆

خیر کہنا یہ تھا کہ غلط صحبت کی وبا پھیل جائے تو خود ان لیڈروں کو بھی اپنا پیٹ کاٹنا پڑے جو قوم کو ایثار کا درس دیتے ہیں۔ لیڈری یوں نہیں چلتی۔ یہ سبق کانگریسی لیڈروں سے لینا چاہیے کہ احمد نگر کے قلعے میں بھوک ہڑتال بھی کر رکھی تھی اور معتبر ذرائع کا کہنا ہے کہ چھپ چھپ کے بسکٹ بھی کھاتے تھے۔ لیڈری ہی نہیں اس سے دنیا داری کے دوسرے کارخانے بھی بند ہو جائیں۔ ابھی کل ہی ایک حلوائی کے ہاں سے خالص تاندلیانوالہ کے گھی کے لڈو لائے۔ تھوڑا انتظار بھی کرنا پڑا' اس لیے کہ وہ اس وقت مصلے پر بیٹھا کوئی وظیفہ کر رہا تھا۔ غالباً کشائش روزی کا۔ تولتے تولتے اس نے زمانے پر لعنت بھیجی کہ کہتے کچھ ہیں کرتے کچھ ہیں۔ یہ بشارت بھی دی کہ بے ایمانی کرنے والوں کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایک گرم جگہ کا معقول انتظام کر رکھا ہے۔ چربی تو بے شک اس مٹھائی میں ہم نے خالص ہی پائی لیکن تول میں وہ پانچ سیر کے بجائے چار سیر نکلی۔ دور کیوں جایئے۔ ہماری گلی کی نکڑ کا پان سگریٹ والا اپنے ہاں تختی لگائے ہوئے ہے کہ ادھار محبت کی قینچی ہے لیکن خود ہی اس کی خلاف ورزی کرتے ہوئے ہمیں برابر چھ ماہ سے ادھار دے رہا ہے۔ یہ سچ ہے کہ اس نے دس پانچ بار تقاضا کیا ہے اور ایک آدھ بار ناخوش گوار سی تو تکار کی نوبت بھی آئی لیکن کچہری میں اب تک ہمارے خلاف نالش نہ کی۔

☆☆☆

ایک بار ہمارے ایک کرم فرمانے جن کا ہیئر کٹنگ سیلون اس وجہ سے بند ہو گیا ہے کہ لوگوں پر ادھار زیادہ چڑھ گیا تھا' اپنی دکان پر سے ''قرض مقراض محبت ہے'' کی تختی اتار کر ہمیں مفت دینے کی پیش کش کی تھی۔ جسے ہم نے لینے سے انکار کیا اس لیے کہ غیر ضروری منافقت ہم سے نہیں ہوتی۔ ہمیں تو ہر صبح کسی نہ کسی سے ادھار لینا ہوا۔ لوگوں سے قطع محبت کا خوف سوار ہوا تو ہمارا کام کیسے چلے گا۔ ویسے سچ یہ ہے کہ بزرگوں کے اکثر دیگر اقوال کی طرح اس مقولے کو بھی ہم نے اپنے عملی تجربے کے خلاف پایا ہے۔

اس کی ایک مثال لیجیے۔ شیخ سدو ہمارے پرانے دوست ہیں۔ یہ وہ شیخ سدو نہیں جن کا ذکر عملیات اور جادو ٹونے کی کتابوں میں پایا جاتا ہے' وہ غالباً ان کے مورث اعلا تھے۔ اس وقت ہماری مراد شیخ صدرالدین سے ہے' جن کی صدر میں صدریوں کی دکان ہے۔ عرصہ تین سال کا ہوتا ہے کہ انہوں نے ایک دو دن کی واپسی کے وعدے پر ہم سے پچاس روپے لیے تھے۔ وجہ قرض اب ہمیں یاد ہے نہ انہیں۔ انہیں تو خیر کئی بار یہ بھی یاد نہیں رہتا کہ انہوں نے کبھی ہم سے یہ رقم لی تھی۔ کاروبار کے ہجوم میں ایسا ہونا قدرتی ہے۔ لیکن ہم اس کو کسی طرح نہیں بھولے اور یہ قرض کا رشتہ ہی اب بہت دن سے ہماری دوستی اور ملاقات کی وجہ سے ہے۔ اس واقعے سے پہلے ہماری ان سے سرراہے یا کسی بیاہ شادی میں ملاقات ہو جاتی تھی۔ ورنہ نہیں کیونکہ وہ رسالہ نہیں نکالتے جس کے لیے مضمون لینا پڑے اور ہم صدریاں نہیں خریدتے پہنتے کہ نئی روشنی کے آدمی ہیں۔ لیکن اب تو یہ عالم ہے کہ دل ان میں لگا رہتا ہے۔ کسی کام سے ادھر جائیں تو ان کی دکان کا پھیرا کیے بغیر نہیں آسکتے۔ دل ہی نہیں مانتا۔ بڑے تپاک سے مزاج شریف ہوتی ہے جس کی وجہ سے کئی بار تو ہمیں اپنے سے بھی شرمندگی ہوتی ہے کہ اتنے

خلوص کے آدمی سے پچاس روپے کی حقیر رقم کا ذکر چھیڑ بیٹھتے ہیں۔ لیکن بندہ بشر ہے بعض اوقات حرف مطلب زبان پر آ ہی جاتا ہے۔ ہم کوشش کرتے ہیں کہ براہ راست نہ کہنا پڑے بلکہ گفتگو میں پچاس کا لفظ بار بار آئے جس سے ان کی یادداشت عود کر آئے مثلاً اس قسم کے فقرے ان سے گفتگو میں ہم سے اکثر سرزد ہوتے ہیں۔

''آج سیلون کی ٹیم نے پچاس رن کیے ہیں۔''

''روس کے انقلاب کو پچاس سال ہونے والے ہیں۔''

''صدر کے علاقے میں تو پچاسوں گداگر ہیں بھئی۔''

''اب ہمارا گھٹنے کا درد پچاس فیصدی رہ گیا ہے۔''

ان فقروں کا کچھ اثر نہ دیکھ کر ہم ازراہ کمینگی نیم براہِ راست بات بھی کہہ جاتے ہیں کہ ''حکومت نے پچاس روپے والے نئے نوٹ جاری کیے ہیں۔ بڑے خوبصورت ہیں۔ تم نے دیکھیے۔'' نتیجہ اس کا بھی کچھ نہ نکلا۔

لیکن اُدھار کی بات تو ضمناً آ گئی۔ ہم ذکر جھوٹ سچ کا کر رہے تھے۔ ہم تھوڑا کام اشتہار بنانے کا بھی کرتے ہیں۔ ہمارا تجربہ ہے کہ یہ بات چت بھی پڑتی ہے اور پٹ بھی' ساحر لدھیانوی نے اپنے مجموعے تلخیاں کے اشتہار میں علامہ تاجور نجیب آبادی کی یہ رائے لکھ دی کہ ''ساحر اپنی غلط نگاری میں پختہ ہو چکا ہے۔ اسے زبان و بیان کا قطعی سلیقہ نہیں۔'' اس پر یہ کتاب خوب بکی۔ ممتاز مفتی کی کتاب ''علی پور کا ایلی'' کا اشتہار ہم نے دیکھا۔ اس میں مشتہر نے لکھا تھا کہ ''یہ وہی ناول ہے جسے آدم جی انعام کے فاضل ججوں نے (آگے ان کے نام بھی دیے تھے) متفقہ طور پر انعام کے ناقابل قرار دیا۔'' اسی حق گوئی کے صدقے اس کا پہلا ایڈیشن چند مہینے میں نکل گیا حالانکہ بیس روپے کی کتاب تھی۔ اور بھاری ایسی کہ کچھ کم بیس روپے اس پر محصول ڈاک لگتا تھا۔ البتہ نمکدان کے معاملے میں یہ نسخہ نہ چلا۔ طفیل احمد جمالی صاحب نے پہلے تو اس میں

خالی جگہیں پر کرنے کے لیے وہی گھسا پٹا فقرہ لکھا جاتا تھا کہ ’’نمکدان میں اشتہار دے کر اپنے کاروبار کو فروغ دیجیے۔‘‘ جمالی صاحب سے منافقت نہ ہوسکی۔ انہوں نے لکھا کہ ’’نمکدان میں اشتہار دے کر ہمارے کاروبار کو فروغ دیجیے۔‘‘ نتیجے کا قیاس اس سے کیجیے کہ نمکدان کو بند ہوئے آج تیس سال ہوتے ہیں۔

☆☆☆

ایسے لوگ تو بہت ملتے ہیں کہ جھوٹ نہیں بول سکتے۔ کبھی ضرورتاً یا کسی کے دباؤ کے تحت بولیں تو فوراً پکڑے جاتے ہیں۔ لیکن ہمارے دوستوں میں ایسے بھی ہیں کہ سچ بولیں تو پکڑے جاتے ہیں۔ اس لیے کہ ان کو سچ بولنے کی کبھی مشق نہیں رہی اور چیز کوئی بھی ہو، مشق ہی سے حاصل ہے۔ یہ مقولے جو آپ نے بھی سنے ہوں گے۔

’’سچ کے پاؤں نہیں ہوتے۔‘‘

’’سانچ کو آنچ ہے۔‘‘

’’جھوٹے کا بول بالا۔ سچے کا.....

ان کے ڈرائنگ روم میں بھی ہم نے یہی کچھ سب کچھ لکھا لٹکا دیکھا۔

جھوٹ کہہ، جھوٹ کہہ، ہمیشہ جھوٹ کہہ
ہے بھلے مانسو کا پیشہ جھوٹ کہہ

یاد رہے کہ یہ بھلے مانس پیشے کے اعتبار سے اچھے لوگ ہیں۔

☆☆☆

اسے اشتہار نہ سمجھا جائے

اخبارِ خواتین میں ہمارے کالم جس شان اور انداز سے چھپتے رہے ہیں، اس سے بعض حلقوں میں چند در چند غلط فہمیاں پیدا ہوگئی ہیں، جن کا ازالہ ضروری معلوم ہوتا ہے پہلے شمارے میں جس صفحے پر ہمارا کالم تھا اسی میں ایک پہلو میں یہ مضمون بھی تھا کہ ’’پاگلوں کے ساتھ کیسے رہنا چاہیے۔‘‘ اس میں کسی قسم کا اشارہ ہماری طرف نہ تھا، کم از کم ایڈیٹر صاحبہ کا بیان یہی ہے۔ دوسرے شمارے میں ہمارا مضمون جنتریوں وغیرہ کے بارے میں تھا۔ اس میں ایک پرندے کی تصویر جو رات کو جاگتا اور دن میں سوتا ہے۔ ہمارے نام کے آس پاس شائع ہوگئی تھی۔ ہمارے ہاں اس پرندے کے خلاف طرح طرح کے تعصبات ہیں۔ حالانکہ مغربی روایات میں اسے دانش مندی کا مظہر سمجھا جاتا ہے۔ اس توجیہ کے باوجود ہم سمجھتے ہیں کہ یہ تصویر ہمارے نام سے ذرا دور ہٹ کر لگتی تو بہتر ہوتا۔ بہرحال ایڈیٹر کا کہنا ہے کہ یہ بھی ایک امر اتفاقی ہے۔ زیادہ سنگین واردات تیسرے شمارے میں ہوئی جس میں ہمارے مضمون کا عنوان تھا ’’اشتہار ضرورت رشتہ کا‘‘ اور عین اس کے ساتھ ایک بڑی سی تصویر ہماری تھی۔ ہمیں وہ مضمون خود پسند تھا اور ہمارا خیال تھا کہ کسی طرف سے داد کے خطوط آئیں گے۔ لیکن اب تک جو خطوط آئے ہیں، ان میں ہماری تعلیم، عمر، اور تنخواہ وغیرہ کے متعلق استفسارات ہیں جو غالباً کسی غلط فہمی کی بنا پر ہیں۔ اس مضمون کو مضمون ہی تصور کیا جائے اشتہار نہ سمجھا جائے۔ بہتر تو یہ ہوگا کہ اخبارِ خواتین کی ایڈیٹر صاحبہ اپنے منیجر اشتہارات سے بھی اس بات کی وضاحت کردیں، ازاں پیشتر کہ وہ پانچ چھ سو روپے کا بل بنا کر ہم سے ادائیگی کا تقاضا شروع کردیں۔

☆☆☆

طلاق کے مقدمے میں میاں بیوی کے درمیان راضی نامہ ہو گیا

''اخبار خواتین'' کے ابن انشاء صاحب نے پچھلے دنوں ادیب، صحافی، شاعر اور مزاح نگار کی حیثیت سے چار ہفتے تک عوامی جمہوریہ چین کا دورہ کیا۔ واپسی پر وہ بہت کچھ لکھنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ لیکن چونکہ ایک ہفتے بعد انہیں جاپان کے دورے پر روانہ ہونا تھا، اس لیے وہ اس ارادے کی تکمیل نہ کر سکے اور سنانے پر ہی اکتفا کر گئے۔ انہوں نے چین کی عورت کو جس حال میں دیکھا اور اس کے بارے میں ان کے جو تاثرات ہیں وہ ہم قارئین کی دلچسپی کے لیے پیش کر رہے ہیں۔ یہ بڑا سرسری سا جائزہ ہے لیکن ہمیں امید ہے کہ اس سے عظیم چین کی اس عظیم ہستی کے خدوخال ضرور سامنے آجاتے ہیں جس کا نام عورت ہے۔

ایک پاکستانی بزرگ چین تشریف لے گئے۔ کئی روز وہاں کوچہ و بازار میں گھومتے پھرے۔ واپسی سے ایک روز پہلے اپنے دوست سے پوچھا ''کیوں جناب کیا چین میں عورتیں نہیں ہوتیں۔''

ان کے دوست نے کہا ''خیر باشد۔ آپ کیسی بات کر رہے ہیں؟ ذرا اپنے سوال کی معقولیت پر غور فرمایئے۔''

کہنے لگے۔ ''بے شک یہ میں بھی جانتا ہوں کہ عورت کے بغیر محفل ہستی کو نمود نہیں ہو سکتی۔ فی الحال انسان ڈھالنے کی مشین اور کارخانے نہیں بنے لیکن اگر عورتیں ہیں تو کہاں ہیں۔ کیا ان کو پردے میں رکھا جاتا ہے؟''

یہ واقعہ پیکنگ کے پاکستانی سفارت خانے میں ایک صاحب نے سنایا۔ ممکن ہے یہ داستان نہ ہو زیب داستان ہو، لیکن مقصود ان کے کہنے کا یہ تھا کہ چین میں عورتوں اور مردوں کے لباس میں کوئی فرق نہیں۔ وہی بند گلے کی جیکٹ، وہی پتلون، ایک سا جوتا، نہ سرخی نہ لپ اسٹک نہ بندے نہ جھومر۔ نہ غرارہ نہ ساڑھی نہ دوپٹہ نہ پرس۔ یہ سب سچ ہے۔ میں خود جاتے ہوئے اپنی ہینڈی کرافٹ شاپ سے موتیوں کا ایک پرس لے گیا تھا، خیال یہ تھا کہ کوئی بیگم ادیبہ ملیں گی یا کسی ادیب کی بیگم کو نذر کروں گا تو خوشی ہو گی۔ لیکن وہاں کے رنگ ڈھنگ دیکھ کر آخر ایک پاکستانی خاتون کے حوالے کر آیا۔ وہاں تو کوئی خاتون سودا سلف لینے کو نکلے تو زیادہ سے زیادہ کپڑے یا پلاسٹک کا تھیلا ساتھ ہوتا ہے اور بس۔

بایں ہمہ یہ بات مبالغہ ہے کہ عورت اور مرد کی پہچان نہیں ہو سکتی۔ حسن و رعنائی وہاں بہت ہے۔ ایسے ایسے چہرے نظر آئے کہ بس۔ اور پھر چہروں کا حسن صحت اور شادابی سے عبارت ہوتا ہے' کسی مصنوعی مدد کا محتاج نہیں۔

ایک جگہ کچھ خواتین غازہ پوتے، بھڑکیلے لباس پہنے نظر آئیں تو تحقیق پر معلوم ہوا کہ بے شک چینی ہیں لیکن سمندر پار کی چینی۔ سنگاپور سے سیر کے لیے یہاں آئی ہوئی ہیں۔ کسی چینی کو لاغر دیکھیے یا کسی کا پیٹ بڑھا ہوا پایئے تو یہ بھید کھلے گا کہ یہاں کا متوطن نہیں۔ باہر سے آیا ہوا ہے۔ سارے چین میں کسی مرد یا عورت کو لاغر نہ پایا۔ اسپتالوں میں بہت کم مریض ہوتے ہیں۔ وارڈ کے وارڈ خالی پڑے رہتے ہیں۔ کوئی بیمار ہو تو آئے۔

عورتیں دوسرے بہت سے ملکوں میں بھی کام کرتی ہیں لیکن چین کی طرح نہیں۔ کام کرنے میں عورت اور مرد کا کوئی فرق نہیں۔ عورتیں بھاری مشینیں چلاتی ہیں۔ کاریں اور ٹرک چلاتی ہیں۔ دکانیں اور کارخانے چلاتی ہیں۔ کھیتوں میں ہل چلاتی ہیں۔ سڑکیں بناتی ہیں اور سب سے بڑی بات یہ کہ بڑے بڑے بوجھ اٹھاتی اور کھینچتی ہیں۔

چین کی ایک بات جو ہماری سمجھ میں نہیں آئی یہ بھی ہے کہ ایک مرد یا عورت اتنا بوجھ کیسے کھینچ لیتی ہے جس کے لیے ہمارے ہاں گھوڑے کی ضرورت ہو۔ ایک ریڑھا لوہے کی سلاخوں یا سرخ اینٹوں یا اناج کی بوریوں سے لدا ہوا ہے اور ایک شخص بڑے آرام سے اسے کھینچے یا دھکیلے جا رہا ہے۔ اگر اتنا سامان ہو جتنا ہمارے ہاں اونٹ گاڑی میں عموماً ہوتا ہے تو ایک مرد یا عورت اسے کھینچ رہی ہوتی اور ایک یا دو اور مرد یا عورت اس کی مدد کر رہے ہوں گے لیکن ہانپتے کانپتے نہیں۔ بڑے اطمینان اور آرام کے ساتھ جیسے خالی چل رہے ہوں۔ مویشی یا بار برداری کے جانور ہمیں خال خال ہی نظر آئے۔ زیادہ بھاری کاموں کے لیے ٹرک اور ٹریکٹر ہیں لیکن زیادہ تر بار کشی انسان کرتے ہیں۔ بعض حالتوں میں سائیکل یا سائیکل گاڑیاں بھی استعمال ہوتی ہیں۔
کارخانوں میں کام کرنے والوں میں عورتوں کا تناسب تیس پینتیس فی صد ہوتا ہے۔
بعض اوقات اسپتالوں میں تو کچھ مریض ہوتے بھی ہیں۔ عدالتیں بالکل ہی خالی رہتی ہیں۔ بعض اوقات ہفتوں کوئی کیس نہیں ہوتا۔ ایک پاکستانی دوست جو قانون سے دلچسپی رکھتے ہیں، کوئی عدالت دیکھنا چاہتے تھے۔ پیکنگ کی عدالت عالیہ کے چیف جج نے کہا کہ بھیا ہمارے ہاں تو بہت دن سے کوئی کیس نہیں لگا۔ ہاں فلاں گاؤں میں ایک مقدمہ ہے وہ چل کے دیکھ لو۔ چیف جج صاحب ان کو لے کر وہاں پہنچے۔ مقدمہ طلاق کا تھا۔ ایک کارخانے کے کاریگر نے عرضی دی تھی کہ میری بیوی بہت بدمزاج

ہے، ہاتھ چھٹ بھی ہے، تکرار اور مار پیٹ کرتی ہے۔ میری بڑھیا ماں کا خیال نہیں کرتی۔ میں اس سے علیحدگی چاہتا ہوں۔ وہاں اشٹام وغیرہ کا رواج نہیں۔ سادہ کاغذ پر لکھ کر عرضی دے دیجیے۔ یا پوسٹ کر دیجیے دوسرے تیسرے روز عدالت بیٹھ جائے گی اور عموماً ایک ہی دن میں فیصلہ ہو جاتا ہے۔ وکیل بھی پارٹ ٹائم ہیں۔ ان کو فیس یا مشاہرہ حکومت کی طرف سے ملتا ہے اور ان کا کام مدعی یا مدعا علیہ کی جانچ کرنا نہیں بلکہ قانون کی تشریح کرنا ہوتا ہے۔

خیر تو یہ لوگ اس گاؤں میں پہنچے تو عدالت شروع ہو گئی تھی۔ کوئی عبا قبا تھی نہ اونچی کرسی نہ جج کا ہتھوڑا۔ ایک میز کے گرد جج بھی بیٹھا تھا۔ ساتھ ہی مدعی بیٹھا چائے پی رہا تھا اور سگریٹ کا دھواں اڑا رہا تھا۔ اس کے علاوہ دو آدمی اس کے کارخانے کی انتظامیہ کے۔
دوسری طرف اس کی بیوی اور بیوی کے کارخانے کے دو آدمی۔ ان آدمیوں نے دونوں کے حق میں شہادتیں دیں کہ محنتی کارکن ہیں۔ البتہ بیوی کے کارخانے والوں نے کہا کہ یہ بی بی مزاج کی تیز ہیں۔ کبھی کبھی مغلوب الغضب ہو جاتی ہیں۔
بیوی نے اس الزام کو تسلیم کیا کہ بے شک میرا مزاج بگڑا رہتا ہے لیکن میرا میاں شام کو دیر سے گھر آتا ہے۔ ڈراما دیکھنے چلا جاتا ہے یا اپنے دوستوں کے ساتھ وقت گزارتا ہے۔ اس کی ماں کا خیال بے شک میں نے کبھی نہیں کیا کیونکہ میری ماں بچپن میں انتقال کر گئی تھی۔ مجھے معلوم ہی نہیں ماں کیا ہوتی ہے۔ اب البتہ مجھے احساس ہوا ہے کہ میں غلطی پر ہوں۔ مرد نے بھی کہا کہ میں جلدی گھر آ جایا کروں گا۔ وہیں بیٹھے بیٹھے راضی نامہ ہو گیا۔ جج نے کہا میں وقتاً فوقتاً تمہارے گھر آ کر دیکھا کروں گا کہ تم لوگوں کا ایک دوسرے سے کیسا سلوک ہے۔ معلوم ہوا کہ اسی نوے فیصد صورتوں میں فیصلہ راضی نامے کی صورت میں ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں ایسا ہو تو وکیل اور ان کے دلال، رشتہ دار اور اہل کار، عرضی نویس اور وثیقہ نویس، بھوکے مریں یا دوسری نوکریاں اور روزگار ڈھونڈتے نظر آئیں۔

☆☆

شاعری کی کہیں بھی قدر نہیں

جوش صاحب کی پوتی سے ہمارے بھتیجے تک

اخبار خواتین کے ایک مضمون سے یہ معلوم کر کے بہت خوشی ہوئی کہ جناب جوش ملیح آبادی کی پوتی کو شاعری سے کوئی دلچسپی نہیں بلکہ وہ ستار بجاتی ہیں۔ ہماری خوشی یا اطمینان کا باعث یہ نہیں کہ خدانخواستہ ہم جوش مدظلہ کے مداح یا قدر شناس نہیں بلکہ یہ ہے کہ ہم اپنے بھتیجے بابر میاں سے آزردہ تھے جس کا رویہ ہماری نظم ونثر کے بارے میں کچھ اسی قسم کا ہے۔ ہم نے اس عزیز مکرم کو کئی بار اپنی آزاد نظمیں سنائیں۔ افلاطون کی مابعد الطبیعات پر لیکچر دیا۔ علم عروض اور زمانات کے نکات سمجھانے کی کوشش کی۔ افراط زر کی بحث میں الجھانے کی سعی بھی کی حتیٰ کہ ایک بار یورپ کی مشترکہ منڈی اور اس کے دوررس اثرات کو بھی موضوع بحث بنایا لیکن اس نے ہمیشہ جماہی لے کر ٹالا۔ اور اپنا گلی ڈنڈا اٹھا کر گلی میں بھاگ گیا حالانکہ وہ اب کوئی بچہ نہیں۔ اگلی ستمبر میں پورے دس سال کا ہو جائے گا۔

☆☆☆

لیکن لوگوں نے اس صورت حال سے ایک نہایت غلط رائے بھی قائم کی اور وہ یہ کہ

عزیز مذکور کی ادب عالیہ اور دقیق معاشی مسائل سے عدم دلچسپی بلکہ پڑھنے لکھنے سے گریز کی وجہ ہم خود ہیں نہ ہم اس کو ان مسائل میں الجھا کر اور بڑی بڑی اصطلاحیں بول کر ڈراتے۔ نہ وہ گلی ڈنڈے سے اتنی شیفتگی کا اظہار کرتا ایسے عیب جو نکتہ چینیوں سے کسی کو پناہ نہیں۔ کیا عجب وہ کل جوش صاحب سے بھی یہی کہیں کہ جناب اگر آپ اپنی زبان کو لغت ہائے حجازی سے اتنا گراں مایہ نہ بناتے اور سیدھی زبان میں شعر کہتے اک رنگ کا مضمون سو ڈھنگ سے باندھنے پر اصرار نہ کرتے تو آج آپ کی پوتی ادب سے اتنی دور نہ ہوتیں کہ ستار لے بیٹھتیں۔

اب رہی یہ دلیل کہ ستار بجانا کوئی بری بات نہیں ایک بڑا محترم آرٹ ہے اور جوش صاحب خضوع وخشوع سے بیٹھ کر پوتی کا الاپ سنتے ہیں تو ہم بھی انصاف کو ہاتھ سے نہ دیتے ہوئے عرض کریں گے کہ گلی ڈنڈا بھی اسپورٹس کے زمرے میں آتا ہے اور جب ہمارا لائق بھتیجا ڈنڈے سے مزے کا ٹل لگاتا ہے (ٹل کی اصطلاح جوش صاحب کیا سمجھیں گے یہ ستار یا علم موسیقی نہ باشد) تو ہم بھی واہ وا کرتے ہیں۔ اور جب میچ ہوتے ہیں تو اتنے لوگ اسپورٹس کے دیکھنے کو جمع ہوتے ہیں کہ ستار نوازی کی کسی محفل کو بھی نصیب نہیں ہو سکتے۔ اس موقع پر ہم اس امر سے بے خبر نہیں کہ بعض لوگ گلی ڈنڈے کو اسپورٹس میں شمار نہیں کرتے لیکن لوگوں کا کیا ہے وہ تو بیر کو بھی پھل نہیں گنتے۔

☆☆☆

ان مثالوں سے اس راز سے بھی پردہ اُٹھ جائے گا کہ بڑے بڑے علما فضلا کے لڑکے ڈاکٹر یا انجینئر کیوں بنتے ہیں اور بڑے بڑے نغزگو شعرا یعنی تلامیذ الرحمٰن کے صاحبزادگان کیوں تمباکو، صابون کٹ پیس بیچتے نظر آتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان حضرات کو جب بیرون در کوئی سامع نہیں ملتا اور غزل لکھی رکھی ہے لیکن کوئی مشاعرہ

ہونے کی خبر نہیں تو وہ گھر سے خیرات شروع کرنے کا اصول برتنا شروع کر دیتے ہیں۔
بس یہیں سے خرابی کا آغاز ہو جاتا ہے۔علم کوئی ایسا بار تو نہیں کہ ہر کوئی اس کا متحمل ہو سکے۔ ہمارے ایک بزرگ دیوانہ ناگوری اپنے ایک فرزند سے اپنے اشعار کی تقطیع کرایا کرتے تھے اور اپنی غزل اور قصیدے پر داد طلب کیا کرتے تھے۔ وہ گھر سے ایسا بھاگا کہ پھر واپس نہ آیا۔ دیوانہ صاحب ہمارے مشورے پر کئی بار اشتہار بھی دے چکے ہیں کہ عزیزم واپس آ جاؤ۔ اب تم کو کوئی غزل نہ سنائی جائے گی۔ لیکن کوئی مفید نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ اس کا راز حال میں کھلا۔ صاحب زادے کراچی کے ایک مشور سینما میں گیٹ کیپر ہیں اور کتاب تو ایک طرف اخبار دیکھ کر کانپنے لگتے ہیں کہ اس میں کہیں ابا میاں کی غزل نہ چھپی ہو۔

☆☆☆

ہماری نثر تو آپ لوگوں کے سامنے آتی ہی ہے۔ لیکن اگر ادارہ اخبار خواتین ہماری غزلیں چھاپنے سے صاف انکار نہ کرتا تو قارئین حضرات دیکھتے کہ شاعری میں ہمارا کیا مقام ہے۔ یہ قدرناشناسی اخبار خواتین والوں تک محدود نہیں۔ کئی بار ایسا ہوا کہ کوئی آل پاکستان مشاعرہ ہوا اور منتظمین نے ہمارا نام شاعروں کی فہرست میں دے دیا۔ اشتہار کے چھپنے کا فوری اثر ہم نے یہ دیکھا کہ مشاعرے کے ٹکٹ بکنے بند ہو گئے اور جن لوگوں نے پہلے خرید رکھے تھے انہوں نے اپنی رقم کی واپسی کا تقاضا شروع کر دیا۔ ہمیں اس صورت حال پر ہمیشہ ملال ہوتا تھا۔ لیکن ہمارے ایک ناصح مشفق نے کہا کہ بڑے آدمی کی قدر اس کے اپنے ملک میں کبھی نہیں ہوتی۔ کسی اور ملک میں جا کر کوشش کرو۔ ہمارا چین جانا ایک طرح سے اسی پلان کے تحت تھا لیکن معلوم ہوتا ہے سبھی مقولے ہمیشہ ٹھیک ثابت نہیں ہوتے۔ پیکنگ میں ڈاکٹر عالیہ امام نے ایک روز ایک محفل کا بندوبست کیا جس میں پاکستانی سفارت خانے کے کچھ افسر اور ان کی بیگمات

بھی تھیں۔ ہم نے اپنی طرف سے اپنی بہترین غزل نکال کر پڑھی۔ کسی کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ تھوتھا سا منہ بنا کر بیٹھے دیکھتے رہے۔ عالیہ بیگم نے ضرور بے دلی سے ایک بار واہ واہ کی۔ اب ہم نے ایک اور غزل عرض کی۔ اس کا نتیجہ بھی یہی نکلا۔ غزلیں تو ہم اپنی جیب میں حسب عادت بارہ چودہ لے کر گئے تھے لیکن یہ رنگ محفل دیکھ کر معذرت کر دی کہ اب کچھ یاد نہیں۔ کچھ صاحبان نے اس پر اطمینان کا سانس لیا البتہ ہمارے بالکل قریب جو بیگم صاحبہ بیٹھی تھیں ان کو کچھ ہمارا خیال ہوا اور ہمارے کان کے پاس منہ لا کر پوچھنے لگیں۔ ”غزلیں جو آپ نے پڑھیں کیا آپ کی اپنی لکھی ہوئی تھیں آپ شاعر ہیں کیا“ ہمارا خیال ہے ہم کچھ دیر اور بیٹھتے تو لوگ ہم سے جگر یا شکیل بدایونی کا کلام خوش الحانی سے پڑھنے کی فرمائش کرتے بلکہ کیا عجب ہمیں حاضرین کے پرزور اصرار پر کسی تازہ پاکستانی فلم کے گانے بھی سناتے پڑتے۔“

جانا ننھے شہزادے کا بلا رعایا کے بادشاہ کی مملکت میں

پوری داستان سے آپ کو مطلب نہ ہونا چاہیے۔ ہمارا نو عمر ہیرو یعنی ننھا شہزادہ آسمان کی وسعتوں میں ایک سیارے سے دوسرے سیارے پر اور دوسرے سے تیسرے پر زقندیں بھرتا اور سیر دیکھتا طیاروں کے ایک نئے جھرمٹ کی طرف جانکلتا ہے۔ اس جھرمٹ کے پہلے ہی سیارے پر ایک بادشاہ عالی جاہ متمکن نظر آئے' زرنگار مسند' خلعت فاخرہ' عصا تاج مرصع' اور بادشاہی کے دوسرے الابلا لوازم۔ ننھے شہزادے کو دیکھتے ہی اشتیاق سے بولے۔ ''لیجیے رعایا آ گئی۔ ایک آدمی ہی سہی۔ کوئی تو حکم کا بندہ ملا۔''

ننھا شہزادہ حیران ہوا کہ اس شخص نے تو مجھے پہلی نظر میں پہچان لیا حالانکہ اس سے پہلے کہیں مڈبھیڑ نہ ہوئی تھی۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ بادشاہوں کے نزدیک اس دنیا میں بس دو طرح کی مخلوق بستی ہے۔ ایک بادشاہ لوگ دوسرے رعایا لوگ۔ ایک حکم دینے والے' دوسرے حکم ماننے والے بادشاہ سلامت نے کہا۔ ''قریب آؤ۔ میری رعایا۔ آؤ۔ آداب بجالاؤ۔''

ننھے شہزادے نے ہر طرف نظر دوڑائی کہ کہیں بیٹھنے کی جگہ نظر آئے۔ لیکن اس چھوٹے سے سیارے پر ہر طرف بادشاہ کا زرنگار شاہی لبادہ بکھرا ہوا تھا۔ پس وہ کھڑا رہا۔ اور چونکہ تھکا ہوا تھا اس لیے اسے جماہی آ گئی۔

بادشاہ سلامت نے سختی سے ٹوکا۔ ''بادشاہوں کے حضور جماہی لینا بدتمیزی کی بات ہے' آداب شاہی کے یکسر خلاف ہے۔ میں فرمان شاہی کی رو سے تم کو منع کرتا ہوں۔''

''لیکن مجھے جماہی آ رہی ہے۔ حضور میں اسے روک نہیں سکتا۔ بادشاہ سلامت۔'' ننھے شہزادے نے کہا۔ ''بڑی دور سے آیا ہوں اور کئی دن سے سو نہیں پایا۔''

''یہ بات ہے؟'' بادشاہ سلامت نے کہا۔ ''دراں صورت میں تم کو حکم دیتا ہوں کہ جماہی لو۔ میں نے برسوں سے کسی کو جماہی لیتے نہیں دیکھا۔ جماہی لیتا آدمی بھی کیا خوب لگتا ہے۔ ہاں لیتے رہو جماہیاں رک کیوں گئے۔''

''جی جی۔ اب مجھے جماہی آ ہی نہیں رہی۔ کیسے لوں جماہی بادشاہ سلامت۔''

''ہوں یہ بات ہے۔ تب میں تم کو شاہی حکم دیتا ہوں کہ گاہے بہ گاہے جماہی لیتے رہو اور گاہے بہ گاہے منہ بند کیے رہو۔''

بادشاہ کی خود سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ کیا کہے لیکن کوئی نہ کوئی شاہی فرمان تو جاری کرنا تھا نا۔ بہ حیثیت مطلق العنان حکمران کے یہ اس کا فرض تھا۔

''کیا میں بیٹھ سکتا ہوں۔'' ننھے شہزادے نے اجازت طلب کی۔

''میں تم کو حکم دیتا ہوں کہ بیٹھ جاؤ۔'' بادشاہ سلامت نے تمکنت سے فرمایا اور عبائے شاہی کی شکنیں درست کرنے لگے۔

ننھے شہزادے کو حیرانی تھی کہ اس چھوٹے سے سیارے پر بادشاہ سلامت کس چیز پر حکم چلاتے ہوں گے۔ اس نے کہا۔ ''حضور عالی جاہ۔ جان کی امان پاؤں تو ایک سوال پوچھوں۔''

''میں تم کو حکم دیتا ہوں کہ تم مجھ سے سوال پوچھو۔'' بادشاہ سلامت نے روایتی جلال سے فرمایا۔

''حضور عالی جاہ۔ آپ کس چیز پر حکومت کرتے ہیں۔؟''

''ہر چیز پر کرتا ہوں۔'' بادشاہ سلامت نے اپنے سیارے' آس پاس کے سیاروں اور آسمان کے ستاروں کی طرف بہ یک جنبش اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''ان سب پر؟'' شہزادے نے پوچھا۔

''ہاں ان سب پر۔''

''اور ستارے آپ کا حکم مانتے ہیں۔''

''ہاں مانتے ہیں' سرتابی کی مجال نہیں۔ میں کسی کی عدول حکمی برداشت نہیں کرسکتا۔''

ہمارا ننھا شہزادہ بہت حیران ہوا کہ ستارے اور چاند اور سورج بھی اس کا حکم مانتے ہیں۔ اس نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ ''میں غروب آفتاب کا منظر دیکھنا چاہتا ہوں۔ مجھے شفق بہت بھلی معلوم ہوتی ہے۔ سورج کو حکم دیں کہ ڈوب جائے۔''

بادشاہ سلامت نے نہایت گمبھیر مدبرانہ لہجے میں کہا۔ ''کسی کو وہی حکم دینا چاہیے جس کا وہ مکلّف ہو سکے۔ حکم معقول ہونا چاہیے۔''

ننھے شہزادے نے ضد کی کہ میں تو سورج کو ڈوبتے دیکھوں گا۔

''اچھی بات ہے۔'' بادشاہ نے اپنی جنتری دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میں سورج کو حکم دیتا ہوں لیکن تم کو حالات کے سازگار ہونے کا انتظار کرنا پڑے گا۔ بس سات بج کر چالیس منٹ تک انتظار کرو تمہارے دل کی مراد پوری کردوں گا۔''

ننھے شہزادے نے پھر ایک جماہی لی۔ اس نے بادشاہ سلامت سے کہا کہ ''اب میں اجازت لیتا ہوں۔ یہاں مجھے کوئی کام نہیں رہا۔''

بادشاہ نے کہا۔ ''مت جاؤ۔ میں تم کو وزیر بنادوں گا۔''

''وزیر؟ کس چیز کا وزیر؟''۔

''وزیر انصاف''

''لیکن یہاں کوئی ہو تو اس کا انصاف کروں۔ آپ کی ولایت میں تو ایک بھی تنفس نہیں ہے۔''

''یہ تو مابدولت کو پتا نہیں ہے۔'' بادشاہ سلامت نے فرمایا۔ ''ہمیں اپنی ساری مملکت کا دورہ کرنے کا موقع نہیں ملا۔ میں بہت بڑھا ہوگیا ہوں اتنی جگہ نہیں کہ شاہی رتھ وغیرہ چل سکے۔ کوئی پالکی اٹھانے والا بھی نہیں۔ پیدل چلنے سے میں تھک جاتا ہوں۔''

''لیکن میں تو آپ کی پوری مملکت چھان پھٹک آیا ہوں۔ مجھے تو کوئی نہیں ملا جسے آپ محکوم کہہ سکیں۔''

''تو پھر تم اپنا ہی انصاف کرو۔ خود ہی مدعی' خود ہی مدعا علیہ' یہ مشکل تو ہے لیکن اگر تم اپنی منصفی آپ کرسکو تو یہ دانش مندی کی معراج ہوگی۔''

ننھے شہزادے نے کہا۔ ''عالی جاہ۔ مجھ سے یہ نہیں ہوگا۔ میں رخصت ہوتا ہوں آپ کی مملکت سے۔''

''ٹھہرو۔ ٹھہرو۔'' بادشاہ نے کہا۔ ''میرے اس سیارے پر کہیں کوئی بڈھا چوہا ہے۔ کئی بار رات کو اس کی چیں چیں کرنے کی آواز آتی ہے۔ تم اس کا انصاف کرسکتے ہو۔ گاہے بہ گاہے اسے موت کی سزا کا حکم سنا سکتے ہو۔ لیکن میری ہدایت ہے کہ ہر بار موت کی سزا کا حکم سنانے کے بعد اس کو بخش دیا کرنا تاکہ انصاف کا سلسلہ جاری رہے اور قانون کی حکمرانی قائم رہے۔''

''جی نہیں۔ میں کسی کو سزائے موت نہیں دے سکتا۔''

ننھے شہزادے نے کہا۔ ''اور اب میں چلتا ہوں۔ خدا حافظ۔''

تم نہیں جاسکتے۔ بادشاہ سلامت نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

لیکن ننھے شہزادے نے رخصت ہونے کا تہیہ کرلیا تھا۔ اس نے کہا۔ ''اگر حضور چاہتے ہیں کہ میں آپ کے حکم کی تعمیل کروں تو بہتر ہے کہ میری پسند کا حکم دیں۔ مجھے فوراً چلے جانے کا حکم دیں۔ یہ تصور کرلیں کہ اب اس کے لیے حالات سازگار ہوگئے ہیں۔'' بادشاہ سلامت نے کوئی جواب نہ دیا۔ ننھے شہزادے نے تھوڑی دیر تامل کیا۔ پھر چلنے کے لیے قدم اٹھایا۔

''میں تمہیں سفیر بناتا ہوں۔ ٹھہر جاؤ رک جاؤ۔'' بادشاہ سلامت نے فرمایا۔

ننھے شہزادے نے سوچا کہ یہ بڑے لوگ' سن رسیدہ لوگ بھی کیا عجیب عجیب باتیں کرتے ہیں۔ وہ سنی ان سنی کرتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

''سولہ لاکھ' بائیس ہزار' اور سات سو اکتیس۔''

''یہ کیا گنتی ہو رہی ہے صاحب؟'' ننھے شہزادے نے پوچھا۔ ''پچاس کروڑ کیا؟''

''ارے۔ تم کون ہو؟'' پچاس کروڑ سولہ لاکھ۔ مجھے کام کرنے دو۔ مجھے ابھی بہت حساب کتاب کرنا ہے۔ بڑا اہم حساب ہے۔ میرے پاس فضولیات کے لیے وقت نہیں ہے۔ دو اور پانچ ہوئے سات.....''

''لیکن یہ پچاس کروڑ سولہ لاکھ ہے کیا؟''

ننھے شہزادے نے پھر پوچھا۔ سوال پوچھنے کے معاملے میں وہ ڈھیٹ تھا۔

بیوپاری نے اپنا سر اٹھایا اور کہا۔ پچھلے چون سال سے میں اس سیارے پر رہتا ہوں۔ اس دوران میں صرف تین بار کسی نے مجھے تمہاری طرح ٹوکا ہے۔ دخل در معقولات کی ہے۔ پہلی بار تو آج سے اٹھائیس سال پہلے ایک بطخ کہیں سے ٹپک پڑی تھی۔ اس نے ایسی قیں قیں کی کہ میرے کھاتے میں جمع کی چار جگہ غلطیاں ہوگئیں۔ دوسری دخل اندازی آج سے گیارہ برس پہلے ہوئی۔ وہ گٹھیا کی وجہ سے۔ بات

یہ ہے کہ مجھے کسرت کرنے کی فرصت نہیں' چل پھر کر میں اپنا وقت ضائع کرنا پسند نہیں کرتا۔ اور یہ تیسری بار..... خیر ہاں تو میں کہاں تھا۔'' پچاس کروڑ سولہ لاکھ.....''

''لیکن پچاس کروڑ سولہ لاکھ کیا؟''

بیوپاری نے جھنجلا کر کہا۔'' تم تو پیچھے ہی پڑ گئے۔ میرا مطلب ان چھوٹی چھوٹی چیزوں سے ہے' وہ جو آسمان پر چمک رہی ہیں۔''

''مکھیاں؟''

''ارے نہیں۔ مکھیاں بھی کوئی چمکتی دمکتی ہیں.....''

''جگنو۔''

''ارے نہیں۔ جگنو وغیرہ بھی نہیں۔ جگنو کسی کے کیا کام آسکتا ہے؟ یہ تو شاعروں واعروں کے کام کی چیز ہے۔ وہ دیکھو وہ۔''

''آپ کا مطلب ستاروں سے ہے۔''

''ہاں ہاں ستارے۔''

''اور آپ پچاس کروڑ ستاروں کا کیا کرتے ہیں۔ آپ کے کس کام آتے ہیں؟''

''صرف پچاس کروڑ نہیں بلکہ پچاس کروڑ سولہ لاکھ' سات سو اکتیس۔ حساب کتاب میں اوٹ پٹانگ باتیں نہیں چلتیں۔''

''آپ ان ستاروں کا کیا کرتے ہیں؟''

''میں ان ستاروں کا کیا کرتا ہوں؟''

''جی ہاں۔ میں یہی پوچھ رہا ہوں۔''

''کچھ بھی نہیں۔ میں ان کا مالک ہوں یہ میری ملکیت ہیں۔''

''کیا یہ سارے ستارے آپ کے ہیں۔''

''ہاں۔''

''لیکن مجھے ایک بادشاہ ملا تھا جو.....''

''بادشاہ لوگ مالک نہیں ہوا کرتے وہ تو بس حکمران ہوتے ہیں۔ دونوں باتوں میں بہت فرق ہے۔''

''لیکن اتنے سارے ستاروں کا مالک ہونے سے فائدہ؟''

''واہ فائدہ کیوں نہیں۔ میری دولت بڑھتی ہے۔ میں امیر ہوتا ہوں۔''

''لیکن امیر ہونے سے آپ کو کیا فائدہ پہنچتا ہے!''

''امیر ہونے سے میں مزید ستارے خرید سکتا ہوں۔ جو دریافت ہوں۔''

ننھے شہزادے نے دل ہی دل میں کہا۔ یہ شخص بھی اس شرابی کی طرح نامعقول ہے تاہم اس نے سوال پوچھا۔

''کوئی آدمی ستاروں کا مالک کیسے ہو سکتا ہے۔''

بیوپاری نے اس کے جواب میں پوچھا۔ ''تمہارے خیال میں یہ کس کی ملکیت ہیں؟''

''مجھے تو معلوم نہیں۔ میرا تو خیال ہے کسی کی ملکیت نہیں۔''

''پھر تو یہ میرے ہوئے۔ اس لیے کہ سب سے پہلے ان کو ملکیت بنانے کا خیال مجھے سوجھا۔''

''بس؟ اتنا ہونا کافی ہے۔''

''کیوں نہیں خود ہی سوچو اگر تمہیں راہ چلتے ایسا ہیرا ہاتھ لگتا ہے جو کسی اور کا نہ ہو تو وہ تمہارا ہوا۔ کوئی ایسا خیال سوجھتا ہے جو کسی اور کو نہ سوجھا ہو۔ تو وہ بھی تمہارا ہوا۔ یہی مثال میری ہے۔ سب سے پہلے ان ستاروں کو اپنی ملکیت بنانے کا خیال مجھے آیا۔ کسی اور کو نہیں آیا۔''

''یہ تو سچ ہے۔'' ننھے شہزادے نے کہا۔ ''لیکن آپ کے کس کام آتے ہیں۔ ان کا

مصرف کیا ہے۔''

''بس وہ میرے ہیں، میں ان کی گنتی کرتا ہوں۔ ان کا حساب رکھتا ہوں.... کوئی معمولی بات نہیں۔ اتنے ستاروں کا مالک ہونا۔''

ننھے شہزادے کا پھر بھی اطمینان نہ ہوا۔ اس نے کہا۔

''فرض کیجئے میرے پاس ایک ریشمی گلوبند ہے۔ اسے میں گردن کے گرد لپیٹ سکتا ہوں جہاں چاہوں ساتھ لے جا سکتا ہوں۔ اگر میں کسی پھول کا مالک ہوں۔ تو اسے توڑ سکتا ہوں جہاں چاہوں ساتھ لے جا سکتا ہوں۔ لیکن آپ ستارے تو آسمان سے نہیں توڑ سکتے۔''

''یہ ٹھیک ہے۔ لیکن میں ان کو تجوری میں تو بند کر سکتا ہوں۔''

''کیا مطلب۔'' ننھے شہزادے نے حیران ہو کر پوچھا۔

''اس کا مطلب یہ ہے کہ میں ان کا شمار کر کے ایک کاغذ پر لکھ لیتا ہوں کہ یہ اتنے ہیں۔ اور اس کاغذ کو تجوری میں بند کر کے تالا لگا سکتا ہوں۔''

''بس؟''

''یہ تھوڑا ہے۔''

''یہ بھی اچھی رہی۔'' ننھے شہزادے نے دل ہی دل میں کہا۔ ''لیکن فائدہ؟'' ننھے شہزادے کا کسی چیز کے مفید ہونے کا پیمانہ بڑی عمر کے لوگوں سے مختلف تھا۔ اس نے کہا۔

''یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ نہ ستارے آپ کے کام آ سکتے ہیں نہ آپ ستاروں کے کام آ سکتے ہیں۔ پھر بھی آپ ان کی ملکیت پر خوش ہیں۔''

ستاروں کا مالک چپ رہا۔ اس کی سمجھ میں ننھے شہزادے کی بات نہ آ رہی تھی۔ ننھا شہزادہ حیران آگے چل دیا۔ پانچویں سیارے کی طرف۔

☆☆☆

ہے ہے مرا باغ لے گیا کون؟
ہم نے سواری بیچنے کے لیے مانگی تھی

اس شہر میں دو طرح کی مخلوق ہے۔ آدھے لوگ مکاندار ہیں' آدھے کرایہ دار۔ اس حساب سے ہم تین میں نہ تیرہ میں۔ یہ کہاں ہماری قسمت کہ کرایہ دار ہوتے۔ ہر نئے مہینے مکاندار کی چھاتی پر چڑھ بیٹھتے کہ "مکان میں سفیدی کرا۔ نل میں نئی ٹونٹی لگوا۔ غسل خانے بنا کے دے۔ مکاندار بھی ان معنوں میں نہیں کہ کوئی کرایہ دار نہیں رکھتے جس کو یہ دھونس دے کر اپنی خودی بلند کرتے رہیں کہ "او میاں۔ اگر میرے مکان کی کسی دیوار میں کیل ٹھونکا تو دیکھنا۔ سفیدی کا ذکر مت چھیڑ۔ ابھی تو دس سال بھی نہیں ہوئے سفیدی کرائے۔ بس کرایہ لا ورنہ ابھی تیرا سامان باہر پھینکتا ہوں۔"

دراصل ہمارا مکان ہمارا ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے، قرض لے کے بنایا تھا لہٰذا اپنی تنخواہ میں تہائی کا۔ ہو گیا ہے۔ شریک ساہوکار مہینے کے مہینے ہاؤس بلڈنگ کارپوریشن کو قسط دیتے ہیں۔ بارہ تیرہ برس اور دیتے رہیں گے۔ مول جدا۔ سود جدا۔ نہ دیں گے تو مکان قرق کرا سکتا ہے، باریں ہمہ جب ہم مکان میں آئے تو بہت خود پسند تھے۔ پہلی بار کسی چیز کے مالک بنے تھے نا؟ کوٹھے پر چڑھ کر آواز لگائی۔

ہم ہیں مالک اس مکان کے۔ ہے کوئی اس جائیداد کا ٹیکس لینے والا۔ کئی آدمی دوڑے آئے۔ ایک میونسپل کارپوریشن کا۔ ایک کے ڈی اے کا۔ ایک شاید ایکسائز کا تھا۔ ایک نے کہا۔ "ہم لیں گے۔ تم ہماری رعایا ہو"

دوسرا بولا۔ "جی نہیں' ہمیں دو۔ یہ عملداری ہماری ہے"

تیسرے نے کہا۔ "ہم بھی ہیں پانچویں سواروں میں۔ آپ کے قیمتی ٹیکس کے طلب گار"

ہم نے کہا۔ "صاحبو۔ ہم صفائی ٹیکس بھی دینے کو تیار ہیں" اس پر کے ڈی اے اور کارپوریشن والے بیک وقت بولے "نکالو پیسے۔ یہ ہمارا حق ہے۔"

اب ہم نے کہا۔ "پانی کا ٹیکس بھی تیار ہے۔ بہت پیسے والے ہیں ہم۔"

اس پر تو دونوں باقاعدہ الجھ پڑے کہ اس کے حقدار ہم ہیں۔ اب ہم نے چلا کر اعلان کیا۔

"ارے ہمارے محلے میں جھاڑو کون دیگا۔ ہماری ٹنکی میں پانی کون چھوڑے گا۔ روشنی کے کھمبے کون گاڑے گا۔ سڑکیں کون بنائے گا۔"

اس پر ان میں ایثار کا مادہ عود کر آیا۔ بولے۔ "لوگو۔ کوئی اور بھی تو بولے، ہم کہاں تک بولتے رہیں۔"

☆☆☆

لیکن اُدھر نظم و نسق کی تطہیر اور معاشرے کو آلائشوں سے پاک کرنے کی مہم شروع ہوئی۔ اور یہ محکمے بھی کلمہ پڑھتے منہ پر ہاتھ پھیرتے جماہیاں لیتے اٹھے۔ یہ پوچھتے ہوئے کہ "یہ کونسی صدی ہے۔" کارپوریشن والے خود اٹھے۔ اپنے جمعداروں کو جگایا۔ وہ بچارے مشق نہ ہونے کے باعث صفائی کا کام بھول گئے تھے۔ ان کو نئے سرے سے جھاڑو لگانا سکھایا گیا۔ کچھ لوگ بازار کی طرف دوڑے کہ اب اٹھاؤ۔ یہ خوانچہ

یہاں کیوں لگا رکھا ہے۔ اے میاں جالی کے بغیر گوشت اور دہی بیچ رہے ہو؟ ہم نے خدا کی قسم آج دیکھا ورنہ کبھی اجازت نہ دیتے اے مسٹر دکاندار! یہ کیا چھجہ نکال رکھا ہے۔ اپنی کھال میں رہ۔

"حضور دھوپ سے بچنے کے لیے ذرا سا سایہ کر لیا ہے۔"

"نواب کا بچہ۔ دھوپ لگتی ہے۔ ہٹا اس ٹین پاٹ کو۔"

☆☆☆

ہم نے یہ کرامت دیکھی اور قائل ہو گئے کہ ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنندہ۔ فوراً حضرت مولانا تنبیہہ الغافلین عرف ڈنڈا پیر کے ہاتھ پر بیعت کی کہ ڈنڈا پیر ہے۔ بگڑیاں تگڑیاں دا۔ یہ کرامت نہیں تو اور کیا ہے کہ دیواریں چھاپنے والے ان محکموں کی آنکھوں کے سامنے دیواریں چھاپتے تھے اور پھر انہی دیواروں کے سایے کو اپنی ضروری اور غیر ضروری حاجات سے مشرف کرتے تھے۔ اب یکایک ان محکموں کو احساس ہوا کہ یہ تو بُری باتیں ہیں۔ رفتہ رفتہ بقول حفیظ جالندھری۔ ہر بری بات بری بات نظر آنے لگی۔

چند روز پہلے تک بسوں کا دھواں ہرگز مضر صحت نہ تھا۔ مشام جاں کو تازہ کرتا تھا۔ مگر اب شہریوں کی صحت کے لیے خطرناک ہو گیا۔ ۲۶ مارچ کو ہمارے گھر میں پہلی بار دودھ پر بالائی آئی۔ دو تین دن میں ہمیں بھی خیال آیا کہ ہاں بھئی۔ پڑھائی بھی ہونی چاہیے کہ بے علم نتواں خدا شناخت۔ اگر ہماری آنکھوں میں سرمہ سلیمانی سلائی نہ لگائی جاتی تو یہ ساری حقیقتوں کے دفینے ہمیں کیسے نظر آتے۔ ایسے میں جانے کون تھا جس نے بلدیہ سے جا مخبری کی کہ ناظم آباد کے علاقے میں کچھ لوگوں نے اپنے گھروں کے سامنے خالی جگہ میں کہیں کہیں گھاس لگا رکھی ہے۔ شام کو اس پر کرسی بچھا کر بیٹھ جاتے ہیں۔ بعضوں نے تو پھولوں کے پودے بھی لگا رکھے ہیں۔ در در دیوار پر سبزہ اگ رہا

ہے۔ اٹھو ورنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی۔ پہلے تو کے ایم سی والوں کو یقین نہ آیا کہ ان کے دور میں ایسا اندھیر ہو سکتا ہے۔ ان کا تو حکم تھا کہ سارے شہر میں سوائے خاک کے کچھ نہ اڑے اور سوائے کتوں کے گلیوں میں کوئی آزادانہ نہ گھومے، نہ کسی کو کاٹے، اب احساس فرض جو جاگا تو ان کو سب جگہ ہرا ہی ہرا نظر آنے لگا۔ فوراً پیادے دوڑے کہ اکھاڑو پودے۔ کھودو گھاس۔ خبردار جو کوئی تنکا بھی ہریالی کا تمہارے گھروں کے سامنے نظر آیا۔ یہ تمہارے باوا کی جگہ ہے جو یوں گل کھلا رکھے ہیں۔ اپنے باورچی خانے میں یا غسل خانے میں جو چاہے کاشت کرو۔ ہم منع نہیں کرتے بشرطیکہ اس میں پانی نہ دو۔ پانی کا توڑا ہے۔ اور یہ توڑا صرف ناظم آباد کے پودوں کی وجہ سے ہے۔ دوسری سوسائٹیوں کے امراء تو اپنے باغیچوں کو ڈرائی کلین کراتے ہیں۔

☆☆☆

تو کون میں خواہ مخواہ.... ہمارے گھر کے باہر نہ کوئی تجاوز نہ کوئی گھاس پات۔ ایک پارک ضرور سامنے ہے اور اس میں شک نہیں کہ اس کے ایک کونے میں کچھ گھاس وغیرہ ہے۔ کچھ پودے بھی ہیں لیکن یہ کے ڈی اے کا ہے۔ ان لوگوں کو پکڑ لیجئے اور مرغا بنائیے۔ ہماری بلا سے۔ ہمیں درد یوں اٹھا کہ ناظم آباد ہمارا قریبی ہمسایہ ہے۔ ہم سرود خانہ ہمسایہ سے کہاں تک بے بہرہ بلکہ بہرہ رہ سکتے ہیں۔ آج کل اس علاقے میں جدھر جائیے لوگ گل بکاؤلی کی مثنوی پڑھتے دکھائی دیتے ہیں۔

کون گیا لے باغ مرا ہے ہے
کون گیا دے داغ مجھے ہے ہے
لانا تازیانہ مرا سنبل
چڑھانا پر دار اسے سوسن

سبزہ ہماری کمزوری بھی ہے۔ پودے ہوا کی عفونت اور طبیعت کی خشونت دور کرتے

ہیں۔ مسلمان اس ملک میں آئے باغ لگاتے گئے۔ ہندو تو پتھر کی مورتیاں، پتھر کے مندر اور پتھر کے فرش بنانے کے علاوہ کچھ نہ جانتے تھے۔ مسلمان تو خود اپنی طبیعت میں باغ و بہار ہوتا ہے۔ گلرخوں کو دیکھ کر ہم جیتے ہیں سروقدوں کے سائے میں جی کی ٹھنڈک پاتے ہیں۔ سبزہ پسند کرنے کی کئی وجہیں ہیں۔ کچھ اس لیے کہ آنکھوں میں تراوٹ آتی ہے۔ کچھ اس لیے کہ پاکستان کا قومی رنگ سبز ہے اور کچھ اپنی شاعری کے حوالے سے۔

تو بھی ہرے دریچے والی، آجا، برسر بام ہے چاند
ہر کوئی جگ میں خود سا ڈھونڈے۔ تجھ بن بے آرام ہے چاند

مسافر غریب ایک رستے میں تھا۔ پیدل تھک گیا تو دعا کی کہ یا خدا سواری عنایت کر۔ یکا یک ایک سوار کہیں سے نمودار ہوا۔ اس کے ساتھ ایک الل بچھیرا بھی تھا۔ اس نے مسافر کے ایک کوڑا رسید کیا اور کہا اے شخص یہ بے زبان تھک گیا ہے۔ اسے اپنے کاندھے پر اٹھا اور میرے پیچھے پیچھے چلا آ۔ اس نے کہا واہ بھئی وا سخن فہمی عالم بالا معلوم شد۔ سواری مانگی تھی۔ نیچے کے لیے۔ مل گئی اوپر کے لیے۔ خیر اس میں تو مسافر کا قصور تھا اس نے دعا ہی مبہم الفاظ میں مانگی تھی۔ اوپر نیچے کی تخصیص نہ کی تھی۔ لیکن ہم نے تو اس روز کے کالم میں بالوضاحت لکھ دیا تھا کہ جمعدار لوگ ہمارے محلے میں کوڑا سڑک پر پھیلا کر پھینکتے ہیں۔ ہے کوئی والی وارث اس محلے کا۔ تلافی کی بھی ظالم نے تو کیا کی۔ ٹیلیویژن پر اشتہار دے دیا کہ شہر کی صفائی میں بلدیہ کا ہاتھ بٹائیے۔ اچھا بھئی ہم تیار ہیں۔ اے میاں ابراہیم جلیس۔ اے حضرت! انعام درانی صاحب۔ نصر اللہ خاں ہوت۔ اور یا ارشاد احمد خاں۔ اٹھاؤ اپنی اپنی ٹوکریاں اور لگاؤ کارپوریشن کے دفتر کے سامنے جھاڑو۔

☆☆☆

رپورٹ پٹواری مفصل ہے!

قصہ عیدو ولد غنی سکنہ روڈ و سلطان کا

دوسرے روز میاں مچھر خاں ذرا سویرے ہی آن وارد ہوئے۔ مونچھوں کو تیل لگائے۔ بھن بھن کرتے چونچال۔ کھانے کی میز پر بیٹھے تھے۔ صلح ماری کہ آؤ خان صاحب۔ کچھ چکھوتیاں ہو جائیں۔

ڈکار لے کر بولا۔ جی نہیں۔ بسم اللہ کیجیے۔ یہ جو آپ کے گھر کے سامنے پارک کے کونے پر کوڑے کا ڈھیر ہے وہیں سے اٹھ کر آیا ہوں۔

ہم نے کہا۔ ارے وہ ڈھیر کسی نے ابھی اٹھایا نہیں؟ ہم تو دو کالم لکھ چکے۔ تمہیں معلوم ہے اخبار نویسوں کے قلم میں بڑا زور ہوتا ہے۔

ہنسا اور بولا! آپ قلم کے بجائے جھاڑو چلاتے تو زیادہ اچھا ہوتا۔

ہم نے کہا۔ اس میں عذر نہیں لیکن ہم صفائی ٹیکس دیتے ہیں۔ خود یہ کام کرنے لگے تو ٹیکس کس کو دیں گے۔

بولا۔ میں تو سوچتا ہوں۔ یہیں آن بسوں۔ باقی سب بستیوں میں کارپوریشن والے گشت لگاتے ہیں۔ ادھر کوئی داروغہ صفائی آتا نہیں دیکھا۔ یہاں پانی کا جوہڑ بھی

ہے۔بقیہ عمر اسی گوشہ عافیت میں گزاروں۔‘‘

ہم نے کہا’’چشم ما روشن دل ما شاد۔ تیرے بھائی بند پہلے ہی بہت ہیں۔ شب بھر ’’عقیدت‘‘ یعنی قوالی کا پروگرام ہوتا ہے۔ ویسے ہم رپورٹ کرنے والے ہیں۔ داروغہ صفائی کی‘‘۔

بولا’’کس کے پاس کریں گے۔‘‘

ہم نے کہا’’جو بھی بڑے سے بڑا افسر ہوگا‘ اس کے سامنے کریں گے۔‘‘

بولا’’یہ آج کل میں ایڈمنسٹریشن کی تطہیر یعنی صفائی دھلائی ہوگی۔ ذرا اس کا انتظار کر لیجئے ورنہ۔’’رپورٹ پٹواری مفصل ہے‘‘۔ کا سا حشر ہوگا۔‘‘

ہم نے کہا’’یہ کیا چیز ہے۔‘‘

بولا۔’’قدرت اللہ شہاب کا افسانہ ہے بلکہ واقعہ ہے جو انہوں نے جھنگ کی ڈپٹی کمشنری کے زمانے میں لکھا تھا۔‘‘

ہم نے کہا’’بھئی بڑا پڑھا لکھا مچھر نکلا تو تو۔ حیرت ہے پڑھ لکھ کر بھی لوگوں کو کاٹتا ہے۔ ملیریا پھیلاتا ہے۔‘‘

بولا’’آپ نے وہ فلم نہیں دیکھی جس میں ایک آدمی کہتا ہے۔’’چوری میرا پیشہ ہے۔ نماز میرا فرض ہے۔‘‘ میرا مطالعہ اپنی جگہ۔ کاٹنا اپنی جگہ۔‘‘

اس پر ہمیں یاد آیا کہ پڑھے لکھے انسان بھی تو کاٹتے ہیں بلکہ بے پڑھے لکھوں سے زیادہ کاٹتے ہیں۔ دلیلیں دے دے کر کاٹتے ہیں۔ پس ہم نے کہا۔ اچھی بات ہے۔ حکایت کو مختصر کر کے بیان کر۔

نصیحت کرنے لگا کہ آپ کا فرض تو بطور ادیب کے یہ ہے کہ اپنے قلم سے اس نیک مشن کو تقویت پہنچائیں‘ نیک کام میں حکومت کے ہاتھ مضبوط کریں۔ آپ جیسے روشن خیال لوگوں نے اپنا فرض نہ ادا کیا تو افسر شاہی اور دفتر شاہی اور فائل شاہی یونہی قائم

رہے گی۔

ہم نے کہا اپنا فرض ہم بخوبی جانتے ہیں۔ نصیحت کا دفتر تہہ کر۔ اپنا قصہ کہہ۔ اور زیادہ نمک مرچ مت لگا۔ پچھلی بار تو نے غلام عباس کی کہانی کو زیادہ ہی نمکین بنا دیا تھا۔

بولا۔ جی اب کے احتیاط رکھوں گا۔ مصنف کی زبان ہی میں کہانی کہوں گا۔

’’سنیئے.....ایک تھا کسان۔ عیدو ولد غنی نام۔ سابق سکنہ موہن ماجرہ۔ تحصیل روپڑ ضلع انبالہ۔ پاکستان بنا تو وہ موضع روڈو سلطان تحصیل شور کوٹ ضلع جھنگ میں آن آباد ہوا۔‘‘

’’ہوں۔‘‘ ہم نے ہونکارا بھرنا شروع کیا۔

’’اس نے ایک عرضی لکھی اور درجہ بدرجہ لاٹ صاحب وزیر اعلیٰ۔ وزیر بحالیات۔ فنانشل کمشنر اور ڈپٹی کمشنر کو بصیغۂ رجسٹری ارسال کی۔ مضمون واحد تھا۔ جناب عالی۔ فدوی مہاجر ہے۔ دس ایکڑ اراضی چاہی و بارانی کا مالک تھا۔ کلیم فارم داخل کیا۔ کسی دفتر میں گم ہو گیا۔ فدوی نے عذرداری کر رکھی ہے۔ ابھی تک سنٹرل ریکارڈ آفس سے جواب نہیں آیا۔ موضع روڈو سلطان میں فدوی کو تین ایکڑ اراضی عارضی طور پر الاٹ ہوئی تھی۔ فدوی چار سال سے اس پر قابض ہے اور فصل کاشت برداشت کرتا ہے۔ فدوی لگان بھی باقاعدہ ادا کرتا ہے۔ لیکن اب پٹواری حلقہ بہ طمع نفسانی یہ زمین اپنے ایک قریبی عزیز کو الاٹ کر رہا ہے۔ جناب عالی۔ فدوی کی الاٹمنٹ ٹوٹ گئی تو فدوی کا کنبہ فاقوں سے مر جائے گا۔ التماس بحضور یہ ہے کہ فدوی کا عارضی رقبہ تا تصفیہ عذر داری بحال رکھا جائے۔ فدوی تازیست حضور انور کی جان و مال کو دعائیں دے گا۔

ہم نے کہا۔ یہ تو بڑی پُر درد درخواست ہے۔ اس پر کیا کارروائی ہوئی۔

میاں مچھر خاں نے سلسلہ کلام یوں جوڑا۔ لاٹ صاحب کے دفتر نے وزیر اعلیٰ کو لکھا کہ درخواست پر مناسب کارروائی کی جائے۔

وزیر اعلیٰ نے کمشنر کو لکھا۔ کمشنر نے ڈپٹی کمشنر کو لکھا۔ دوسرے افسروں نے بھی ان
درخواستوں پر یہی ضابطے کی کارروائی کی یعنی نیچے بھیج دیا حتیٰ کہ ڈپٹی کمشنر کے پاس چھ
درخواستیں بغرض مناسب کارروائی جمع ہو گئیں۔ سو گئے آپ؟

ہم نے کہا۔ ''نہیں سن رہے ہیں۔ تم کہے جاؤ۔''

ڈپٹی کمشنر کے مسل خواں نے ان سب درخواستوں کو اکٹھا کر کے نوٹ لکھا۔

''درخواست ہاذا بطلب رپورٹ بخدمت افسر مال صاحب مرسل ہوں۔ ڈپٹی کمشنر
نے فوراً اس پر اپنے دستخطوں کی چڑیا بٹھائی۔

''مال افسر نے تحقیقات کی ہو گی پھر۔؟''

جی ہاں کی۔ انہوں نے لکھا۔ ''درخواست ہائے ہذا بطلب رپورٹ بخدمت جناب
تحصیل دار صاحب مرسل ہوں....''

تحصیل دار صاحب نے فرمایا۔ ''درخواست ہاذا بطلب رپورٹ بخدمت جناب
نائب تحصیل دار صاحب مرسل ہوں۔''

نائب تحصیل دار نے لکھا۔ ''درخواست ہاذا بطلب رپورٹ بنام قانون گو علاقہ
مرسل ہوں۔''

قانون گو صاحب نے حکم دیا۔ ''درخواست ہاذا بطلب رپورٹ بجانب پٹواری حلقہ
ہذا مرسل ہیں!''

بالآخر ساری درخواستیں بطلب رپورٹ اسی پٹواری کے پاس پہنچ گئیں جو عیدو ولد غنی
کے الاٹمنٹ کو بہ طمع نفسانی منسوخ کرنے کے درپے تھا۔

قصہ دلچسپ ہوتا جا رہا تھا۔ ہم نے کہا۔ پٹواری نے ڈر کر فوراً الاٹمنٹ عیدو کے نام
پکی کی ہو گی۔ یہ لوگ لاتوں کے بھوت ہیں۔ لاٹ صاحب تک معاملہ پہنچا تھا نا۔

میاں مچھر خاں نے سنی ان سنی کر کے حکایت جاری رکھی۔

''پٹواری صاحب نے درخواستوں کا بنڈل اپنے رجسٹر میں نتھی کیا اور ہفتے عشرے
کے بعد عیدو کو طلب فرما کر یہ پلندہ اس کے منہ پر دے مارا۔

عیدو کی آنکھیں لاٹ صاحب۔ وزیر اعلیٰ۔ وزیر مہاجرین۔ کمشنر۔ ڈپٹی کمشنر بہادر
وغیرہ کی کرسیوں کو پٹواری کی چارپائی سے بندھا دیکھ کر کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ پٹواری
صاحب نے عیدو کو چند نا قابل اشاعت اور مرغن گالیوں سے نوازا اور جوتے لگوا کر گھر
واپس بھیج دیا۔

''ختم ہوئی کہانی....؟''

مچھر خاں نے کہا' جی نہیں۔ ابھی باقی ہے۔ عیدو ہر دوسرے تیسرے روز تحصیل اور
ضلع کے دفتروں میں جاتا اور گھرکیاں جھڑکیاں اور دھکے کھا کر لوٹتا حتیٰ کہ اس کے
برتن اور بیوی کے زیور بک گئے۔ اب بیلوں کی باری تھی لیکن پٹواری صاحب نے
بروقت فیصلہ کر کے عیدو کو اس افتاد سے بچا لیا۔

''یعنی اس کی زمین اس کے پاس رہنے دی۔'' ہم نے کہا۔

''آپ سنتے جایئے جناب۔ پٹواری نے عیدو کی زمین منسوخ کر کے اپنے عزیز نور
بخش کے نام تجویز کر دی اور درخواستوں پر رپورٹ لکھی۔ ''جناب عالی۔ مسمی عیدو کی
جملہ درخواست ہا کی مکمل پڑتال ہوئی۔ ظاہر ہوا کہ سائل فضول درخواست ہا دینے کا
عادی ہے۔ اسے متعدد بار سرزنش کی گئی کہ اس طرح حکام اعلیٰ کا قیمتی وقت ضائع کرنا
درست نہیں۔ وہ نہیں مانا۔ سائل کا چال چلن بھی مشتبہ ہے۔ اس کا اصلی ذریعہ معاش
فرضی گواہیاں دینا ہے مشرقی پنجاب میں اس کے پاس کوئی اراضی نہیں تھی۔ اسی وجہ
سے اس کے کلیم فارم اب تک تصدیق نہیں ہوئے۔ چنانچہ کھیوٹ نمبر ۱۳ مقدمہ نمبر ۲۵
موضع روڈو سلطان میں تین ایکٹر متروکہ زمین جس پر سائل کا ناجائز قبضہ تھا اس کے نام
سے منسوخ ہو کر مسمی نور بخش کے نام بردیت قانون رائجہ باضابطہ کنفرم ہو چکی ہے مسمی

نور بخش ضلع ہوشیار پور کا مہاجر اور سابق سفید پوش ہے۔ اس کے مصدقہ کلیم فارم بھی موصول ہو چکے ہیں۔ چنانچہ متروکہ اراضی ہذا اس کے نام الاٹ کر کے اس کی حق رسی کر دی گئی ہے۔ نیز آنکہ مسمی نور بخش نیک چلن اور با عزت مہاجر ہے اور جملہ کارہائے سرکار میں ہر وقت مستعد اور امدادی ہے۔ خاکسار کی رائے میں افسران بالا کی خوشنودی اور موضع روڈ و سلطان کی نمبرداری کا مستحق ہے۔ رپورٹ ہذا بمراد حکم مناسب پیش حضور انور ہے۔

قانون گو نے لکھا۔ ''رپورٹ پٹواری مفصل ہے۔ بمراد حکم مناسب بحضور نائب تحصیل دار صاحب پیش ہو۔''

نائب تحصیل دار نے لکھا۔ ''رپوٹ پٹواری مفصل ہے۔ بمرادِ حکم مناسب بخدمت جناب تحصیل دار صاحب پیش ہو۔''

تحصیل دار صاحب نے لکھا۔ ''رپورٹ پٹواری مفصل ہے۔ بمرادِ حکم مناسب بخدمت جناب افسر مال بہادر پیش ہو۔''

صاحب افسر مال بہادر نے لکھا۔ ''رپورٹ پٹواری مفصل ہے۔ بمراد حکم مناسب صدر میں پیش ہو۔''

صدر کے مسلخواں نے حکم لکھا۔ ''رپورٹ پٹواری مفصل ہے۔ درخواست ہا مسمی عیدو فضول ہیں۔ داخل دفتر کی جائیں۔ مسمی نور بخش کے کاغذات بوقت انتخاب نمبرداراں برائے موضع روڈ و سلطان صدر میں پیش کئے جائیں۔ تاکیدی احکامات برائے افسر مال جاری ہوں۔''

اس پر بھی ڈپٹی کمشنر بہادر نے اپنے دستخطوں کی چڑیا بٹھائی اور یہ معاملہ بخیر وخوبی انجام کو پہنچا۔

☆☆☆

ہم نے کہا۔ دیکھو میاں مچھر۔ قدرت اللہ شہاب صاحب افسانہ نگار آدمی۔ ایڈمنسٹریشن کے رموز کیا جانیں۔ اگر اعلیٰ افسران ماتحت عملے پر کلی اعتماد نہ کریں گے تو لوگوں پر رعب کیا رہے گا۔ حکومت کی گاڑی رک جائے گی۔ اسی لیے افسران بالا پر فرض ہوتا ہے کہ اپنے ماتحتوں کی پیچ کریں۔ ان کی بات کو سند مانیں۔ ہرا یرے غیرے درخواست گزار کو منہ نہ لگائیں۔

مچھر خان بولا۔ لیکن اس ضابطے کی چکی میں عیدو ولد غنی تو بے گناہ پس گیا نا۔

ہم نے کہا۔ ہمیں تو اس کہانی میں کوئی خاص بات نظر نہیں آئی۔ عیدو کا کلیم تصدیق نہیں ہوا تھا' اس کی اراضی چھن گئی۔ نور بخش ایک با عزت مہاجر تھا اس کی حق رسی ہوگئی۔ دودھ کا دودھ پانی کا پانی۔

بولا۔ با عزت ہونے کے علاوہ وہ پٹواری صاحب کا رشتہ دار بھی تو تھا۔ ہم نے کہا۔ ''تمہارا کیا مطلب ہے۔ اگر کوئی کسی بڑے آدمی کا رشتہ دار ہے تو اسے ترقی کرنے کا حق نہیں؟ الاٹمنٹ۔ لائسنس۔ جاگیر۔ کارخانے سے محروم رکھا جائے؟ یہ تو کچھ انصاف نہ ہوا۔

بہت ناخوش ہوا۔ بولا۔ آپ جیسے آدمی سے بات کرنے کا کچھ فائدہ نہیں۔ آپ جیسوں کے مشوروں نے تو ملک تباہ کر دیے۔ بادشاہیاں غارت کر دیں۔ میں آپ کے بجائے اپنی بین کسی بھینس کے آگے بجاتا تو اس پر زیادہ اثر ہوتا۔ خدا حافظ۔

ہم نے کہا۔ ارے خان صاحب۔ ایک بات تو سنو۔

بولا جی نہیں۔ آپ کو سلام ہے۔ میں جاتا ہوں مچھر کالونی واپس۔

☆☆☆

بچ موڑ توں...... ہفتہ ٹریفک شروع ہو گیا!

یہ زیادہ نہیں تو قیامت تک تو جاری رہنا ہی چاہیے!

ہفتہ ٹریفک شروع ہو گیا۔ چشم ما روشن دلِ ما شاد ایسے ہفتے جو وقتاً فوقتاً ہمارے ملک میں ہوتے رہتے ہیں بہت کامیاب اور مؤثر ثابت ہوتے ہیں۔ انسداد گداگری کا ہفتہ ایک بار منایا گیا تھا۔ اس سختی سے کہ کوئی اللہ تعالیٰ سے کچھ مانگنے کے لیے دستِ دعا بھی بلند کرتا تھا تو پولیس والے اس میں ہتھکڑی ڈال دیتے تھے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ آج پورے شہر میں آپ کو کوئی گداگر نظر نہ آئے گا، بشرطیکہ آپ نے اپنی آنکھوں پر پٹی باندھ رکھی ہو۔ ویسے مستثنیات تو ہر جگہ ہوتی ہیں۔ اس معاملے میں بھی اگر آٹھ دس ہزار مستثنیات ہوں تو کچھ خیال نہ کرنا چاہئے۔ پھر ہفتہ باغبانی منایا گیا۔ یعنی ہفتہ امتناع باغبانی۔ کیونکہ لوگوں کے باغیچوں میں پانی بہت مرتا تھا۔ گل، بوٹوں، گھاس اور سبزے کا صفایا ہونے کے بعد، اور جگہ کی تو ہم نہیں کہہ سکتے، ناظم آباد اور نارتھ ناظم آباد میں پانی کی وہ فراوانی ہوگئی ہے۔ وہ فراوانی ہوگئی ہے کہ یہ ہفتہ منانے والے خود شرم سے پانی پانی ہوگئے ہوں گے۔ نل ہیں کہ ایک پل تھمتے ہی نہیں۔ گھر میں سیلاب سا آیا رہتا ہے۔ کیا ہے زمین فلک پہ ہے پانی کمر کمر۔ پھر بس والوں نے خوش اخلاقی کا ہفتہ منایا۔ سو کنڈکٹر لوگ ایسے نستعلیق ہوگئے ہیں کہ عرائض نویسوں کی زبان میں باتیں

کرتے ہیں۔

"حضور فیض گنجور۔ کیا فدوی یہ التماس کرنے کی جسارت کرسکتا ہے کہ آپ ٹکٹ کر عنداللہ ماجور ہوں۔"

"اے جناب عالی مقام دام اقبالہ طالعمرہٗ۔ فٹ بورڈ سے ہٹ کے کھڑے ہوں۔"

"اے مہربانو۔ سرپرستو۔ بندہ نوازو۔ ذرا نیچے اتر کے بس کو دھکا تو لگائیے گا۔ داعی الی الخیر۔ آپ کا کنڈکٹر عفی عنہ۔"

☆☆☆

ہفتہ ٹریفک میں خاص بات یہ ہے کہ یہ سات دن میں ختم نہیں ہوگا بلکہ اس وقت تک جاری رہے گا جب تک لوگ تکلے کی طرح سیدھے نہیں ہو جاتے۔ گھر کے اندر بھی لکیروں پر نہیں چلتے اور لال ہری بتیاں نہیں لگواتے۔ ٹریفک والوں کا فرمانا ہے کہ اب کے ہم کو کوئی جلدی نہیں۔ ہم انتظار کریں گے ترا قیامت تک۔ خدا کرے کہ قیامت ہو اور تو آئے (راہِ راست پر) جا بجا راہگیروں کے لیے ہدایات چسپاں اور آویزاں کردی گئی ہیں جن میں سے زیادہ تر انگریزی میں ہیں۔ ہر راہگیر کو چاہیے کہ غالب کے نوحہ گر کی طرح اپنے ساتھ ترجمان رکھے کہ بھیا ذرا بتائیو تو کیا لکھا ہے؟ ویسے ٹریفک پولیس جا بجا مدرسے بھی کھول رہی ہے جن میں لوگوں کو انگریزی لکھنا پڑھنا سکھایا جائے گا تاکہ وہ ٹریفک کی اور بلدیہ والوں کی اور کے ڈی اے والوں کی ہدایات اور سڑکوں کے نام پڑھ سکیں۔ اردو چونکہ باہر کی زبان ہے۔ کچھ صلاحیت بھی نہیں رکھتی اور پھر انگریزی کے ٹریفک میں خواہ مخواہ کی رکاوٹ ہے لہٰذا لوگ اس کا استعمال مانگ کر شرمندہ نہ کریں۔

☆☆☆

موٹروں، بسوں اور دوسری سواریوں اور ان کے چلانے والوں کو تو خیر خاصی پڑتال کے بعد لائسنس دیا جاتا ہے۔ پیدل چلنے والوں کو ابھی تک کھلی چھٹی ہے کہ جہاں چاہو بلا لائسنس گھومتے مٹرگشت کرتے پھرو۔ پس پولیس کو چاہیے کہ ان کا بھی امتحان لیا کرے۔ تب گھر سے باہر نکلنے کا لائسنس دیا جائے۔ انہیں چلا کے دیکھے دوڑا کے دیکھے۔ ان کی پیٹھ پر لائسنس کی تختی لگی ہو۔ آگے پیچھے بتیاں ہوں، گھنٹی ہو ماتھے پر تکونا کاغذ چپکا ہو کہ فلاں تاریخ کا ٹیکس اس نے دے رکھا ہے۔ اس کو غلط جگہ پارک نہ ہونے دیا جائے۔ وقتاً فوقتاً چیک کیا جائے کہ اس میں سے دھواں تو خارج نہیں ہوتا۔ فضا مسموم تو نہیں ہوتی۔؟ جو پیدل چلنے میں مبتدی ہوں ان کو آگے پیچھے (L) ایل کا بورڈ لگانے کا حکم دیا جائے۔ ایسے گیرج بھی ہونے چاہئیں جن میں پیدل راہگیروں کو اوور ہال کیا جائے۔ ان کا تیل بدلا جائے۔ ان کے ڈھیلے کل پُرزے کسے جائیں وغیرہ۔

☆☆☆

دھوئیں کے ذکر سے یاد آیا کہ ہمارے شہر میں دھواں بہت ہے۔ کارخانوں میں سے دھواں نکلتا ہے بسوں میں سے نکلتا ہے۔ سگریٹ پینے والوں کے منہ سے نکلتا ہے۔ عاشقوں اور زمانے کے ستائے ہوئے لوگوں کے دلوں سے نکلتا ہے۔ مقررین تک بولنے پر آئیں تو دھواں دھار تقریریں کرتے ہیں بلکہ ان کے دھوئیں سے بعض اوقات قوم کی صحت کو ڈیزل کے دھوئیں سے زیادہ ضرر پہنچتا ہے۔ خیر ان کا علاج ہم نہیں کر سکتے۔ گاڑیوں کا یہ حال ہے کہ کچھ پٹرول کی پاور سے چلتی ہیں۔ کچھ ڈیزل کی پاور سے۔ کچھ دھکے کی پاور سے۔ ہماری سفارش یہ ہے کہ اس آخر الذکر پاور کی حوصلہ افزائی کی جائے۔ ایک تو دھوئیں کا سدّ باب ہوگا۔ پھر زرمبادلہ بچے گا کیونکہ گاڑیوں میں پٹرول کی ضرورت نہ ہوگی۔ ڈیزل کی ضرورت نہ ہوگی۔ انجن تک کی ضرورت نہ

ہوگی۔ یہ پاور مقامی طور پر حاصل ہو سکتی ہے۔ جس طرح شہر میں جابجا پٹرول پمپ ہیں۔ کسی باہمت کو دھکا پمپ قائم کر دینے چاہئیں جہاں لوگوں کی ٹکڑیاں لنگیاں اور پھینٹے باندھے ہمہ وقت تیار رہا کریں۔ آج کل دھکا عموماً بس کی سواریاں خود لگاتی ہیں۔ لہٰذا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس دستور کو مستقل کر دیا جائے۔ سواریاں گھر سے نکلیں۔ کسی بس کو دھکیلتی اپنے اپنے دفتر پہنچ جایا کریں۔ شام کو نکلے اسی طرح کسی بس کو دھکا دیتے گھر پہنچ گئے۔ اسے آٹومیٹک پاور کہتے ہیں۔ بس کے اندر فقط دو سیٹیں ہوا کریں۔ ایک ڈرائیور کی ایک کنڈکٹر کی۔ ہم نے تجویز پیش کر دی ہے۔ اس کے مضمرات پر ٹریفک والے غور کریں۔

☆☆☆

یہ جو اعلان ہے کہ ٹریفک کی مہم اس وقت تک جاری رہے گی جب تک لوگ راہ راست پر نہیں آ جاتے تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ قیامت تک۔ تم بھی چلے چلو یونہی جب تک چلی چلے۔ ہر شخص پر کم از کم دو آدمی متعین رہنے چاہئیں کہ اسے برابر روکتے ٹوکتے رہیں یعنی ٹریفک پولیس کی تعداد بڑھانی پڑے گی۔ ساٹھ لاکھ کانسٹبل تو صرف کراچی کی تیس لاکھ آبادی کے لیے چاہئیں۔ قاعدے سے تو یہ کام منکر نکیر کا ہونا چاہیے جو ہر آدمی کے ساتھ رہتے ہیں اور اس کا روزنامچہ لکھنے کے علاوہ کچھ نہیں کرتے۔ آپ کسی گڑھے میں گر رہے ہیں۔ مین ہول میں گر رہے ہیں تو یہ نہیں کہ آپ کو تھام لیا۔ بچا لیا۔ بس ایک اندراج کر دیا کہ شخص مذکورہ گڑھے میں گر گیا ہے۔ باہر بیٹھے ہیں کہ کب کوئی اسے نکالے اور کب یہ روزنامچہ نویسی دوبارہ شروع کریں۔ نہیں بھئی نہیں۔ یہ خالی رجسٹر بھرے جانا ہمارے نزدیک کچھ کام نہیں۔ آخر دو آدمی ہو ؎

اگر بینی کہ نابینا و چاہ است
اگر خاموشی بنشینی گنا ہست

☆☆☆

ہماری دانست میں تو ٹریفک پولیس کا کام اسرافیل کا صور پھینکنے کے ساتھ ختم نہیں ہو جاتا۔ حشر کے میدان میں جو حشر برپا ہوگا۔ بھیڑ بھڑ کا ہوگا اسے کون کنٹرول کرے گا۔ وہاں تو ٹریفک پولیس کی اور زیادہ ضرورت ہوگی۔ "اے نیک لوگو۔ ادھر قطار لگاؤ۔ جنت کا گیٹ ادھر ہے۔ اپنا نامہءاعمال اپنے ہاتھ میں رکھو۔ شور مت کرو۔" اے مولانا کدھر جا رہے ہیں آپ وہ تو دوزخیوں کی لائن ہے"۔ "ہاں بھئی دوزخیو تم بھی اپنی لین میں رہو۔" "اے میاں آوارہ گرد۔ کیوں مولوی صاحب کی ٹانگوں میں سے گھس کر اندر جا رہا ہے۔ یوں تھوڑا جنت میں جا سکے گا۔ وہاں بھی رضوان صاحب کی سخت چیکنگ ہے۔"" "اے شاعر لوگو تم لوگ یہاں بھی افراتفری مچا رہے ہو۔ ہاں ہم نے بھی سنا ہے کہ جہنم کو بھر دیں گے شاعر ہمارے، لیکن بھائی قطار میں۔ ایک ایک کر کے اپنی اپنی باری پر جاؤ۔ اندر آگ ہی تو جل رہی ہے۔ دیگیں تھوڑا ہی پک رہی ہیں۔ لڈو تھوڑا ہی بٹ رہے ہیں۔ مشاعرہ تھوڑا ہی ہو رہا ہے۔

☆☆☆

شہزادی امینہ نے اپنی شادی کے لیے ٹینڈر طلب کر لیے!

شہزادی امینہ۔ ایک حسینہ ہیں عالم میں انتخاب بیلی ڈانس یعنی ننگے پیٹ کا رقص دکھانے اور کولھے مٹکانے کے لیے دور دور تک مشہور۔ اگر آپ اخبار پڑھتے اور اس میں نائٹ کلبوں کے اشتہار دیکھتے ہیں تو ان کی تصویر دیکھ کر ایک آدھ بار آنکھیں بھی نیچی کی ہوں گی۔ یا گلے میں ٹب باندھ کر رال ٹپکائی ہوگی۔ یہ حسینہ اپنے کمالِ فن کے جھنڈے ولایت تک کے کلبوں میں گاڑ آئی ہیں۔ کچھ جھنڈے انہوں نے پاکستان کے لیے بچا رکھے تھے۔ آج کل وہ انہیں لاہور میں گاڑ رہی ہیں پھر ڈھاکہ جا کر گاڑیں گی۔ کراچی سے پہلے ہی آ چکی ہیں اور ہم ان کے جھنڈوں کو غائبانہ سلامی دے چکے ہیں۔ آج کل گرمی کا موسم ہے۔ جسم پر کپڑے یونہی بار معلوم ہوتے ہیں۔ نائٹ کلب کی گرمی میں تو اور بھی کئی گرمیاں شامل رہتی ہیں۔ سنا ہے کہ لباس بے لباسی میں شہزادی صاحبہ کے رومان پرور ہیجان انگیز اور جذبات میں حشر برپا کرنے والے رقص کے بعد تو سورج تک سوا نیزے پر آ جاتا ہے۔

بلا سے ہم نے نہ دیکھا پر لوگ دیکھتے ہیں
فروغِ گلشن وصوتِ ہزار کا موسم

☆☆☆

لاہور میں ان شہزادی صاحبہ نے ایک پریس کانفرنس کی ہے۔ آج کل تو موچی جوتا گانٹھنے سے پہلے، دھوبی لادی لادتے وقت اور کنجڑا سبزی کا ٹھیلہ لگاتے ہوئے پریس کانفرنس کرتا ہے، یہ تو شہزادی امینہ ہے۔ اخبار نویس ان کے نام ہی پر کچے دھاگے میں بندھے چلے آتے ہیں۔ اس پریس کانفرنس کو اس لحاظ سے سوئمبر بھی کہہ سکتے ہیں کہ اس میں انہوں نے ضرورتِ رشتہ کا اعلان کیا ہے۔ امیدواروں سے ٹنڈر طلب کئے ہیں۔ ان کی شرطوں کے مطابق ان کا سرتاج ان سے زیادہ ذہین ہونا چاہیے۔ پھر اس کا دولت مند ہونا بھی ضروری ہے۔ فرمایا ہے کہ ایسا گوہر یکدانہ مجھے مل گیا تو میں فوراً اپنے ہاتھ پیلے کروں گی۔ ہرگز دیر نہ لگاؤں گی۔ اسے دم مارنے کی مہلت بھی نہ دوں گی تاکہ جلد از جلد اپنی زندگی کی ایک اہم اور دیرینہ خواہش پوری کر سکوں۔ وہ یہ کہ میرے درجن بھر بچے ہوں۔ ایک ساتھ یا باری باری؟ اس کی انہوں نے وضاحت نہیں کی۔ غالباً ان کی مراد فرداً فرداً یعنی یکے بعد دیگرے سے ہے۔ موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس نیک بی بی نے معاشرے میں عورتوں کے مقام پر بھی اپنے خیالات عالیہ کا اظہار کیا ہے۔ فرمایا کہ عورتوں کو گھر میں رہنا چاہیے۔ یہی ان کی اصل جگہ ہے۔

☆☆☆

عزیزو۔ پرانے زمانے میں شادی کے لیے ایسی کڑی شرطیں کہاں ہوا کرتی تھیں۔ بھارت میں سوئمبر کی رسم تھی۔ رامچندر جی نے نیچے پانی کے لگن میں عکس دیکھتے ہوئے اوپر گھومتی ہوئی مچھلی کی آنکھ میں نشانہ لگایا اور ستیاجی کو لے اڑے۔ ارجن نے بھی بس

ایک کڑی کمان کو توڑا اور گوہر مراد پالیا۔ حاتم طائی نے اپنے دوست منیر شامی کے لیے ذرا سا ہفتخوان طے کیا۔ انڈے کے برابر موتی ڈھونڈا۔ حمام بادگرد میں ڈبکی لگائی، چند اژدھوں اور دیووں کو زیر کیا اور حسن بانو کی شادی کی شرطیں پوری ہوگئیں۔ فرہاد صاحب بھی بس ایک پہاڑ کاٹ کر نہر لے آئے اور۔ لیکن یہ مثال کچھ غلط ہوگئی۔ مقصود یہ کہ پرانے زمانے میں یہ کوئی جستجو نہ کرتا تھا کہ لڑکا کتنا پڑھا لکھا ہے کیا کماتا ہے۔ پنجابی ہے یا یوپی کا ہے۔ حنفی المذہب ہے یا اثنا عشری ہے۔ قبول صورت ہے یا ہم ایسا ہے۔ بلکہ بعض اوقات تو اس کے صبح صبح اٹھنے کی عادت کافی ہوتی تھی۔ جو شخص علی الصبح سب سے پہلے شہر میں داخل ہوتا تھا۔ آدھی سلطنت اور راجکماری کے ڈولے کا حقدار ہوجاتا تھا۔ اس کا یہ عذر تک کوئی نہ سنتا تھا کہ وہ پہلے سے شادی شدہ ہے۔ ہم ایسے دیر سے اٹھنے والوں کے لیے تو خیر اس زمانے میں بھی کوئی چانس نہ تھا۔ بس بے خوابی کے مریض پالا مار لے جاتے تھے۔ تاہم......

☆☆☆

اس کے مقابلے میں شہزادی امینہ کی شرطیں دیکھیئے کہ ان کا ہونے والا منّے کا ابا ان سے زیادہ ذہین بھی اور گرہ میں قارون کے خزانے کی کنجیاں بھی رکھتا ہو۔ ارے ہے کوئی گانٹھ کا پورا ذہین آدمی؟ ہو تو ہاتھ کھڑا کرے۔ ہمارے خیال میں تو ایسا آدمی چراغِ رخِ زیبا لے کے ڈھونڈتے رہیئے۔ بونس واؤچر پر بھی مشکل ہی سے ملے گا۔ وہ فرداً فرداً چاہیں تو ایسے دو آدمی مہیا کئے جاسکتے ہیں لیکن ایسا کہاں سے لائیں کہ سب اچھا کہیں جسے۔ آناں را کہ ایں دہند آں نہ دہند۔ اے بی بی کچھ کم کر۔ ہماری قوت خرید کا خیال کر۔ آخری دام بتا کیا لے گی۔ کم مایہ ہیں سوداگر اس دیس میں ارزاں ہو۔ خیر یہ اچھا ہے کہ شہزادی صاحبہ نے عمر یا تعلیم کی کوئی شرط نہیں رکھی۔ نہ خاندان۔ ولدیت اور سکونت وغیرہ کو اہمیت دی ہے۔ نہ پنجاب اور یوپی کا فرق کیا ہے۔ یہ ان کی

سیر چشمی اور فراخ حوصلگی کی دلیل ہے۔ آخر شہزادی ہیں نا۔ یوں تو ہر نوعمر حسینہ ہمارے نزدیک شہزادی ہوتی ہے لیکن شہزادی امینہ آٹھو گانٹھ شہزادی ہیں۔ اپنا سلسلہ حیدر آباد دکن کے شاہی خاندان سے جوڑتی ہیں۔ عمر کے باب میں انہوں نے فرمایا کہ نامِ خدا اٹھارہ برسوں کی ہیں۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ اٹھارہ برس سے تو ہم ان عفیفہ کو ناچتے دیکھ رہے ہیں۔ ہمارے خیال میں یہ مبالغہ ہے۔ شہزادی صاحبہ کی عمر اٹھارہ سال نہیں تو اٹھارہ سال کچھ مہینے ہوگی۔ ایک صاحبہ نے اپنی عمر اسی حساب سے بتائی تھی۔ جب کسی نے کریدا کہ کتنے مہینے؟ تو اجمال کی تفصیل یہ معلوم ہوئی کہ اٹھارہ سال ایک سو بارہ مہینے۔

☆☆☆

عمر کے بارے میں شہزادی صاحبہ کے بیان کی تصدیق اس امر سے ہو سکتی ہے کہ وہ بقول خود شاہ فاروق کی حضوری میں بھی ناچ چکی ہیں، اگرچہ ان کے معیار پر پوری نہیں اتریں کیونکہ حضور جلالتہ الملک موٹی عورتوں کو پسند فرماتے تھے۔ شہزادی صاحبہ کی طرف سے ہمارا جی ایک لحاظ سے خوش ہے وہ یہ کہ کلبوں میں کولھا ڈانس کرنے والی عموماً یہودنیں اور فرنگنیں ہوتی تھیں جس کی وجہ سے ہمیں احساس کمتری ہوتا تھا۔ بارے اب ایک مسلمان خاتون میدان میں آئیں اور وہ بھی ایسے پاکیزہ خیال کی فرماتی ہیں عورت کا صحیح مقام اس کا گھر ہے (ہم نے تحقیق کر لی ہے۔ انہوں نے گھر ہی کہا ہے، ناچ گھر نہیں) ہم یہی بات کہتے تھے تو کوئی نہ مانتا تھا۔ ہمیں مُلّا گردانتا تھا۔ دیکھو جادو کیسا سر چڑھ کے بولا ہے۔ دوسری وجہ یہ کہ دکن کے شاہی خاندان کی عظمت کو لوگ بھولے جا رہے تھے۔ بارے اسے پھر سر بلند کرنے والی ایک ہستی پیدا ہوئی۔ ''ستارہ می شکستند، آفتاب می سازند''۔ اللہ اس بی بی کے ارادوں میں برکت دے۔ ہم ان کی ہونے والی درجن بھر اولاد کی درازی عمر کے لیے ابھی سے دعا گو ہیں۔

☆☆☆

بارہ بچے پیدا کرنے کا عزم اور وہ بھی بالجزم۔ دیکھیں کون ہوتا ہے حریف مئے مرد افگن عشق ہمیں تو اتنے بڑے جھول کا خیال کر کے ہی ہول آتا ہے اپلے اس ہم جنس کی جس پر شہزادی صاحبہ کی نظر انتخاب پڑے گی اور تو کیا مدد کر سکتے ہیں اسے یہی مفید اور مفت مشورہ دے سکتے ہیں کہ حکیم حبیب اشعر دہلوی سے رجوع کرے اور کرتا رہے ورنہ ہم نتائج کے ذمہ دار نہ ہوں گے۔ یاد رہے کہ اس سے پہلے شہزادی صاحبہ ایک برطانوی لارڈ کے حبالۂ نکاح میں رہ چکی ہیں۔ وہ ان کے رقص کے دوران میں ڈرم بجایا کرتے تھے۔ باپ کے مرنے کے بعد ان کو ہاؤس آف لارڈز میں بیٹھنا پڑا تو وہ ڈھول بجانے سے گئے اور علیحدگی ہوگئی۔ اصل وجہ یہ سنی جاتی ہے کہ ان کے ڈھول کا پول کھل گیا تھا۔ سال ڈیڑھ سال ان کی شادی رہی بچہ صرف ایک پیدا ہوا۔ یہ رفتار چنداں تسلی بخش نہیں کہی جا سکتی۔ خصوصاً اس ایٹمی دور میں جبکہ ہر طرف سریع رفتاری کے ریکارڈ قائم ہو رہے ہیں۔ بہر حال امیدواروں کو ابھی سوچنے کی مہلت ہے۔ شہزادی صاحبہ فی الحال جنوبی ویت نام جانے کا عزم رکھتی ہیں۔ وہاں امریکی فوجیوں کی دلبستگی کے لیے رقص پیش کریں گی۔ ان کا یہ فعل ہمیں کچھ مرے کو مارے شاہ مدار قسم کا نظر آتا ہے۔ وہ غریب تو پہلے ہی ویت کانگ کے ہاتھوں دھڑا دھڑ مر رہے ہیں۔ آپ پر مرنے یا آپ کے تیر نظر کا گھائل ہونے کے لیے کتنے باقی رہیں گے مگر۔ کہ

زندہ کُنی خلق راد باز کسی

اپنی شادی کی شرطوں میں شہزادی امینہ نے امیدوار کے دولت مند ہونے کا ذکر کر کے حقیقت پسندی کا ثبوت دیا ہے کیونکہ خالی ذہین لوگ تو ایک ڈھونڈو ہزار ملتے ہیں جوتے چٹخاتے ہوئے۔ اس پر ہمیں وہ بزرگ یاد آئے جن کی نورِ نظریوں تو پانچ انگلیاں پانچوں چراغ تھی لیکن شکل وصورت میں بس آدمی کا بچہ تھی جیسی ہماری

ادکارائیں میک اپ سے پہلے ہوتی ہیں۔ بایں ہمہ ایک شخص ہمیں ساتھا کہ اس پر لٹو تھا لڑکی کے والد ماجد لکھ پتی تھے۔ ایک روز انہوں نے امیدوار کو بلا کر اس کا انٹرویو لیا۔

''میاں صاحبزادے سنا ہے تمہیں ہماری صاحبزادی سے محبت وغیرہ ہے''

بولا۔''جی ہاں میں اس کے لیے آسمان کے تارے توڑ لا سکتا ہوں۔ چاند سورج اس کے قدموں میں بچھا سکتا ہوں پہاڑ کاٹ سکتا ہوں۔ ندیاں......''

ان بزرگ نے قطع کلام کر کے کہا۔''تمہیں شاید معلوم ہے کہ ہماری بیٹی کو جہیز میں ۵ لاکھ روپے کی جائداد ملے گی۔'' امیدوار بولا''جی ہاں''

بزرگ نے کہا''فرض کرو اس کو یہ جائداد نہ ملتی وہ کسی غریب آدمی کی بیٹی ہوتی۔ کیا تم پھر بھی اس سے شادی کر لیتے۔''

امیدوار نے کہا۔''جی ہاں۔ ضرور ضرور''

وہ بزرگ دفعتہً بھڑک اٹھے بولے۔ حد ہو گئی۔ نکل جاؤ میرے گھر سے۔ میں ایسے احمق سے اپنی بیٹی کی شادی کبھی نہیں کر سکتا۔''

☆☆☆

بج رہا ہے اور بے آواز ہے!

ذکر گوجر خاں کے اسپتال وغیرہ کا

اخبار کی خبر ہے کہ تحصیل گوجر خاں ضلع راولپنڈی میں ایک اسپتال ہے جسے ایک چوکیدار چلا رہا ہے۔ یہ انکشاف تب ہوا جب ڈپٹی کمشنر بہادر دورہ کرتے ہوئے رورل ہیلتھ سینٹر موضع قاضیاں میں پہنچے۔ چوکیدار نے دیکھتے ہی انہیں زناٹے کا سلیوٹ کیا اب آگے کی کارروائی کا آنکھوں نہ دیکھا حال سنیئے:۔

''ویل چوکیدار۔ اسپتال کیسا چل رہا ہے۔''؟

''حضور...... آپ کی عنایت سے اچھا چل رہا ہے۔ بہت اچھا چل رہا ہے۔''

''ڈاکٹر صاحب کہاں ہیں''

''حضور اس اسپتال میں کوئی ڈاکٹر نہیں''

''ڈاکٹرنی صاحبہ تو ہوں گی۔ انہی کو سلام بولو''

''جناب عالی! ڈاکٹرنی بھی کوئی نہیں۔ دو سال ہوئے اسامیاں تو منظور ہو گئی تھیں۔ مقرر کوئی نہیں ہوا۔''

''باقی عملہ کہاں ہے۔ بلاؤ ان کو۔ ہم اس اسپتال کا معائنہ کریں گے۔''

''مائی باپ۔ میرا ہی معائنہ کر لیجئے کیونکہ ڈسپنسر چھٹی پر ہے' ڈریسر چھٹی پر ہے۔ لیڈی ہیلتھ وزیٹر چھٹی پر ہے اور دائی چھٹی پر ہے۔ سب کو ضروری کام ہیں۔ سب چھٹی پر ہیں۔''

''مریض''؟

'جی وہ بھی چھٹی پر ہیں'

''بابا تم بھی چھٹی پر کیوں نہیں چلے جاتے''

''حضور۔ میں چلا جاؤں تو اسپتال کیسے چلے ڈسپنسر اور ہیلتھ انسپکٹر اور دائی وغیرہ کو ان کی تنخواہیں گھروں پر کون پہنچائے۔ سارا کام اکھٹا ہو جائے گا۔''

(۲)

بھگت کبیر ٹھیک کہہ گئے ہیں۔ چلتی کا نام گاڑی ہے۔ مدت ہوئی ہم نے عمر کوٹ کے اسپتال کا حال لکھا تھا جو بغیر دواؤں کے چل رہا تھا۔ اس میں ڈاکٹر البتہ تھے۔ مریض آتا تھا تو ٹوٹی لگا کر اس کا معائنہ کرتے تھے۔ اس کے بعد نسخہ لکھتے تھے۔ نسخے کو تہ کر کے اس کا تعویذ بناتے تھے اور مریض کو ہدایت کرتے تھے کہ اسے بازو پر باندھ لو۔ یا پانی میں گھول کر پی جاؤ انشاء اللہ ٹھیک ہو جاؤ گے۔ ایسے ہی ایک اور اسپتال کی خبر اخبار میں آئی تھی جس میں تھرمامیٹر ہی نہیں تھا۔ شروع میں ہوگا ضرور لیکن ٹوٹ گیا۔

اب سرکاری ڈسپنسری میں اپنے پلّے سے تھرمامیٹر لا کر کوئی رکھے۔ یہ تو بے ضابطگی ہے۔ افرانِ بالا جواب طلب کر لیں تو؟ جہاں تھرمامیٹر نہ ہو وہاں بخار کا کیا کام؟ اگر کوئی شخص زبانی آکر کہے بھی کہ مجھے بخار ہے تو ڈاکٹر کہہ دیتے تھے کہ بھیا مہینہ بھر بعد آئیو۔ تھرمامیٹر کی خریداری کی اجازت کے لیے فائل اوپر گئی ہوئی ہے۔ آجائے تو خریدیں اور تمہارا بخار دیکھیں۔ بخار کا معاملہ بڑا نازک ہوتا ہے۔ یونہی پنڈے پر یا نبض پر ہاتھ رکھ کر بخار بتا دینا عطائیوں کا کام ہے، میڈیکل سائنس میں اس کی ممانعت ہے۔

(۳)

بعض اوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ جس اسپتال میں ڈاکٹر صاحب نہیں اس کے چوکیدار ہی نے مریض کے پر زور اصرار پر الماری کھول اسے کوئی ٹکیاں دے دیں یا انجکشن گھونپ دیا کہ شفا تو آخر شافی مطلق کے ہاتھ میں ہے۔ ایسے موقعوں پر کبھی کبھی مریض کو شفائے مطلق بھی حاصل ہو جاتی ہے کہ نہ مریض رہتا ہے نہ مرض۔ جہاں ڈاکٹر ہیں دوا نہیں۔ وہ تعویذ گنڈے کا کام باقاعدہ شروع کر دیتے ہیں۔ مریض کو دیکھا اور پھونک مار کر کہا۔ جا بچہ ٹھیک ہو جائے گا۔ حضرت عزرائیل کے نام کی نیاز دے دینا۔ جسے دنیا سے بھی جانا ہے وہ چار دن بعد گیا کہ پہلے گیا۔ بلکہ سنا ہے پہلے جانے والوں کو وہاں جگہ اچھی مل جاتی ہے،

(۴)

ہمارے شہر میں بعض ڈسپنسریاں اور زچہ خانے ایسے ہیں جن کے آگے پٹرول پمپ بنا دیئے گئے ہیں۔ حکمت یہ ہے کہ ڈاکٹر یا کمپونڈر یا دائی موجود نہ ہوں تب بھی ڈسپنسری خالی نہ رہے۔ جاتے ہوئے پٹرول پمپ کے کارندے سے کہتے جائیں کہ بھیا دھیان رکھیں ہم ذرا چائے پی آئیں۔

مریض آیا تو پٹرول پمپ کا آدمی حق ہمسائیگی ادا کرتے ہوئے مستعدی سے پوچھتا ہے۔ آیئے جناب، خدمت۔؟

''ڈاکٹر صاحب ہیں؟ کمپونڈر صاحب ہیں۔؟''

''اجی آپ کو ان سے کیا مطلب کام کیا ہے؟''

''بھئی دوائی لینی تھی۔ جانے کیا مرض ہے۔ دن بدن گھلتا جا رہا ہوں۔''

''اجی دوا کی حاجت ہے۔ آیئے۔ ادھر آیئے۔ آپ میں ہوا بھرے دیتا ہوں۔ ویسے آپ سروس کرا لیجئے۔''

’’بابا۔ ہوا نہیں چاہیے۔ کھانے کی دوا چاہیے۔‘‘

’’اچھا تو موبل آئیل دیتا ہوں۔ دو چمچے نہار منہ پی لیا کیجئے۔ اسے آپ سر کے بالوں میں بھی لگا سکتے ہیں۔ دوں ایک ڈبا۔

’’موبائل آئل؟ ارے میاں کیا کہہ رہے ہو؟‘‘

’’اچھا تو شیر مارکہ پٹرول ڈلوا لیجئے اپنی ٹنکی میں۔ ہوا کی طرح تیرتے جایئے گا۔ کسی سے دھکا لگوانے کی ضرورت نہ رہے گی۔‘‘

’’ارے کیسی ٹنکی۔ کون سی ٹنکی۔‘‘

’’اب آپ سے بحث کون کرے بیٹھ جایئے۔ آتے ہوں گے ڈاکٹر صاحب۔ تھوڑی دیر میں۔‘‘

(۵)

ان مثالوں سے ثابت ہوا کہ عشق کاریست کہ بے آہ وفغان سر کنند۔ صرف اسپتال ہی اللہ توکل نہیں چل رہے۔ بہت سے دفتروں کو بھی ہم نے خود کار پایا کہ زندگی کے ساز کی طرح بج رہے ہیں اور بے آواز ہیں۔ یعنی بے آواز سہی لیکن بج ضرور رہے ہیں اور یہی چاہیے‘‘

’’یہ دفتر رفاہ عامہ ہے؟‘‘

’’جی ہاں۔ آپ نے ٹھیک فون کیا‘‘

’’بڑے صاحب ہیں؟‘‘

’’ابھی آئے نہیں۔‘‘

’’کب آئیں گے۔‘‘

’’پتا نہیں۔ آئیں آئیں۔ نہ آئیں نہ آئیں۔‘‘

’’چھوٹے صاحب تو ہوں گے۔‘‘

’’جی وہ آئے تھے چلے گئے۔ کہتے تھے ضروری کام ہے۔

’’ان کا اسسٹنٹ ہوگا۔‘‘

’’حضور وہ چھٹی پر ہے۔ لمبی چھٹی پر ہے‘‘

’’اچھا کسی کلرک کو بلا دو۔‘‘

’’جی بابو لوگ تو چائے پینے گئے ہیں۔ کینٹین میں ہوں گے۔‘‘

’’کوئی اہل معاملہ آئے ہیں‘‘

’’جی بہت سے بیٹھے ہیں۔ بنچ بھرا ہوا ہے۔ آپ بھی آ جایئے۔‘‘

’’میاں جب کوئی دفتر میں ہے نہیں تو آنے کا فائدہ۔‘‘

’’اجی فائدہ کیوں نہیں ٹھنڈا کمرہ ہے پنکھا ملا ہے دوسرے اہل معاملہ سے بات چیت کیجئے۔ واقفیت پیدا کیجئے، ڈیڑھ بجے دفتر بند ہوگا۔ آپ بھی چلے جایئے۔‘‘

(۶)

اب تو خیر حکومت سختی کرری ہے ورنہ پہلے اسکول کالج بھی ایسے تھے کہ چوکیداروں کے بل پر چلتے تھے جز وقتی استاد کسی اور درسگاہ میں پڑھاتے ادھر سے بھی گزر جاتے تھے۔ آئے طلبہ کی حاضری لی، اور چلے گئے۔ آئے فیس وصول کی اور چلے گئے۔ آئے یہ بھی نہ کیا اور چلے گئے۔ وہ خوش اور طلبہ بھی خوش۔ کیوں نہ تعلیم کے سائنٹفک نظریہ کے مطابق طالب علم پر کتابی علم کا بوجھ زیادہ ڈال دیا جائے تو اس کی شخصیت دب کر رہ جاتی ہے۔ سچ پوچھیئے تو ہسپتال یا اسکول یا دفتر کی تخصیص نہیں۔ پوری دنیا چوکیدار کے بل پر چل رہی ہے۔ دنیا بھی اور عقبیٰ بھی۔ وہ جسے ہم ہر روز ڈھونڈا کرتے ہیں۔ اس جگہ کا رکھوالا ہی تو ہے، دوسرے الفاظ میں یہ پوری کائنات گوجر خاں کا اسپتال ہے۔

☆☆☆

ذکر اُونٹوں کا اور بلّیوں کا!

کسی نگر میں کوئی شخص تھا......ہم جیسا آپ جیسا، اس کا کوئی کام بگڑا تو اس نے منّت مانی کہ یا پیر جھنڈا۔ اگر یہ کام روبراہ ہو جائے تو اپنا یہ اونٹ خدا کی راہ میں کسی کو ایک ٹکے کے عوض دے دوں۔ کرنا خدا کا اس کی مراد پوری ہوئی۔ اب یہ حضرت چکنم میں اتنا بڑا اونٹ ایک ٹکے میں کیسے دے دوں، اُدھر جھنڈا پیر کی خفگی کا بھی ڈر۔ ایک مہربان سے مشورت کی۔ وہ وکالت پاس بھی تھے اور اتفاق سے انجمنِ تاویلِ سخن کے لیڈر بھی، بولے، اے میاں غم نہ کر، ایسا قانون چھانٹیں گے کہ تیرا نقصان بھی نہ ہوگا اور منّت بھی پوری ہو جائے گی، جا ایک بلی کہیں سے پکڑ کے لا۔ وہ ایک خوفیاتی ہوئی مریل بلی لے آیا، ان بزرگ نے فرمایا اسے اپنے اونٹ کے گلے میں باندھ، باندھ دی۔ فرمایا۔ اب ان پر قیمتوں کی چٹ لگا دے۔ اونٹ پر ایک ٹکے کی اور بلی پر پانچ سو روپے کی۔ پھر اعلان کر دے کہ لوگو! گھر لٹا دیا ہے، مال سستا لگا دیا ہے، شرط فقط یہ ہے کہ جو اونٹ کو خریدے گا، اُسے بلی بھی مول لینی ہوگی۔ دونوں جانوروں کا الگ الگ سودا منظور نہیں۔ یہ ہمارے ہاں کا دستور نہیں۔

☆☆☆

معلوم نہیں اس عقیدت کیش کا الّو سیدھا ہوا کہ نہیں یعنی اُس کی بلی بکی کہ نہیں۔ لیکن

اس کے بعد سے اونٹ کے گلے میں بلی باندھنے کا رواج اور محاورہ چل نکلا۔ اس کی ایک مثال تو فارن ایڈ یعنی غیر ملکی امداد ہی کو جانئے کہ دینے والا اس طرح ایک ہاتھ سے دیتا ہے کہ دوسرے ہاتھ کو پوری پوری خبر رہتی ہے، ارشاد ہوتا ہے کہ اے بھتیجے پسماندہ خان...... یہ لے تھیلی۔ غریب جان کر تیری مدد کئے دیتے ہیں کہ سخاوت اور خدا ترسی ہمیشہ سے ہمارے خمیر میں ہے۔ لیکن اس رقم کو خرچ کرنے کی ترکیب تجھے کیا معلوم ہوگی؟ ہم اپنا مشیر بھیجیں گے، اُس کی تنخواہ اسی تھیلی میں سے دیجیو۔ جو مال باہر سے منگائیں وہ ہمارے ملک سے اور ہمارے ملک کے جہازوں میں منگائیو۔ مہنگے سستے کی فکر مت کیجیو۔" میاں پسماندہ خاں نے خوش خوش تھیلی لی اور "تھینک یو یا سخی" کا پھر پرا لہرایا۔ چند روز میں من کی آنکھ کھلی تو دیکھا کہ وہ تو موچی کا موچی ہے۔ ہاں سخی داتا نے ہر طرف ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرح اپنے پاؤں پھیلا لیے ہیں اور اپنا بندوبست دوامی رائج کر دیا ہے، اس کے بعد سے سمجھدار اسامیاں شرط کرنے لگیں کہ چچا میاں۔ تھیلی تو لیں گے لیکن اس کے ساتھ کوئی رسی ڈوری String وغیرہ نہیں چاہئے۔ مراد یہی کہ رسّی ہوگی تو اس کے دوسرے سرے پر ضرور کچھ نہ کچھ بندھا ہوگا بلی۔ مشیر۔ فارن پالیسی۔ سی آئی اے، فوجی اڈہ وغیرہ۔

☆☆☆

پچھلے دنوں پھر ہمیں یہ محاورہ یاد آیا۔ اسرائیل نابکار نے مسجد اقصیٰ کو آگ کیا دکھائی۔ سارے عالم اسلام میں آگ لگ گئی۔ دنیا بھر کی مسلمان آتش زیر پا اُٹھ کھڑے ہوئے۔ ہمارے ہاں بھی جلوس نکلے اور جلسے ہوئے۔ مسئلے کے تقدس کا تقاضا تھا کہ پوری توجہ اس پر مرکوز رہے لیکن سیاس اور موقع شناس لوگوں نے یہاں بھی، پنجابی محاورے کے مطابق اپنے اپنے لُچ تلنے، اور اردو محاورے میں اپنی اپنی بلیاں اس اونٹ کے گلے میں باندھنی شروع کیں، اخباروں میں اعلان آنے لگے کہ آج کمپنی

باغ میں جلسہ ہوگا جس میں مسجد اقصیٰ اور فلاں مسئلے اور فلاں قضیے اور فلاں واردات پر احتجاج کیا جائے گا ہم نے کچھ اس قسم کی منادی ہر طرف سُنی :-

۱۔ آج شام کراچی دھوبی پنچائت کے جلسے میں مسجد اقصیٰ کی آتشزدگی اور کاسٹک سوڈے کی گرانی کے خلاف غم وغصہ کا اظہار کیا جائے گا، غیر دھوبی حضرات بھی شریک ہوسکتے ہیں۔

۲۔ آج انجمن فلاح کورنگی کے جلسہ عام میں مسجد اقصیٰ کی بے حرمتی۔ کارپوریشن کے عملہ صفائی کی زیادتیوں اور بھینسوں کو شہر بدر کرنے کے خلاف احتجاجی قرار دادیں منظور کی جائیں گی۔

۳۔ حضرت قبلہ فلاں نے پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ مسجد اقصیٰ کی بے حرمتی۔ لامحدود ذاتی ملکیت میں کسی قسم کی مداخلت کو ہرگز برداشت نہیں کیا جائے گا۔ وغیرہ۔

☆☆☆

اور لوگوں کی مثالیں تو چھوڑ دیجئے کہ محض برائے وزن بیت ہیں۔ سیاسی مقدسین کی یہ شتر گربگی اور مینگنیاں ڈال کر دودھ دینا خالی از مصلحت نہیں۔ اگر معاملہ مسجد اقصیٰ تک ہی رہے تو لوگوں کی توجہ عربوں کے کاز پر مرکوز ہوجائے گی۔ لوگ مصر، شام، عراق، اردن اور الجزائر کے عربوں اور ان کی حکومتوں کی ہمدردی میں گرفتار ہوجائیں گے۔ محض اس وجہ سے کہ وہ اسرائیل کے خلاف زندگی موت کی لڑائی لڑ رہے ہیں۔ بعض تو الفتح کے فدائی بھی بن جائیں گے جو برملا ویت نامیوں وغیرہ کی تعریف اور تقلید کرتے ہیں۔ یہ تو نہیں ہونا چاہیے۔ اچھا لوگوں کو مسجد اقصیٰ کے نام پر جمع ہونے دو۔ ہم اس میں اندرون ملک کے قصے اور باہمی قضیے کھینچ لائیں گے حتیٰ کہ حقیقت خرافات میں گم ہوجائے۔ اصل مسئلہ ہی غتربود ہوجائے۔

☆☆☆

سب جگہ تو نہیں لیکن بعض جگہ یہی ہوا۔ مسئلہ مسجد اقصیٰ کا ہے۔ خیال پارلیمنٹ کی ممبری میں اٹکا ہوا ہے۔ نام کعبہ کا ہے اور راہ ترکستان کی ہے۔ ستم موشے دایان نے کیا ہے اور غصہ مولانا عوام دوست پشاوری پر اتارا جارہا ہے۔ ہمارے ایک دوست نے ہمیں ایک جلسے کا احوال آکر سنایا کہ مقرر خصوصی نے اپنی پاٹ دار آواز میں فرمایا۔

"اے لوگو۔ اے مسلمانو۔ مسجد اقصےٰ کا جلایا جانا بڑے افسوس کی بات ہے۔ یہ بہت برا ہوا۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ لیکن آج کل ظلم کہاں نہیں ہوتا۔ فلاں شہر میں ایک جلسہ ہوا۔ ہماری ہی پارٹی کا ایک جلسہ تھا۔ کچھ لوگوں نے ہمارے ایک آدمی کے تھپڑ کھینچ مارا۔ بھائی لوگو۔ بالکل بے قصور۔ بیچارے کی نکسیر پھوٹ گئی۔ ارے تلّی بندھ گئی خون کی۔ ساری قمیص لہولہان ہوگئی۔ سارے پاجامے کا ستیاناس ہوگیا...... مجمع میں سے کسی نے آواز لگائی" حضرت بات مسجد اقصیٰ کی ہورہی ہے۔"

مقرر نے پینترا بدل کر کہا" ہاں ہاں بھائی۔ مسجد اقصیٰ ہمیں جان سے عزیز۔ ہم اس کے جلائے جانے کے ہرگز حق میں نہیں بلکہ سراسر خلاف۔

برادران اسلام۔ مسجد اقصیٰ کا بڑا درجہ ہے اور ہم نے ریزولیشن پاس کرکے اور ہڑتال کے ذریعے اپنے چلتے کارخانے دفتر اور کاروبار بند کرکے اسرائیل پر جو ضرب کاری لگائی ہے، اس کے بعد وہ ایسی ناشائستہ حرکت نہ کرے گا۔ اب رہا ہمارے آدمی کی نکسیر پھوٹنے کا معاملہ۔ ارے ہمیں سمجھا کیا ہے، ہم کفن بدوش نکل آئیں گے، کشتوں کے پشتے لگادیں گے۔ خون کی ندیاں بہادینگے۔ اٹھو ورنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی۔

☆☆☆

پنجاب یونیورسٹی میں شعبہ حماقت کھل گیا!

یاد ایّامے کہ ہم ہٹلر کو ڈانٹ دیتے تھے

پچھلے دنوں اخبار پڑھتے میں ایک خبر پر ہماری نظر رک گئی۔ لکھا تھا کہ پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ حماقت نے فلاں ادیب مشہیر کے اعزاز میں استقبالیہ دیا۔ یہ سچ ہے کہ پنجاب یونیورسٹی سے بھی اور یونیورسٹیوں کی طرح وقتاً فوقتاً حماقتیں سرزد ہوتی رہی ہیں (ہمیں ڈگری دینا بھی انہی میں سمجھ لیجئے) اور جیسا کہ کاٹھیاواڑ بیوپار منڈل کے صدارتی خطبے میں سیٹھ کھلی بھائی بتولہ بھائی باردانہ والے نے فرمایا ہے۔ دستخط اور گنتی پہاڑے وغیرہ سیکھنے سے آگے پڑھنا ہے بھی بجائے خود حماقت۔ لیکن ہمیں یہ معلوم نہ تھا کہ پنجاب یونیورسٹی نے ایک مستقل شعبہ حماقت قائم کر دیا ہے تاکہ جو لوگ اس مضمون میں خصوصیت حاصل کرنا چاہیں وہ اس میں باقاعدہ فارغ التحصیل ہوں۔ ڈگری لیں اور آگے طلبہ کو فیض پہنچائیں۔

میرا پیغام حماقت ہے جہاں تک پہنچے

☆☆☆

پھر خیال آیا کہ کہیں یہ کتابت کی غلطی نہ ہو۔ کیونکہ حماقت کوئی قانون یا جغرافیہ تو

ہے نہیں کہ پڑھنے سے آ جائے۔ یہ تو ایک خداداد بات ہے۔ اللہ چھپر پھاڑ کر دیتا ہے۔ اور اس وقت بھی اس فن شریف میں درک رکھنے والے اتنے لوگ موجود ہیں کہ بھارت میں مورکھ منڈال اور پاکستان میں انجمن احمتا کی شاخیں جابجا کھلی ہیں۔ بھارت کے مورکھ منڈل میں تو بعض وزیر بھی شامل ہیں۔ یا پھر یہ ہوگا کہ وزارت میں وہ مورکھ منڈال کی نمائندگی کرتے ہوں لیکن ان میں سے کوئی حماقت کو بطور مضمون کے شاید ہی پڑھا ہوگا۔ ہو نہ ہو یہ شعبہ حجامت ہے۔ ہمارے کرم فرما حضرت اسلام سلمانی بی۔ اے اور ان کی جماعت ایک مدت سے کوشاں تھی کہ اس فن کو فنون لطیفہ میں داخل کرکے یونیورسٹی میں اس کی تدریس کا انتظام کیا جائے۔ اب جا کر یہ کوشش بارآور ہوئی ہے۔ اب یہ ہوگا کہ ایک کمرہ میں فلسفے کا استاد تقریر کر رہا ہے کہ دیکارت اور شوپنہار کے فلسفوں میں کیا فرق ہے۔ پاس کے کمرے میں پروفیسر خلیفہ امام دین طلبہ کو بتا رہے ہیں کہ داڑھی میں کتنا صابن لگانا چاہیے جس سے بال نرم ہو جائیں اور گاہک کی الٹے استرے سے حجامت کرنے میں آسانی رہے۔

مزید تحقیق پر معلوم ہوا کہ نہ حماقت نہ حجامت۔ خبر کا تعلق شعبہ صحافت سے ہے۔ کاتب صاحب نے صحافت کو حماقت کیوں لکھا۔؟ ممکن ہے انہیں وقت پر تنخواہ نہ ملی ہو۔ لیکن اتنی سی بات پر گھر کے بھیدی کا پوری لنکا ڈھا دینا کوئی اچھی بات نہیں۔ صحافت سے وابستگی اگر حماقت ہے تو اس راز کو فری میسنوں کی طرح اپنے سینے میں رکھنا چاہیے۔ اپنی برادری سے باہر فاش نہیں کرنا چاہیے لیکن اب پچھتائے کیا ہوت۔ اب تو یہ راز طشت از بام ہو چکا۔ اب ہم اس کی شرح لکھیں گے تو ہم پر کسی طرح کا الزام نہیں۔ یہ بات ہم بھی بیس برس سے جانتے تھے لیکن ایسے اوچھے نہیں تھے کہ ہر ایک سے کہتے پھرتے۔ یہی حال ہمارے دوسرے سینکڑوں صحافی بھائیوں کا ہے کہ ایک بات جو ان سے سرزد ہوگئی ہے اسے نبھائے جا رہے ہیں بلکہ بعضے تو یہ تک ظاہر کرتے

ہیں جیسے بڑی عقل کی بات کر رہے ہوں۔

☆☆☆

سچ تو یہ ہے کہ اگر یہ حماقت ہے تو اس کا احساس کچھ دن بعد جا کر ہوتا ہے۔ ہمیں آج کل ہو رہا ہے کہ سیدھی سادی دل کی بات لکھتے ہیں وہ بھی خوش طبعی کے ساتھ جو کچھ ہے حجمان کے بالوں کی طرح آپ کے سامنے آ جاتا ہے۔ اس پر بھی ادھر کچھ چھپا اور کسی گروہ کی طبع نازک پر گراں گزرا۔ اُدھر لوگ وفد اور ڈنڈے لے کر پہنچ گئے کہ نکالو اس شخص کو باہر۔ کہیں سے اشارہ ہوا اور اطراف و جوانب سے ایک ہی طرح کے اور ایک ہی مضمون کے خطوں کی لین ڈوری بندھ گئی...... یہ تو خیر سیاسی جماعتوں کا حال ہے۔ لاہور میں ہمارے ایک دوست نے جو اخبار کا فلمی صفحہ مرتب کرتے تھے کہیں لکھ دیا کہ فلم ''چڑیا کی دُگی'' کے مکالمے کمزور ہیں اور کہانی میں بھی جان نہیں۔ انہیں نہیں معلوم تھا کہ یہ فلم ایک مشہور پہلوان نے بنائی ہے۔ وہ اگلے ہی روز اپنے پٹھوں کے ساتھ اخبار کے دفتر پہنچ گئے، اس صحافی کو گریباں سے پکڑ لیا اور کہا۔ اگر مکالمے کمزور ہیں تو ہم تو کمزور نہیں اور اگر کہانی میں جان نہیں ہے تو تم میں کونسی جان ہے۔ ڈیڑھ پسلی کے آدمی ہو باہر نکلو دو دو ہاتھ ہو جائیں۔ لوگ جمع ہو گئے بڑی مشکل سے تو تھمبو کیا۔ جاتے ہوئے دھمکی دے گئے کہ آئندہ میری کسی فلم کے متعلق کچھ ایسا ویسا لکھا تو اچھا نہ ہوگا۔ وہ دھوبی پٹڑاؤں گا کہ عمر بھر ہلدی چونا لگاتے رہو گے۔

اب تو خیر حالات بہت بہتر ہیں۔ صحافیوں کو تنخواہ بھی مل جاتی ہے اور پریس کلب میں بیٹھ کر تمبولا بھی کھیل سکتے ہیں۔ پہلے زمانے میں تو بس یہی عشرت تھی کہ کمرہ بند کر کے قلم ہاتھ میں اٹھایا اور ساری دنیا ہاتھ باندھ کر سامنے کھڑی ہو گئی۔ ہٹلر کو ڈانٹ دیا کہ خبردار اگر تو نے اور قدم آگے بڑھایا تو ایسا ایڈیٹوریل لکھوں گا کہ ناک رگڑنے کو

دوڑا دوڑا آئے گا۔ اور ہماری حکومت بھی سمجھ لے کہ ہم اس سے نہیں ڈرتے۔ ہم آزادی تحریر کے لیے اپنا مکان بیچ سکتے ہیں اور بیچ دیا ہے، کپڑے بیچ سکتے ہیں اور بیچ دیے ہیں، گھڑی بیچ سکتے ہیں اور سچ مچ بیچ دی ہے لیکن اپنا قلم نہیں بیچ سکتے۔ اپنا ضمیر نہیں بیچ سکتے۔ یہودیوں کو پھنکار رہے ہیں کہ دیکھو بہت ظلم ہو لیا۔ اب ہمارے صبر کا پیمانہ لبریز ہو رہا ہے۔ اب کے مار کے دیکھو۔ ہمارے بزرگ مولانا اختر علی خاں مرحوم کا وہ قصہ تو بہت مشہور ہے کہ ولایت گئے اور وزیر اعظم ایٹلی سے ملے اور کہا۔ دیکھیے جناب کشمیر کا مسئلہ فوراً حل کر دیجیے۔ ایک مہینے کی مہلت دیتا ہوں ورنہ'' ایٹلی صاحب کی سٹی گم ہو گئی۔ آنکھوں کے آگے تارے ناچنے لگے۔ منحنی آواز میں بولے۔ ''ورنہ کیا؟''

مولانا نے فرمایا۔ ''ورنہ میں آپ کے خلاف زمیندار میں اداریہ لکھوں گا۔''

یہی چسکہ تھا کہ لوگ گھاٹا کھا کر فقیر ہو جاتے تھے لیکن اخبار ضرور نکالتے تھے۔ ہمارے ایک دوست کا ایک ہفتہ وار پرچہ تھا۔ اسے خود ہی مرتب کرتے۔ چھپواتے دوکانوں پر دے کر آتے۔ اشتہار کے بل کے لیے سیٹھ کو فون کرتے کہ ''جناب بہت دیر ہو گئی۔ پیسے دلوائیے۔ میں اپنے چپراسی کو بھیج رہا ہوں'' اس کے بعد خود ہی تھیلا لے سائیکل پر بیٹھ سیٹھ کے دفتر پہنچ جاتے کہ مجھے ایڈیٹر صاحب نے بھیجا ہے۔ وہ بہت خفا ہیں۔ پیسے آج ہی دے دیجئے۔ ہاں اداریے اور کالموں میں ان کا طنطنہ دیکھنے کا ہوتا تھا۔ افسوس کہ اس چسکے کے دن بھی انگریزوں کے ساتھ گئے۔ کوئی دو سال ہوئے ہمارے ایک دوست کو ایک اخبار میں بڑی سفارشوں کے بعد کالم لکھنے کا موقع ملا۔ انہوں نے پہلے ہی کالم میں اعلائے کلمۃ الحق کر دیا کہ ''میرا قلم مقدس ہے۔ میں اپنے ضمیر کے علاوہ کسی کے آگے جوابدہ نہیں ہوں گا۔ صدر ایوب کوئی غلط کام کریں گے تو ان کے گریبان میں بھی ہاتھ ڈالنے سے نہیں ہچکچاؤں گا۔'' دوسرے روز ہم ان کے کالم کے منتظر رہے۔

تیسرے دن بھی اور پھر منتظر ہی رہ گئے۔ان کا کالم پھر نہ چھپا۔معلوم ہوا لات مار کر نکال دیئے گئے۔گھر میں بیٹھے چنے چاب رہے ہیں اور یہ شعر پڑھ رہے ہیں۔

سو بار ترا دامن ہاتھوں میں مرے آیا
جب آنکھ کھلی دیکھا، اپنا ہی گریباں تھا

☆☆☆

حساب کتاب روپوں کا، اور فائدے غریبی کے!
سبزی دفتر اعداد و شمار سے خریدا کیجئے!

کسی دانا نے کہا ہے اور اس قسم کی احمقانہ بات کوئی دانا ہی کہہ سکتا ہے کہ جھوٹ کے تین مدارج ہیں۔ نچلے درجے کے جھوٹ کو جو ہم ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے۔ سبھی حسب توفیق بولتے ہیں۔ فقط جھوٹ کہتے ہیں۔ اس سے اوپر سفید جھوٹ کا نمبر آتا ہے۔ اور جو اس سے بھی ارفع و اعلیٰ ہوا سے اعداد و شمار یعنی Statisties کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ کہنے کو تو ہم نے اس قول کو احمقانہ کہہ دیا ہے لیکن یہ ایسا نہیں۔ حد سے حد یہ کہہ سکتے ہیں کہ جس طرح انسان کو اخفا کے لیے نطق ملا ہے۔ اسی طرح حقیقتِ حال کو چھپانے کے لیے اعداد و شمار کی نعمت عطا ہوئی ہے۔ ہمارے ہاں ابھی اس کا رواج کم ہے۔ امریکہ وغیرہ میں تو ہر بات اعداد و شمار کی روشنی میں کی جاتی ہے مثلاً یہ کہ امریکہ میں ہر ۲/۳ آدمی کے پاس کار ہے۔ ہمارے ہاں کوئی سادہ لوح یہ بات سنے گا تو یہی سمجھے گا کہ امریکہ میں 2/3 قسم کے آدمی ہوتے ہیں۔ یعنی سر غائب ہے دھڑ موجود ہے اور کار چلا رہے ہیں۔ اس گمان کو اس بات سے اور تقویت ملتی ہے کہ امریکہ سے ایسے بیانات اکثر آتے رہتے ہیں جن کے لیے سریا اس کے اندر کے دماغ کی

ضرورت نہیں ہوتی۔ نیچے کا ۲/۳ دھڑ زیادہ اہم اس لیئے ہے کہ جیبیں اسی میں ہوتی ہیں پیسے رکھنے کے لیے۔ عقل بڑی کہ بھینس، پیسہ بڑا کہ دماغ۔؟

☆☆☆

ہم نے اوپر ذکر کیا ہے کہ ہمارے ہاں اعداد وشمار کا رواج کم ہے اور اس پر بھی لوگوں کو اعتبار کم ہے۔ اس لیے کہ دفتر اعداد وشمار کی طرف سے اعلان ہوتا ہے کہ مصارف زندگی میں اعشاریہ ۵...... فی صد کمی ہوگئی ہے جو کاغذ پر بہت بڑی لگتی ہے۔ ادھر بازار میں دس آنے سیر والی دال دو روپے سیر ہوجاتی ہے۔ ریڈیو پاکستان سے ہر صبح سبزیوں، پھلوں اور انڈوں کے نرخ نشر ہوتے ہیں؟ بازار میں جایئے اور دکاندار کو ان کا حوالہ دیا جائے تو جواب ملتا ہے کہ حضرت اس بھاؤ سبزی چاہیے تو مرکزی دفتر اعداد وشمار سے لیجئے۔ ہمارے ہاں تو وہی بھاؤ ہے جو آپ کو بتادیا ہے۔ سابق حکومت کے دور میں ٹھسے سے اعلان ہوتا رہا ہے کہ ہماری قومی آمدنی میں ہر سال آٹھ یا دس فیصدی اضافہ ہوجاتا ہے۔ عام آدمی سے کہئے تو وہ اسے جھوٹ قرار دے گا۔ لیکن سیٹھ اور مل مالک سے پوچھئے تو کہے گا۔ جُرور ہوئی ہے جناب۔ نکتہ یہ ہے کہ اس قسم کے اعلانات میں قوم کا مطلب سیٹھ ساہوکار ہوتا ہے۔ اسی لیے تو دہ سالہ ترقی کے دور میں یہ ہوتا رہا کہ فتح برٹش کی ہوتی ہے، قدم جرمن کا بڑھتا ہے۔

☆☆☆

ان ہی کالموں میں ایک بار ہم نے ذکر کیا تھا کہ بارہ کروڑ عوام کے گاڑھے پسینے کی کمائی کا ۸۰ فیصد یعنی قومی دولت کا بیس ارب روپیہ پاکستان کے تیس برگزیدہ خانوادے اپنی تجوریوں میں ڈال لیتے ہیں اور میاں عوام الدین مفلس کا مفلس رہتا ہے۔ چونیاں کے ایک وکیل صاحب کے منشی جی نے اس کا حساب پھیلایا اور وکیل صاحب کو بتایا۔ وکیل صاحب نے ہمارے دوست عنقا صاحب تک پہنچایا اور عنقا

صاحب سے انشاء صاحب تک آیا ہے، جس طرح پرانے زمانے میں سلطنت دست بدست آتی تھی۔ اسی طرح ہم اعداد وشمار کے ان موتیوں کو اپنے قارئین کی نذر کرتے ہیں۔ اسے وہ بطور عیدی کے قبول کریں۔

☆☆☆

منشی جی کے حساب کے مطابق ہر خاندان کا حصہ ۶۶/۶۶۶۶۶۶۶۶۶۶ آتا ہے یعنی چھیاسٹھ کروڑ چھیاسٹھ لاکھ، چھیاسٹھ ہزار۔ الخ۔ منشی جی نے ازراہ فیاضی لاکھوں کا حساب چھوڑ دیا ہے۔ ہم تو کبھی نہ چھوڑتے۔ ہمارے لیے تو ۶۶ روپے اور ۶۶ پیسے بھی بہت ہیں۔ بہر حال انہوں نے فقط چھیاسٹھ کروڑ لیئے او حساب لگایا کہ اگر کوئی سیٹھ صاحب ۶۶ کروڑ روپے کا چیک ایک ایک روپے کے کرنسی نوٹوں کی شکل میں کیش کرائیں تو ان نوٹوں کو بحساب سو نوٹ فی منٹ کی رفتار سے گننے کے لیے کیشئیر صاحب کو ۱۳ سال اور چند مہینے کا عرصہ چاہیے۔ ہاں اگر یہ رقم سب سے بڑے یعنی پانچ پانچ روپے کے نوٹوں کی شکل میں کی جائے تو آٹھ نو دن میں گنی جاسکتی ہے۔ اگر سیٹھ صاحب نوٹوں کی بجائے گول گول روپے لینا چاہیں تو ایک روپے کا وزن ایک تولہ کے حساب سے ۶۶/کروڑ روپے کا وزن ۳۶۶۷ ٹن بنے گا۔ اب اگر اس رقم کو انہیں لاہور بھیجنا ہے تو ریلوے کے بیس ٹن اٹھانے والے ۳۶۸ ویگن درکار ہوں گے۔ ہر مال گاڑی میں عموماً پچاس ویگن ہوتے ہیں۔ اگر سیٹھ صاحب کی رعایت سے ہر مال گاڑی میں ۵۲ ویگن لگائے جائیں تو اس مال کو سات مال گاڑیاں لاہور لائیں گی۔

☆☆☆

یہ تو ہوا ایک سیٹھ صاحب کا حساب۔ اگر ان تیسوں سیٹھوں کی بیس ارب روپے کی دولت سکّوں کی شکل میں لاہور لائی جائے تو گیا ہزار پانچ سواسی ویگن یعنی ۲۳۲ مال

گاڑیاں درکار ہوں گی۔ پاکستان میں اتنی گاڑیاں ہیں ہی نہیں۔ اگر خیبر میل ان تمام گاڑیوں کے بعد روانہ ہو اور یہ سب مال گاڑیاں دس دس منٹ کے وقفہ سے چلیں تو خیبر میل کی باری تین دن بعد آئے گی اور یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کب لاہور پہنچے گی۔

☆☆☆

یہ حساب کیا کم تھا کہ عنقا صاحب نے ریزگاری کا سوال اٹھا دیا اور کہا کہ بیس ارب روپے کے بیس کھرب پیسے بنتے ہیں۔ اگر ایک آدمی روزانہ دس ہزار پیسے گنے تو ایک ہی دن میں پوری گنتی کے لیے بیس کروڑ آدمی درکار ہوں گے۔ اور ہماری آبادی ہے فقط ۱۲ کروڑ......

☆☆☆

عنقا صاحب نے بھی یہ فرض کر لیا ہے کہ بارہ کروڑ آدمی بلا کچھ کھائے پیئے پیسے گننے بیٹھ جائیں گے اور اس بارہ کروڑ نوے سالہ ضعیف۔ ہسپتالوں کے بیمار۔ جیلوں کے قیدی اور ہم ایسے لوگ بھی شامل ہیں جنہیں بیس سے آگے گنتی نہیں آتی۔ ہم تو خدا کا شکر ادا کرتے ہیں کہ اتنی دولت نہیں رکھتے۔ جو ہے اسے خود دو منٹ میں کیا، آدھے منٹ میں گن سکتے ہیں، ہمارے پاس یہ روپے کے انبار ہوتے تو ریلوے والوں کی خوشامد کرنی پڑتی۔

ہاتھ جوڑتے پھرتے کہ بھیا ذرا ہمارا یہ روپیہ تو لاہور عنقا صاحب کے دفتر تک پہنچا دو...... اور یہ لو چائے پانی کے پیسے...... ارے دس روپے بہت ہیں استاد۔ ہم غریب آدمی ہیں، اس سے زیادہ نہیں دے سکتے۔ وغیرہ۔ گویا غریبی کا ایک فائدہ تو ہوا اور بھی کئی ایسے فائدے ضرور ہوں گے۔

☆☆☆

ہماری تقریر یوم غبغب گھڑیالوی پر!

اور مسٹر ہیگ روٹرڈم کا خطبہ اقبال کے بارے میں

’’جی فرمائیے‘‘

’’حضور میں ہوں گجراتی ادبی منڈل کا سکریٹری تار محمد دکھیا۔ ہم گجراتی کے مشہور ادیب حضرت غبغب گھڑیالوی کی برسی منا رہے ہیں۔ آپ صدارت فرمائیے گا‘‘

’’دکھیا صاحب۔ ہم انکار کر کے آپ کو مزید دُکھیا تو بنانا نہیں چاہتے۔ لیکن گجراتی ’’ہم نہیں جانتے اور غبغب صاحب کا نام بھی آج ہی سُنا ہے۔‘‘

’’جی یہ کوئی بات نہیں ہے۔ آج کل بہترین صدارت وہی لوگ کرتے ہیں جو موضوع یا ممدوح کے متعلق کچھ نہ جانتے ہوں۔‘‘

’’عجیب بات ہے۔ مثالیں دے کے واضح کیجئے تار محمد صاحب۔‘‘

’’آپ نے سنا ہو گا پچھلے دنوں بروہی صاحب نے اقبال کی شاعری پر ایک نہایت پر مغز تقریر کی بعد ازاں فرمایا صاحبو۔ میں نہ اردو جانتا ہوں نہ فارسی۔‘‘

’’ہاں یاد آ گیا۔ اردو نہ جاننے کے متعلق تو انہوں نے معقول دلیل بھی دی تھی کہ میری اپنی زبان اس سے زیادہ ترقی یافتہ اور بہتر ہے۔ فارسی زبان کے بارے میں

معلوم نہیں کیا کہا تھا۔ لیکن ہر کوئی بروہی صاحب تو نہیں ہو سکتا کہ جس چیز کے متعلق کچھ نہ جانتا ہو اس پر نہایت جامع مانع اور مدلل تقریر کرے۔"

"لیکن جی بیگم وقار النساء نون نے تو یوم اقبال اور نذرالاسلام کے مجموعی جلسے کی صدارت کر ڈالی اور بڑی دلپسند تقریر کی۔"

"بھئی ہم انہیں جانتے نہیں۔ کیا پتہ وہ اردو فارسی اور بنگلہ وغیرہ کی فاضل ہوں۔"

"جی انہوں نے وضاحت کردی کہ مجھے یہ زبانیں نہیں آتیں اور میں نے ان شاعروں کو پڑھا بھی نہیں لیکن اتنا معلوم ہوا ہے کہ عمل کی تلقین کیا کرتے تھے۔ پس اے حاضرین جلسہ تم بھی عمل کیا کرو۔ ہاتھ پر ہاتھ دھرے مت بیٹھے رہا کرو۔ بس مجھے اتنا ہی کہنا تھا۔ السلام علیکم۔"

"بھئی ہماری مصروفیات ہیں۔ ہمیں معاف کرو۔"

"جی آپ گھبراتے ہیں انشاء صاحب۔ گھبرائیے نہیں یوں تو آپ کو معلوم ہے ایسے موقع پر کیا کہا جاتا ہے۔ کہیں آپ رُکیں تو یہ بندہ لقمہ دینے کو تیار ہے۔ یا تو میں آپ کے کان میں بتادیا کروں گا۔ آپ پانی پینے کے بہانے سُن لیں یا پرچی لکھ کر بڑھا دیا کروں گا۔"

ہم نے کہا اچھا بھئی۔ آپ مجبور کرتے ہیں تو منظور۔ ورنہ ہمارا اب بھی یہی خیال تھا کہ......

☆☆☆

جناب تار محمد دُکھیا نے ہمارے گلے میں گوٹے کا چمکیلا ہار ڈالا۔ جو غالباً اس سے پہلے کئی صدروں کے گلے کا ہار ہو چکا تھا۔ اور اس کے علاوہ مختلف منگنیوں اور شادیوں وغیرہ کے موقع پر بھی استعمال ہو چکا تھا۔ بعد ازاں ہمارا اور ہمارے علم و فضل کی بیکرانی کا ذکر کیا اور کہا کہ ہر چند انشا صاحب گجراتی زبان نہیں جانتے۔ اور یہ بھی حقیقت ہے

کہ غبغب صاحب کا کسی اور زبان میں ترجمہ نہیں ہوا۔ تاہم وہ غبغب مرحوم کے افکار اور زندگی پر بڑی گہری نظر رکھتے ہیں۔ انہوں نے باوجود بے پناہ مصروفیتوں کے تشریف لاکر ہماری عزت افزائی کی ہے۔ اب میں انشا صاحب سے درخواست کرتا ہوں کہ خطبہ ارشاد فرمائیں۔

ہم نے پانی مانگا، سکریٹری صاحب نے ایک گلاس آگے بڑھایا۔ ہم نے کہا پورا جگ چاہیے۔ وہ بھی آ گیا۔ ہم نے سکریٹری صاحب کو ان کا فرض یاد دلایا اور پانی پی پی کر یوں رطب اللسان ہوئے۔

"صاحبو۔ حضرت غبغب گھڑیالوی کو کون ہے جو نہیں جانتا۔ پاکستان کے لیے ان کی خدمات فراموش نہیں کی جاسکتیں۔ (سکریٹری نے پرچی دی، ان کا انتقال تو ۱۹۱۴ء میں ہو گیا تھا) حالانکہ وہ پاکستان بننے یا پاکستان کا نظریہ پیش ہونے سے بہت پہلے ۱۹۱۴ کی لڑائی میں داد شجاعت دیتے ہوئے کام آ گئے تھے۔ (سرگوشی: ان کا انتقال ملیریا سے ہوا تھا، لڑائی میں نہیں) ہمارا مطلب ہے کہ ۱۹۱۴ کی جنگ کے دنوں میں ایک جان لیوا بیماری سے نبرد آزما ہوتے ہوئے جان جاں آفریں کو سپرد کی۔ نشان مردِ مومن با تو گویم۔ چو مرگ آید تبسم برلبِ اوست۔ ہم جب ان کی شاعری کا مطالعہ کرتے ہیں (پرچی: شاعر نہیں ناول نگار تھے) جس کو غالب کی طرح وہ ذریعہ عزت نہیں سمجھتے تھے اور ان کے ناولوں کی طویل فہرست پر نظر ڈالتے ہیں (پرچی: انہوں نے صرف ایک ناول لکھا تھا۔ چوہے دان) جن میں سے صرف ایک چھپا باقی کم عدم سے ظہور میں نہ آئے یا آئے تو چوہوں نے کھا لیے، تو ان کی عظمت ہمارے دل پر نقش ہو جاتی ہے۔ ان کے کمال فن کا اندازہ کرنا ہو تو ایک نظر ان کے ناول چوہے دان پر ڈالنی کافی ہے۔ (پرچی: "چوہے دان نہیں چمنستان")

واقعی پرچی پر چمنستان ہی لکھا تھا ہم جانے کیوں چوہے دان پڑھ گئے تھے۔ بہر

حال اب ہم نے پانی پی کر ان کے حالات زندگی کی طرف گریز کیا۔

’’گھڑیالہ جس کی نسبت سے وہ گھڑیالوی کہلائے ایک مردم خیز قصبہ ہے۔(پھر پرچی آئی: گھڑیالہ کوئی قصبہ نہیں، غبغب صاحب کے بزرگ شاہی دربار میں گھڑیال بجایا کرتے تھے۔) یہ بات ایک مشہور نقاد نے ایک مضمون میں لکھی ہے۔ اسے پڑھ کر ہمیں بڑی ہنسی آئی کیونکہ گھڑیالہ نام کا کوئی قصبہ گجرات میں نہیں۔ اصل میں غبغب صاحب کے بزرگ شاہی دربار میں گھڑیال بجایا کرتے تھے۔ یہ ادبی تاریخیں لکھنے والے ذرا بھی تحقیق نہیں کرتے۔ جوانٹ سنٹ چاہتے ہیں لکھ دیتے ہیں اردو کے مشہور شاعر حضرت شیوا چوہڑ کانوی کے بارے میں بھی ڈاکٹر غمزدہ ردولوی نے لکھ دیا تھا کہ وہ چوہے پکڑا کرتے تھے۔ حالانکہ چوہڑ کانہ ایک قصبہ ہے جہاں کا اچار مشہور ہے۔ شیوا صاحب بڑے شیوا بیان شاعر تھے۔ میں آپ کو چند اشعار سُناتا ہوں جو مفت مراعات النظیر میں ہیں۔ زباں پہ بار خدایا یہ کس کا نام آیا۔ یہ نظیر اکبرآبادی بھی خوب شاعر تھے (پرچی: یہ یوم غبغب صاحب کا ہے نظیر اکبرآبادی کا نہیں) لیکن افسوس یہ یوم نظیر اکبرآبادی کا نہیں ورنہ ہم ان کی نظم بنجارہ نامہ کے چند بند آپ کو سناتے، بلکہ بیڈھب انبالوی کا ہے (سرگوشی۔ صحیح نام غبغب گھڑیالوی ہے) جن کا صحیح نام غبغب گھڑیالوی تھا۔ پس ہم اس دعا کے ساتھ اپنی تقریر کو مختصر کرتے ہیں کہ خدائی پود کے ادیبوں کو ان کی شاعری یا ناول نگاری جو کچھ بھی وہ کرتے تھے اس کی تقلید کی توفیق دے تاکہ وہ بھی اسی طرح آنکھیں کھول کر مظاہر قدرت کا مشاہدہ کریں جس طرح غبغب صاحب کرتے تھے۔ اقبال صاحب بھی کہہ گئے ہیں۔

کھول آنکھ فلک دیکھ زمیں دیکھ فضا دیکھ

(سکریٹری صاحب نے پرچی دی۔ ’’غبغب صاحب تو نابینا تھے‘‘)’’لیکن یہ بعد از وقت آئی تھی اس لیے اسے ہم نے ایک طرف ڈال دیا اور پانی کا ایک گلاس پی کر

تالیوں کی گونج میں بیٹھ گئے۔

☆☆☆

آپ نے دیکھا ہوگا کہ آج کل اقبال کا صحیح مقام بھی انگریزی زبان میں متعین کیا جاتا ہے اور اس کے لیے کسی نہ کسی غیر ملکی کو بلایا جاتا ہے۔ اب کے ایک یوم اقبال تو ایرانی کلچرل سینٹر میں منایا گیا۔ ایک ہم نے اپنے علم دوست احباب کے ساتھ مل کر اپنے کلب میں منایا۔ ہمیں صدارت کے لیے کسی غیر ملکی کی تلاش تھی۔ خوش قسمتی سے کسی نے ہمیں ہالینڈ کے ایک نکتہ دان مسٹر ہیگ روٹرڈم سے ملادیا اور وہ صدارت پر راضی بھی ہوگئے۔ ہم نے کہا۔ آپ کو کچھ اقبال کے متعلق بتادیں! بولے ’’واہ اس مایہ ناز ہستی کو کون نہیں جانتا۔ اس نے فلسفہ خودی ایجاد کیا تھا۔ بس یہ بتادیجیے کہ رہنے والے کہاں کے تھے۔‘‘ ہم نے کہا ’’سیالکوٹ کے جہاں کھیلوں کا سامان بنتا ہے۔‘‘ فرمایا ’’مرگئے یا ابھی مرنا ہے‘‘ ہم نے کہا ’’آپ کی اور ہماری خوش قسمتی سے مرگئے ہیں۔‘‘

بولے ’’کیوں مرگئے۔‘‘

ہم نے کہا۔ ’’ہم خود بھی حیران ہیں کہ ملت کو ابتلا میں چھوڑ کر کیوں مرے۔‘‘

فرمایا۔ ’’میرا مطلب ہے کیسے مرے۔‘‘

’’بس حکیموں ڈاکٹروں کی دوائیں کھا کر مرے لیکن آپ کو اس سے کیا مطلب؟ آپ ان کی شاعری اور شخصیت پر بولیئے۔‘‘

’’اچھا۔ نام ذرا پھر سے بتادیجیے۔ ایکو بلال تھا شاید۔‘‘

ہم نے کہا ’’ایکو بلال نہیں بابا۔ اقبال۔ ٹھیک سے یاد کرلو۔‘‘

☆☆☆

مسٹر ہیگ روٹرڈم نے اپنی پُرمغز تقریر کا آغاز ہی سیالکوٹ سے کیا۔ اس کی وجہ

شہرت بیان کی اور فرمایا۔ اقبال بھی کھیل ہی کھیل میں بہت سی کام کی باتیں کہہ گئے ہیں۔ آج کل تو فلسفہ خودی کی بہتات ہے بلکہ اسے دساور بھیج کر زرمبادلہ بھی کمایا جاسکتا ہے لیکن ایجاد یہ اس شاعر نامی گرامی کی تھی۔ یہ فارسی اور اردو میں لکھتے تھے اور خوب لکھتے تھے۔ اے کاش ڈچ زبان کی شیرینی پر ان کی نظر گئی ہوتی وہ اس میں لکھتے اور ہم ان کا مطالعہ کرسکتے۔ اب ہم سب کو چاہیے کہ ان کے نقش قدم پر چلیں اور ان کا اجالا زمانے میں پھیلائیں جس طرح فلپس کمپنی کے بلب پھیلاتے ہیں جس کی پاکستان میں نمائندگی کا شرف اس ناچیز کو حاصل ہے۔ یہ کمپنی صرف بلب ہی نہیں، ریڈیو ٹرانزسٹر۔ ٹیلویژن۔ ٹیوب لائٹ ہر طرح کا مال عمدہ بناتی ہے اور بکفایت فراہم کرتی ہے (ہم نے ایک اور ٹھوکا دیا کہ موضوع پر آئیں) اور ہاں اکو بلال (ہم نے انہیں ایک اور ٹھوکا دیا) یعنی اقبال صاحب بہت بڑے اور مایہ ناز شاعر تھے۔ سمجھ میں نہیں آتا کیوں مر گئے اور قوم کی نیا بھنور میں چھوڑ گئے (تالیاں) سنا ہے۔ ڈاکٹروں اور حکیموں کی دوائیں کھا کھا کر مر گئے۔ ابھی طبی سائنس کو اور ترقی کرنی ہے۔ فلپس کمپنی نے اس پر بھی ریسرچ کا شعبہ کھولا ہے۔ ہماری تحقیقات کامیاب ہوگئیں تو آئندہ اچھے اچھے شاعر مرا نہیں کریں گے بلکہ صدیوں ایڑیاں رگڑا کریں گے۔ ان کی جان نہیں نکلا کرے گی (تالیاں) میں شکریہ ادا کرتا ہوں (ہمارا نام بھول کر) اپنے ان محترم دوست کا جنہوں نے مجھ ہیچمدان کو اس عزت سے نوازا اور کرسی صدارت پر بٹھایا۔ بے شک اقبال سے مجھے بہت دلچسپی ہے اور میں اور بھی تقریر کرتا لیکن افسوس ہال میں روشنی بہت کم ہے۔ اگر آپ لوگ فلپس کی ٹیوب لائٹیں استعمال کرتے......

ان کی تقریر کا آخری حصہ تالیوں کے شور میں ڈوب گیا' ٹھیک سے سنا نہ جاسکا۔

☆☆☆

پاکستان ناول مینوفیکچرنگ کمپنی!

پاکستان ناول مینوفیکچر کمپنی لمیٹڈ ہونہار مصنفین اور یکہ تاز ناشرین کے لیے اپنی خدمات پیش کرنے کا مسرت سے اعلان کرتی ہے۔ کارخانہ ہذا میں ناول جدید ترین آٹومیٹک مشینوں پر تیار کئے جاتے ہیں اور تیاری کے دوران انہیں ہاتھ سے نہیں چھوا جاتا۔ ناول اسلامی ہو یا جاسوسی۔ تاریخی یا رومانی۔ مال عمدہ اور خالص لگایا جاتا ہے اس لیے یہ ناول مضبوط اور پائیدار ہوتے ہیں۔ پڑھنے کے علاوہ بھی یہ کئی کام آتے ہیں۔ بچہ رو رہا ہو۔ ضد کر رہا ہو۔ دو ضربوں میں راہِ راست پر آجائے گا۔ بلی نے دودھ میں یا کتے نے نعمت خانہ میں منہ ڈال دیا ہو۔ دُور ہی سے تاک کے ماریے۔ پھر ادھر کا رُخ نہیں کرے گا۔ بیٹھنے کی چوکی اور گھڑے کی گھڑونچی کی طور پر استعمال ہونے کے علاوہ یہ چوروں ڈاکوؤں کے مقابلے میں ڈھال کا کام بھی دیتا ہے۔ ایک تو اس لیے کہ اس کے مطالعے سے دل میں شجاعت کے جذبات خواہ مخواہ موجزن ہوجاتے ہیں۔ دوسرے اپنی ضخامت اور پٹھے کی نوکیلی جلد کے باعث۔ خواتین کے لیے ہمارے ہاں واش اینڈ ویئر (WASH AND WEAR) ناول بھی موجود ہیں تاکہ ہیروئن کا نام بدل کر پلاٹ کو بار بار استعمال کیا جاسکے۔ ایک ہی پلاٹ برسوں چلتا ہے۔ پندرہ بیس ناولوں کے لیے کافی رہتا ہے۔

☆☆☆

واش اینڈ ویئر کوالٹی ہمارے اسلامی تاریخی ناولوں میں بھی دستیاب ہے۔ آرڈر کے ساتھ اس امر سے مطلع کرنا ضروری ہے کہ کونسی قسم مطلوب ہے۔ 65% رومان اور 35% تاریخ والی یا 65% تاریخ اور 35% رومان والی اجزائے ترکیبی عام طور پر حسبِ ذیل ہوں گے۔

۱۔ ہیروئن۔ کافر دوشیزہ۔ تیر تفنگ۔ بنوٹ پٹے اور بھیس بدلنے کی ماہر۔ دل ایمان کی روشنی سے منوّر۔ چھپ چھپ کر نماز پڑھنے والی۔

۲۔ کافر بادشاہ۔ ہماری ہیروئن کا باپ لیکن نہایت شقی القلب۔ انجام اس کا بُرا ہوگا۔

۳۔ لشکرِ کفّار جس کے سارے جرنیل لحیم شحیم اور بزدل۔

۴۔ اہلِ اسلام کا لشکر۔ جس کا ہر سپاہی سوا لاکھ پر بھاری۔ نیکی اور خدا پرستی کا پتلا۔ پابندِ صوم وصلوٰۃ۔ قبول صورت بلکہ چندے آفتاب چندے ماہتاب۔ بحر ظلمات میں گھوڑے دوڑانے والا۔

۵۔ ہیرو۔ لشکر متذکرہ بالا کا سردار۔ اُس حُسن کی کیا تعریف کریں، کچھ کہتے ہوئے جی ڈرتا ہے۔

۶۔ سبز پوش خواجہ خضر۔ جہاں پلاٹ رُک جائے اور کچھ سمجھ میں نہ آئے۔ وہاں مُشکل کشائی کرنے والا۔

۷۔ ہیرو کا جاں نثار ساتھی۔ نوجوان اور کنوارا تا کہ اسکی شادی بعد ازاں ہیروئن کی وفادار اور محرم راز خادمہ یا سہیلی سے ہو سکے۔

۸۔ کافر بادشاہ کا ایک چشم متفنّی وزیر جو شہزادی سے اپنے بیٹے کی' بلکہ ممکن ہو تو اپنی شادی رچانے پر اُدھار کھائے بیٹھا ہے۔ چونکہ اُدھار محبت کی قینچی ہوتا ہے لہٰذا

ہیروئن کے التفات سے محروم رہتا ہے۔

☆☆☆

پلاٹ تو ہمارے ہاں کئی طرح کے ہیں لیکن ایک اسٹنڈرڈ ماڈل جو عام طور پر مقبول ہے یہ ہے کہ ایک قبیلے کا نوجوان دوسرے قبیلے کی دوشیزہ پر فدا ہوتا ہے اور فدا ہوتا چلا جاتا ہے۔ وہ دوشیزہ لامحالہ طور پر دوسرے قبیلے کے سردار کی چہیتی بیٹی ہوتی ہے۔ پانچ انگلیاں پانچوں چراغ۔ خوبصورت۔ سلیقہ مند۔ عالم بے بدل۔ لاکھوں اشعار زبانی یاد۔ ابھی اُس تک اِس محبت کی خبر نہیں پہنچی ہوتی کہ دونوں قبیلوں میں لڑائی ٹھن جاتی ہے۔ ہمارا ہیرو محبت کو فرض پر قربان کر کے شمشیر اُٹھا لیتا ہے اور بہادری کے جوہر دکھاتا کشتوں کے پشتے لگاتا دشمن کی قید میں چلا جاتا ہے۔ محافظوں کی آنکھ میں دھول جھونک کر طالب ومطلوب ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔ اشعار اور مکالموں کا تبادلہ ہوتا ہے اور ہیروئن بھی پہلے ایک جان سے پھر ہزار جان سے اُس پر عاشق ہو جاتی ہے۔ راستے میں ظالم سماج کئی بار آتا ہے لیکن ہر دفعہ منہ کی کھاتا ہے۔ دانت پیستا رہ جاتا ہے۔ آخر میں ناول حق کی فتح، محبت کی جیت، نعرۂ تکبیر، شرعی نکاح۔ دونوں قبیلوں کے ملاپ اور مصنّف کی طرف سے دعائے خیر کے ساتھ آئندہ ناول کی خوشخبری پر ختم ہوتا ہے۔

آرڈر دیتے وقت مصنف یا ناشر کو بتانا ہوگا کہ ناول پانچ سو صفحے کا چاہیے، ہزار صفحے کا یا پندرہ سو کا۔ وزن کا حساب بھی ہے۔ دو سیری ناول۔ پانچ سیری ناول۔ سات سیری ناول۔ پندرہ بیس سیری بھی خاص آرڈر پر مل سکتے ہیں۔ گاہک کو یہ بھی بتانا ہوگا کہ اسی پلاٹ کو برقرار رکھتے ہوئے ماحول کس ملک کا رکھا جائے۔ عراق کا۔ عرب کا۔ ایران کا افغانستان کا؟ ہیرو اور ہیروئن کے نام بھی گاہک کی مرضی کے مطابق رکھے جاتے ہیں۔ ایک پلاٹ پر تین یا اس سے زیادہ ناول لینے پر 33% رعایت۔

☆☆☆

خواتین کے لیے بھی جیسا کہ ہم نے اوپر ذکر کیا ہے، گھریلو اور غیر گھریلو ہر طرح کے ناول بکفایت ہمارے ہاں سے مل سکتے ہیں۔ ان میں بھی محبت اور خانہ داری کا تناسب بالعموم 65% اور 35% کا ہوتا ہے۔ فرمائش پر گھٹایا یا بڑھایا بھی جاسکتا ہے، خانہ داری سے مطلب ہے ناول کے کرداروں کے کپڑوں کا ذکر۔ خاندانی حویلی کا نقشہ۔ بیاہ شادی کی رسموں کا احوال۔ زیورات کی تفصیلات وغیرہ۔ ہیرو اور ہیروئن کے چچا زاد بھائی بہنیں۔ سہیلیاں اور رقیب وغیرہ بھی مطلوبہ تعداد میں ناول میں ڈالے جاتے ہیں۔ ہمارے کارخانے کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ خواتین کے ناول مروجہ پاکستانی فلموں کو دیکھ کر لکھے جاتے ہیں تاکہ بعدازاں فلمساز حضرات ان پر اور فلمیں بنا سکیں۔ معمولی سی مزید اجرت پر ان ناولوں میں گانے اور دوگانے وغیرہ بھی ڈالے جاسکتے ہیں۔ اس سے مصنف اور فلمساز کا کام اور آسان ہوجاتا ہے۔ گاہک کو فقط ہیروئن کا نام تجویز کردینا چاہیئے اور وہ ریڈیو پاکستان کے فرمائشی پروگرام کو سن کر کیا جاسکتا ہے۔ باقی سارا کام ہمارے ذمے۔ مال کی گھر پر ڈلیوری کا بھی انتظام ہے۔

☆☆☆

بازار کے ناول بالعموم ایسے گنجان لکھے اور چھپے ہوتے ہیں کہ پڑھنے والوں کی آنکھوں پر برا اثر پڑتا ہے۔ ہم کوشش کرتے ہیں کہ صفحے میں کم سے کم لفظ رہیں۔ مکالمے اور مکالمہ بولنے والے۔ دونوں کے لیے الگ الگ سطر استعمال کی جاتی ہے۔ نمونہ ملاحظہ فرمائیے۔

شہزادی سبز پری نے کہا:۔

"پیارے گلفام"

☆☆☆

ایک چھوٹی سی سیر درویش کی!

چکر لگانا پنڈی اور اسلام آباد کے مدار میں

عین اس وقت کہ امریکی خلا باز چاند کے سفر کے لیے کمر کس رہے تھے، ہم اسلام آباد کے لیے رخت سفر باندھ رہے تھے۔ ہم درویشوں کا رخت سفر ہوتا ہی کیا ہے۔ ایک بقچی کپڑوں کی، چند تصویر بتاں، چند حسینوں کے خطوط، وہ بھی بیرنگ، دل راحت طلب چلا تو شاداں ہوکر تھا۔ لیکن یہ خبر نہ تھی کہ زمین کوئے جاناں رنج دے گی آسماں ہوکر بلکہ آسماں تو مفت میں بدنام ہے۔ ہمارے خلا باز وہاں ہو آئے ہیں اور درجہ بدرجہ ہر طرح کی خیریت بتاتے ہیں۔ پنڈی جاکر یہ احساس ہوا کہ راکٹ اور قمری گاڑی میں بیٹھ کر آتے تو اچھا تھا۔ یہ نہیں تو کم ازکم خلا بازوں والا سوٹ زیب تن کرنا چاہیے تھا تاکہ اس بلدۂ خوش نہاد اسلام آباد کی تمازت اور تابکاری کے اثرات سے محفوظ رہتے۔ سچ مچ قیامت کا عالم تھا۔ گرمی ایسی کہ چیل انڈا چھوڑتی تھی کیونکہ اُبلا ہوا انڈا اُس کے کس کام کا؟

اسلام آباد میں اب کے آب و ہوا کا حال پتلا ہی تھا. ہمارا قافلہ سخت جان جس سرائے میں اُترا وہ الف لیلیٰ کی بی بی شہرزاد کے نام سے موسوم ہے۔ دل کو کئی کہانیاں یاد سی آ کے رہ گئیں اس سرائے میں ہوا کا انتظام تو خیر معقول تھا. پورا ہوٹل ایئر کنڈیشنڈ

ہے لیکن آب کے معاملے میں یہ بھی شرمندگی سے آب آب ہوا جا رہا تھا۔ علی الصبح میاں جمیل الدین عالی منہ دھونے کو اٹھے تو پانی غائب۔ بولے پانی؟ ہم نے کہا میاں منہ دھو رکھو۔ کیسا پانی۔ کون سا پانی۔ اپنے کو ڈرائی کلین کراؤ۔ ہم محض اتفاق سے ذرا سویرے اٹھ گئے تھے۔ اس وقت پانی آ رہا تھا۔ معلوم ہوا اس کے اوقات ساڑھے چھ سے آٹھ بجے تک ہیں۔ پھر دوپہر اور شام کو تھوڑی دیر تک کھلتا ہے۔ ہاں بیرے اتنا کرتے تھے کہ پُر زور فرمائش پر پانی کی بالٹی لا دیتے تھے۔ شروع میں تو تکلیف ہوئی دو دن کے بعد سب ہی اپنی اوقات چھوڑ کر پانی کے اوقات کا خیال کرنے لگے جو حال اندرون ہوٹل پانی کا تھا۔ وہی بیرون ہوٹل ہوا کا تھا۔ محکمہ موسمیات والے بس شام کو تھوڑی دیر کو ذرا سی ہوا چھوڑتے تھے تاکہ لوگ آکسیجن کے بغیر مر نہ جائیں۔ ہم اسیران کمند ہوا۔ دل تنگ ہو کر کریما کا ورد کرتے رہ جاتے تھے کیونکہ فارسی سمجھنے والا وہاں کون تھا۔ سوائے قدوۃ السالکین پیر حسام الدین راشدی کے اور فخر صوفیائے دوران غلام مصطفٰے تبسم کے۔

☆☆☆

تو صاحبو وہاں پیر بھی تھے۔ صوفی بھی تھے۔ رند بھی تھے۔ جو اپنے نام کا اعلان شاید پسند نہ کریں گے۔ علامہ بھی تھے۔ فہامہ بھی تھے۔ فیض ایسے شاعر بھی تھے اور ہم ایسے شاعر بھی تھے۔ آساں تساں کرنے والے بھی تھے۔ بوشو بوشو کرنے والے بھی۔ مینڈے سائیں بھی اور تڑے موشے بھی۔ یہ سارا مجمع ایک علمی مجلس کے لیے تھا۔ کچھ لوگوں کا علم ان کے اندر تھا کچھ کا ان کی ذات کے باہر بھی یعنی چلتے تھے تو کتابوں کا انبار بغل میں ہوتا تھا۔ دھرتی پر قدم رکھتے تھے تو وہ علم کے بوجھ سے کانپ اٹھتی تھی۔ ان صاحبان علم میں سے ایک کو ہمارے عالی صاحب کو تو پیر صاحب نے منع کر دیا کہ خبردار کتابیں اٹھا کے چلے تو...... ہاں ہمارے میجر آفتاب حسن صاحب کو ٹوکنے کی

کسی میں جرائت نہ تھی۔ ہماری حیثیت اس سارے ہجوم میں مشت خاک کی تھی کہ بس آندھی کے ساتھ تھے۔ مبحث یہ تھا کہ مادام انگلش کو جلد از جلد اس کے میکے واپس بھیجا جائے۔ اور میاں قوم الدین اردو خانم اور بنگلہ بیگم کو حبالۂ نکاح میں لائیں۔ بحث ہوئی اور ایسی گرما گرم کہ ائیر کنڈیشنر بے کار ہو گئے۔ پھر سفارشیں مرتب ہوئیں۔ لوگ جو ذہنوں میں طرح طرح کے شبہات لے کر گئے تھے قائل ہو کر واپس آئے کہ ہاں یہ حکومت قومی زبانوں کو ان کا حق دلانا چاہتی ہے۔ اس کی کمیٹیوں اور کمیشنوں کو مزید کھٹائی میں ڈالنا نہیں چاہتی۔

☆☆☆

لاہور آئے تو معلوم ہوا کہ اسلام آباد تو اس کے مقابلے میں واقعی پُر فضا مقام تھا یہاں۔

گلشن میں آگ لگ رہی تھی رنگ گل سے میرؔ
بلبل پکاری دیکھ کے صاحب پرے پرے

لاہور میں لوگ روٹیوں کی طرح تنور میں لگے تھے اور بھٹے میں پکتی اینٹوں کی طرح سلگتے تھے۔ احمد ندیم قاسمی صاحب سے ہمارا یہ رشتہ ہے کہ لاہور کی کوئی شکایت کرنی ہو تو ہم ان سے کرتے ہیں۔ کراچی کے شکوے شکایت کے لیے وہ ہمیں مخاطب بناتے ہیں۔ ہم گرمی کھا کر محضر لے کر ان کی تلاش میں نکلے تو دو گھنٹے ان کے دفتر کی کھوج میں صرف ہو گئے۔ ڈھونڈتے پھرے۔ یہ دفتر انارکلی کے ایک چوبارے میں ہے اور اس کے لیے نیچے بازار سے سیڑھیاں بھی جاتی ہیں لیکن قاسمی صاحب نے اس خوبی سے انہیں کیموفلاج کر رکھا ہے کہ صرف خاص خاص آدمی اس کا پتہ رکھتے ہیں۔ ایسے ہی ایک خضر راہ نے کہا۔ یہ رہا راستہ ہم نے کہا۔ یہ تو موزے بنیان کی دوکان ہے۔ بولے بس بس انہی موزے بنیان کے ڈبوں کے درمیان سے پھونک پھونک کر قدم رکھتے

چلے جاؤ۔ آگے ایک پلمبر کی دوکان ملے گی۔ یعنی موٹے پتلے ہر طرح کے پائپوں کا سلسلہ شروع ہوگا۔ کچھ لیٹے ہیں۔ کچھ کھڑے ہیں۔ کچھ الجھے ہیں۔ کچھ سلجھے ہیں۔ کچھ دیوار سے چمٹے ہیں۔ کچھ چھت سے لٹک رہے ہیں جن میں چڑیوں اور چمگادڑوں نے گھونسلے بنا رکھے ہیں۔ ان سے بچتے بچاتے شکستہ و ریختہ سیڑھیاں اندھیرے میں پار کر کے کہ یہاں انسان کی بصیرت یا چراغ رخ زیبا کے علاوہ روشنی کا اور کوئی سلسلہ نہیں۔ اوپر پہنچ جاؤ۔ وہاں سات دروازے ملیں گے۔ ان میں سے ایک کسی گودام میں کھلتا ہے۔ ایک کسی غسل خانے میں۔ ایک اوپر کی سیڑھیوں کا دروازہ ہے۔ ایک کسی اور کوٹھی کا ہے۔ فقط ایک ہے جو قاسمی صاحب کے دفتر کی کاریڈور کی ڈیوڑھی کو جاتا ہے۔ یعنی ایک نئے ہفتخواں کی کلید ہے۔ لوگوں کی ذہنی آزمائش اور صبر کے سالانہ امتحان کے لیے کسی دروازے پر کوئی بورڈ نہیں لگایا گیا۔ سب ایک سے ہیں۔ ہم بعد خرابی بصرہ پہنچے تو معلوم ہوا کہ قاسمی صاحب نہیں ہیں۔ آج آئے ہی نہیں۔ ہیہات۔

☆☆☆

قاسمی صاحب کو کام بہت رہتا ہے۔ تصنیف و تالیف کا' پرچے کی ایڈیٹری کا، کالم کا اور نہ جانے کیا کیا یہ سارے کیموفلاج کے اہتمامات۔ انہوں نے ہم ایسے ہرزہ گرد ادیبوں اور شاعروں کو خود سے دور رکھنے کے لیے کیے ہیں جو انارکلی میں صابن تیل خریدتے ہوئے اوپر چڑھ آتے ہیں اور غزل عرض کرنے لگتے ہیں۔ بے شک ان کے دفتر میں آنا مشکل ہے لیکن آ کر جانا اور مشکل ہے۔ آنے والا یہ سوچ کر کہ اب کون ان پائپوں اور موزے بنیان کے ڈبوں کے بحر ظلمات میں سے گھوڑے دوڑاتا ہوا واپس جائے۔ دفتر بند ہونے تک وہیں بیٹھا رہتا ہے۔ پورا دیوان گوش گزار کر کے اٹھتا ہے۔ اس سے پہلے قاسمی صاحب نے انارکلی ہی میں ایک اور دفتر لیا تھا جس کا زینہ زمین سے ۹۰ درجے کا زاویہ بناتا ہوا اوپر جاتا تھا۔ نوے درجے تو خیر مبالغہ ہے ۸۹ یا ۸۸

ضرور ہوگا اس پر چڑھنا کسی کوہ پیما ہی کے بس کی بات تھی۔ لیکن اتفاق سے ایک بالکنی باہر کو نکلی ہوئی تھی۔ لوگ کمند ڈالتے تھے اور چشم زدن میں اوپر...'' قاسمی صاحب۔ ایک غزل کہی ہے۔ نیا مضمون باندھا ہے۔ عرض کرتا ہوں.....''

☆☆☆

یہ ماننا پڑے گا کہ جو دلچسپی اور محبت مظاہر قدرت سے لاہور والوں کو ہے' کراچی والوں کو نہیں کیونکہ آخر صنعتی شہر ہے۔ لوگ اونچی اونچی بلڈنگیں بنا کر ان میں بیٹھے ٹیلی ویژن دیکھتے رہتے ہیں۔ بھینسوں کو کراچی میں شہر بدر کر دیا گیا۔ حالانکہ خوبصورت جانور ہے۔ قد کاٹھ میں عقل سے بڑا اور ذوق میں موسیقی نواز۔ بین بجاتے جائیے۔ داد دیتا جائے گا۔ اہل لاہور نے اس کے مقابلے میں گائیوں کو جس طرح سینے لگا رکھا ہے اس کے لیے نسبت روڈ کا ایک چکر کرنا کافی ہے۔ پوری سڑک گیؤ شالا بنی ہے۔ جہاں جہاں ان کے حوائج ضروریہ وغیر ضروریہ کے ڈھیر لگے ہیں۔ تالاب بنے ہیں۔ راہ گیر دس قدم بھی پوتر ہوئے بغیر نہیں چل سکتا۔ بے اختیار ہمیں اپنا ہی قول یاد آیا کہ لاہور پاکستان کا سب سے بڑا گاؤں ہے۔ گڑھے ہیں' کھڈ ہیں' غار ہیں۔ جا بجا خوانچوں والے بیٹھے مکھیاں بیچ رہے ہیں۔ کم از کم ہم یہی سمجھے تھے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ بھی حفظان صحت کی ایک ترکیب ہے۔ مکھیاں پہرہ جمائے بیٹھی ہوں تو اصل چیز یعنی خوردنی مال پر جو خوانچے کی تہ میں ہوتا ہے گرد نہیں پڑتی۔ محفوظ رہتا ہے۔

(واللہ اعلم)

☆☆☆

جب طوفان نوح کا پانی ہمارے صحن میں داخل ہوا

کچھ نسخے درازی عمر اور خوبیٔ صحت کے

ہمارے مخدوم ملاّ واحدی، اللہ ان کی عمر میں برکت دے۔ اس صدی کے شروع کی باتیں ہمیں سناتے ہیں تو حیرت ہوتی ہے۔ لیکن خان بہادر نقی محمد خاں خورجوی ان سے آگے نکل گئے۔ رسالہ عصمت میں ان کا تازہ ترین مضمون پان خوری پر شائع ہوا ہے۔ جس میں کچھ واقعات کا تذکرہ کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ یہ باتیں آج سے نوے برس پہلے کی ہیں اور میری چشم دید ہیں۔ پھر لکھا ہے کہ پان کھانا تو چھوڑ دیا ہے لیکن سگریٹ پی لیتا ہوں کہ نوے سال سے پیتا آیا ہوں۔ اب اس بات کی کسر رہ گئی ہے کہ اس قسم کے مضامین سامنے آئیں۔

جب میں ۱۸۵۷ء میں اپنی پنشن وصول کرنے دلی گیا۔

جب میں نے میر تقی میر کے کان میں اذان دی۔

جب طوفان نوح کا پانی ہمارے صحن میں داخل ہوا وغیرہ۔

☆☆☆

جن بزرگوں کی خدمت میں ہمیں نیاز حاصل رہا ہے ان میں بابائے اردو مولوی عبد

الحق نے سب سے لمبی عمر پائی۔ کوئی ترانوے سال۔ بایں پیرانہ سالی ان کا ذہن بیدار فعال اور صحت مند تھا۔ غالباً ۱۹۶۰ء میں ہم ان کی لائبریری میں ان کی خدمت میں بیٹھے تھے کہ ایک صاحب نے آ کر سلام علیکم کی۔ مولوی صاحب نے ایک لمحے کو انہیں دیکھا۔ پھر اٹھ کر گرمجوشی سے بغلگیر ہوئے۔ ان صاحب نے کہا۔ مولوی صاحب آپ نے مجھے پہچانا بھی؟ بولے کیوں نہیں۔ تم فلاح شخص ہونا؟ ان صاحب کو بہت حیرت ہوئی۔ وہ علی گڑھ میں ۱۸۹۴ء میں ان کے ہم جماعت رہے تھے اور ملاقات پورے ۶۶ برس کے بعد ہو رہی تھی۔ خان بہادر صاحب کو بھی ہم ذہنی طور پر اسی طرح چاق و چوبند پاتے ہیں اور پوچھنا چاہتے ہیں کہ وہ کس چکی کا پسا کھاتے ہیں۔

☆☆☆

خوبیٔ صحت اور درازِ عمر کا راز جس سے پوچھو الگ ہی بتاتا ہے۔ کوئی صبح دم بیٹھک لگانے کی تلقین کرتا ہے۔ کوئی خالص گھی کو آبِ حیات بتاتا ہے۔ کسی کا کہنا ہے۔ ڈٹ کے کھاؤ۔ جب ایک داڑھ چلے، ستر بلا ٹلے۔ کوئی بکھے بھوکے پیٹ رہنے کا مشورہ دیتا ہے۔ ٹیلی وژن، ریڈیو اور اخبارات کے اشتہارات کو دیکھئے تو ان کے دعوے بھی کچھ اس قسم کے ہوتے ہیں۔

ہمارا ٹوتھ پیسٹ استعمال کرنے والا عمر بھر زندہ رہتا ہے۔

ہمارا بناسپتی گھی کھایئے اور قیامت کے بورئیے سمیٹئے۔

ہمارا صابن استعمال کرنے والا کبھی نہیں مرتا۔

چورن لکڑ ہضم استعمال کیجیے۔ حضرت نوح ہمیشہ یہی استعمال کیا کرتے تھے۔ وغیرہ۔

پچھلے دنوں ہمارے عزیز دوست، ریڈیو پاکستان کے گورو گھنٹال دادا شکیل احمد ٹیلی وژن پر آئے تو اپنی پہلوان نما صحت کا راز یہ بتا گئے کہ میں صبح صبح سر کے بل کھڑا ہوتا

ہوں اور چنے چباتا ہوں۔ آج تک کبھی زکام بھی نہیں ہوا۔ اپنی صحت کے ثبوت میں انہوں نے ٹیلی ویژن کے ناظرین کو مگدر بھی ہلا کے بلکہ گھما کے دکھائے۔

☆☆☆

لیکن ہمارے دوسرے دوست نجمی صاحب تو ملک کے مایہ ناز کارٹونسٹ ہیں بلکہ ان کی بنائی ہوئی EFU کی کارٹون فلم اب کے بہترین بھی ٹھہرائی گئی ہے۔ دادا شکیل سے اتفاق نہیں رکھتے۔ ان کا کہنا ہے کہ سر کے بل کھڑے ہونا ٹھیک نہیں۔ پنڈت نہرو یہی کیا کرتے تھے۔ ان کو دنیا کا ہر مسئلہ الٹا نظر آتا تھا حتیٰ کہ وفات پا گئے۔ چنوں کے بارے میں بھی انہوں نے کہا کہ ہاں ان میں طاقت ہے اور ان سے صحت قائم رہتی ہے لیکن گھوڑوں کی' انسان کو یہ قبض کرتے ہیں۔ وہ مگدر ہلانے کے حق میں بھی نہیں کہ ہاتھ سے چھوٹ جائے تو پاؤں پر چوٹ آنے کا خطرہ ہے۔ نہ ہمارے پیدل پاؤں چلنے کو وہ کچھ مفید جانتے ہیں۔ انہوں نے کوئی دس برس سے گھر سے باہر گلی میں قدم نہیں رکھا۔ ہم نے کہا۔ آپ کی صحت کا راز؟ بولے چپلی کباب۔ ہم نے کہا اور.....؟ بولے اور بھی۔ چپلی کباب۔

☆☆☆

خان بہادر نقی محمد خاں اب سو کے پیٹے میں تو ہوں گے۔ انہوں نے ساری عمر سگریٹ پیا۔ حقے کا شوق تو مولوی عبدالحق بھی رکھتے تھے۔ برنارڈ شا البتہ نہ سگریٹ پیتے تھے نہ شراب لیکن سچ پوچھئے تو کلیہ کوئی بھی نہیں۔ ایک صاحب کا قصہ مشہور ہے کہ سو سال کی عمر کو پہنچ رہے تھے اور چونچال تھے۔ ایک رپورٹر ان کا انٹرویو لینے ان کے گھر گیا' اور پوچھا کہ آپ کی درازئ عمر کا راز۔ انہوں نے کہا۔ سب سے بڑا راز تو یہ ہے کہ میں نے شراب کبھی نہیں پی۔ یک لخت پچھلے کمرے سے کچھ شور کی اور چیزوں کے گرنے کی آواز آئی۔ رپورٹر نے کہا یہ کیا ہے؟ ان صاحب نے کہا۔ کچھ نہیں۔ ہمارے

ابا جان ہیں۔ معلوم ہوتا ہے آج کچھ زیادہ پی آئے ہیں۔ ایسے ہی ایک اور بڑے میاں تھے جو یہ فخر کیا کرتے تھے کہ میں نے کبھی نہ شراب کو چھوا' نہ سگریٹ کو' نہ عورت کو جب تک کہ میری عمر گیارہ سال کی نہیں ہوگئی۔

☆☆☆

بابائے اردو ہاپوڑ کے رہنے والے تھے جہاں کے پاپڑ مشہور ہیں۔ خاں بہادر نقی محمد خاں کے وطن خورجہ کا اچار مشہور ہے۔ یہ تو ہوئے لمبی عمروں والے۔ صحت کے باب میں دادا شکیل احمد صاحب کے چنے اور نجمی صاحب کا چپلی کباب یاد رکھنے کی چیزیں ہیں۔ قارئین کرام کی آسانی کے لیے ہم نے ان سب چیزوں کا انتظام یک جا کر دیا ہے۔ عمر دراز ریستوران میں تشریف لائیے اور پاپڑوں کے ساتھ قسما قسم کا اچار نوش فرمائیے' چنوں کا بھی انتظام ہے۔ آپ کے لیے بھی' آپ کے گھوڑے کے لیے بھی ....چپلی کباب بھی نہایت عمدہ اور خالص گھی کے ملیں گے۔ ان کے ساتھ قہوہ اور نسوار کی چٹکی مفت۔ جو صاحب مگدر ہلانا چاہیں اپنے مگدر ہمراہ لائیں۔ ہمارے ریستوران میں آپ سر کے بل بھی کھڑے ہو سکتے ہیں بلکہ چل بھی سکتے ہیں کیونکہ ہمارا یہ ریستوران کوچۂ رقیب میں واقع ہے۔ اس عالم میں آپ اپنے محبوب کی موٹر یا رکشا کے نیچے بھی آ جائیں تو مضائقہ کی بات نہیں۔ عمر دراز ریستوران معقول معاوضے پر آپ کی تجہیز و تکفین کا بھی ذمہ لیتا ہے۔

☆☆☆

دیش مکھ جی کیسے دیش کو مکھ دکھائیں گے!

جن سنگھ کا ہر جگہ یہی حال ہوگا

بھارت کے صدارتی الیکشن میں گری صاحب جیتے اور ریڈی صاحب ہارے۔ ریڈی صاحب تیار تو بہت تھے بلکہ مستعدی میں انہیں ایور ریڈی کہا جاسکتا ہے۔ لیکن گر گئے اور گری صاحب جن کے نام میں افتادگی شامل تھی۔ آج کبوتر بام صدارت بنے اونچی اڑانیں کر رہے ہیں۔ شاعر نے سچ کہا ہے۔

خاکسارانِ جہاں را بحقارت منگر
گاہ باشد کہ دریں گرد سوارے باشد

☆☆☆

اب رہے دیش مکھ صاحب۔ ان کا ہمیں افسوس ہے۔ اب یہ کیسے دیش کو اپنا مُکھ دکھائیں گے۔ کس منہ سے لوگوں کے سامنے جائیں گے۔ یہ حضرت جن سنگھ اور سوتنترا پارٹی یعنی ایک طرف ہندو جاتی کے اور دوسری طرف سیٹھ ساہوکاروں کے نمائندے تھے۔ ووٹوں کی گنتی ہوئی تو جہاں ہزاروں ووٹ گری صاحب اور ریڈی صاحب کو ملے۔ سو سو پچاس پچاس ان کے حصے میں بھی آئے۔ بعض صوبوں نے البتہ دغا دی۔

ان کے معاملے میں بے مروتی کی حد کر دی!

ناگالینڈ صفر
مغربی بنگال صفر
کیرالا صفر

تینوں صفروں کو حساب کے قاعدے سے جمع کیجئے تو صفر اپنے قاعدے سے دیکھے تو تین انڈے ہیں۔ گر قبول افتدز ہے عز و شرف۔ انڈا آج کل مہنگا ہو رہا ہے۔ پانچ آنے کا ہے۔ تین پندرہ آنے کے ہوگئے۔ بشرطیکہ گندے نہ نکلیں۔ ہم نے پیسوں میں حساب اس لئے کیا کہ یہ وزیر خزانہ رہے ہیں اور چونکہ بنیوں کی آنکھ کا تارا ہیں اس لئے ہمیں وہ قصہ یاد آگیا تھا کہ کسی نے ایک بنیے سے پوچھا۔ "تم سورگ (جنت) میں جانا پسند کرو گے یا نرک (جہنم) میں۔ اس نے ترنت جواب دیا۔ "بابا جہاں دو پیسے کا مناپھہ ہوگا' وہاں جائیں گے۔"

☆☆☆

خبریں صرف تین امیدواروں کی آئی ہیں۔ باقی کہاں گئے؟ جس روز پہلے پہل امیدواروں کے ناموں کا اعلان ہوا فہرست اتنی لمبی تھی کہ ہم سمجھے میٹرک کا نتیجہ شائع ہوا ہے۔ اس کے بعد لگتا ہے کوئی یہاں گرا، کوئی وہاں گرا۔ ان میں سے کچھ اپنے میاں بشیر قسم کے تھے۔ کچھ کمال صاحب جیسے باکمال۔ جنہوں نے اب کے بھی اعلان کیا تھا کہ اگر پاکستانی قوم ان کو ملک کا صدر بنانا چاہے تو انہیں اعتراض نہ ہوگا بلکہ وہ اس کے لئے گلے گلے تیار ہیں حالانکہ اس میں ان کے قیمتی وقت کا بہت حرج ہوگا۔ کچھ بھی ہو یہ میاں بشیر سے زیادہ ظرف کے آدمی نکلے۔ انہوں نے تو ناراض اور بے مزہ ہو کر ملک ہی چھوڑ دیا۔ ایک لحاظ سے یہ ٹھیک بھی ہے۔ جو ملک انہیں اپنی کرسی صدارت تک پیش کرنے کو تیار نہ ہو اس میں رہنے کا فائدہ؟

☆☆☆

دیش مکھ صاحب کو تین صوبوں میں جو صفر صفر ملا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کا اپنا ووٹ ان صوبوں میں نہ تھا۔ لیکن ہمارے ہاں کے ایک الیکشن میں یہ بھی ہو چکا ہے کہ ایک صاحب اپنے حلقے سے امیدوار تھے اور ہم نے ان کی مقبولیت اور دوڑ دھوپ کو دیکھتے ہوئے وثوق سے پیشن گوئی کی تھی کہ ان کو ایک ووٹ ضرور ملے گا کیونکہ اس حلقے میں ان کا اپنا ووٹ بھی تھا۔ لیکن بیلٹ بکس کھولے گئے تو ان کا بکس کنجوس کے دل کی طرح یکسر خالی۔ خیر ہم بہت شرمندہ ہوئے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ پولنگ افسر نے دیکھے بغیر کہ یہ امیدوار ہیں ان سے کہہ دیا تھا کہ صاحب ووٹ اس امیدوار کو دیجئے گا جو آپ کی نظر میں نہایت ایماندار اور مخلص اور ممبری کا واقعی اہل ہو۔ اس کی باتوں میں آ گئے اور اپنے ایک حریف کو ووٹ دے آئے۔

☆☆☆

صفر ووٹ والا نتیجہ کسی امیدوار کے ووٹروں دوستوں، رفیقوں اور جانثاروں کے لئے بالخصوص شرمندگی کا باعث ہوتا ہے۔ ایک دو ووٹ بھی ہوں تو...... ان بھلے مانسوں کی عزت رہ جاتی ہے۔ ایک بار رائٹرز گلڈ کی مرکزی کمیٹی کے الیکشن میں ایک مشہور ادیب کے دو ووٹ آئے۔ ایک ووٹ تو خیر ان کا اپنا تھا لیکن دوسرے کے کوئی چھتیس دعویدار تھے۔ ہر کوئی پولنگ بوتھ سے نکل کر ان کے پاس آتا تھا کہ ''حضرت میں اپنے فرض سے ادا ہوا۔ اپنا ناچیز ووٹ آپ کو دے آیا۔ نہیں نہیں شکریے کی کوئی بات نہیں۔ یہ تو میرا فرض تھا۔'' فرداً فرداً یہ چھتیس حضرات نتیجہ نکلنے کے بعد بھی اپنے اس قول پر قائم رہے بلکہ دوسرے پینتیس دعویداروں کو پرلے درجے کا جھوٹا اور لپاٹیا بتاتے رہے۔ امیدوار صاحب کا اپنا بیان تھا کہ بھئی مجھے تو کوئی عہدے کی ہوس نہ تھی اور میرے پاس اتنا وقت بھی کہاں ہے؟ یہ تو پبلک کے پرزور اصرار پر کھڑا ہو گیا تھا۔ بھلا رائٹرز گلڈ بھی

کوئی ایسی جماعت ہے کہ کوئی شریف آدمی اس کی کمیٹی کا رکن بنے۔ اجی لاحول ولا قوۃ۔

☆☆☆

آپ برا نہ مانیں تو دیش مکھ صاحب سے ہمدردی کرتے کرتے ہم ایک نتیجہ بھی نکالتے جائیں کہ اللہ نے آنکھوں والوں کے لئے ہر بات میں عبرت کی نشانیاں رکھی ہیں۔ وہ یہ کہ جن سنگھ اور سوتنترا پارٹی قسم کی جماعتیں ہر ملک میں ہوتی ہیں۔ ہاں نام مختلف ہو سکتے ہیں۔ ان کی پشت پر ملکی اور غیر ملکی سیٹھوں کا روپیہ بھی وافر ہوتا ہے۔ جاگیرداروں کی کمک بھی، اور نعرے بھی ہوتے ہیں۔ غریب امیر کے فرق کو قدرت کا عطیہ سمجھتے ہیں۔ ایک نہ ایک ڈنڈا پارٹی یا سیوک سنگھ بھی ان کے قبضے میں ہوتا ہے اور پراپیگنڈے سے طاغوتی کو ملکوتی بنانے کا فن بھی جانتے ہیں لیکن جہاں عوام کے بیدار معاشرے سے ان کا مقابلہ ہوتا ہے وہاں حاصل جمع پندرہ آنے سے نہیں بڑھتی۔ اجی یہی دیش مکھ صاحب کے تین انڈوں کی طرف اشارہ ہے۔

☆☆☆

غلط محاورہ سُنا اور غریقِ رحمت ہو گئے!

کتنے طوطے تھے؟ کِس رنگ کے تھے؟

ہم لوگوں کے دلوں میں تو خیر بھانت بھانت کی بولیاں سُنتے سنتے بڑی سمائی آ گئی ہے اور میرے کو، تیرے کو، ہم کہتا ہے، چھوٹا والا، بڑا والا...... سب سُن لیتے ہیں...... لیکن بعض بزرگ اس معاملے میں اب بھی تانا شاہ ہیں۔ حضرت میر تقی میر کی طرح آدھا بھاڑا دے کر تانگے میں کسی بھلے مانس کے شریکِ سفر ہو گئے تھے۔ اس نے راستے میں خلوص بگھارنے کے لئے علیک سلیک اور بات چیت کا ڈول ڈالنا چاہا۔ یہ بے مزہ ہو کر بولے کہ "حضت۔ چپ بیٹھو۔ شریک سفر ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ تم سے بات چیت بھی کریں۔ ہماری زبان خراب ہوتی ہے"...... ایسے لوگ آج کل کم ہیں پھر بھی ایک بزرگ کے متعلق سُنا ہے کہ ان کے سامنے کسی کی زبان سے چھاتی پر ماش دلنا یا چنے دلنا نِکل گیا جبکہ محاورے میں چھاتی پر صرف مونگ یا کوووں دلنے کا حکم ہے۔ ان بزرگ نے افسوس میں ایک سانس اتنی لمبی کھینچی کہ دم نہ لوٹا۔ بیٹھے بیٹھے غریق رحمت ہو گئے۔ ہاتف نے کھڑے کھڑے تاریخ کہی...... "یا غریق رحمت"۔ ہم نے عدد گنے پورے ۱۹۶۹ء اس میں سے "شہید محاورہ" کے عدد نکالے تو ہجری تاریخ ہو جاتی ہے۔ مرنا ہو تو ایسا

ہو۔

ہمارے ایک دوست کہ لکھنؤ کے رہنے والے ہیں، ہم سے اکثر آ کر شکایت کرتے ہیں کہ جناب ہم تو گھر میں بامحاورہ گفتگو کو ترس گئے ہیں۔ ہماری بیگم ہیں تو اہل زبان مگر تعلیم ان کی سینٹ جوزف اسکول میں ہوئی ہے۔ ایک روز کسی نے دوران گفتگو ان کے سامنے کہہ دیا کہ "میرے تو ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔" یہ اس کو پکڑ کر بیٹھ گئیں کہ کیسے اُڑ گئے۔ کتنے طوطے تھے؟ کس رنگ کے تھے؟ پھر مِل گئے کہ نہیں؟...... اب ان سوالوں کا جواب خضر کیسے بتائے، کیا بتائے؟ ایک دن تو غضب ہی ہو گیا۔ ہماری امی بازار سے آئیں اور گرانی کی شکایت کرنے لگیں کہ بازار میں جس چیز کو دیکھو آگ لگ رہی ہے۔ ہماری بیگم کے کانوں میں بھنک پڑی تو چونکیں اور اُٹھ کر فائر بریگیڈ والوں کو فون کر دیا کہ دوڑو...... بازار میں آگ لگ رہی ہے...... پھر نہ کہنا ہمیں خبر نہ ہوئی۔

بے شک یہ زمانہ زبان وادب کے معاملے میں کم سوادی کا ہے۔ ہمارے ایک دوست کے پاس میٹرک کے اردو کے پرچے آتے ہیں۔ ایک روز ہم نے دیکھا کہ انہیں جانچتے جاتے ہیں اور زارو قطار روتے جاتے ہیں۔ سوال یہ تھا کہ فلاں فلاں محاوروں کو فقروں میں باندھو۔ مثلاً الو سیدھا کرنا" لائق طالب علم نے لکھا "ایک لڑکے کے پاس ایک لاجواب الو تھا جس کی گردن ٹیڑھی تھی۔ وہ ایک پہلوان کے پاس گیا اور کہا۔ بھاجی میرا الو سیدھا کر دو۔ اس نے جو زور لگایا تو گردن ٹوٹ گئی اور الو مر گیا" ایک محاروہ تھا۔ "دھوبی کا کتا نہ گھر کا نہ گھاٹ کا۔" اسے یوں سلکِ مضمون میں پرو دیا گیا کہ۔ "ہمارے دھوبی کے پاس ایک کتا ہے جو گھر کا نہ گھاٹ کا۔" ایک اور محاورہ ہے۔" کچی گولیاں کھیلنا۔" اسے ایک عزیز نے ادب کے میدان میں یوں لڑھکایا کہ۔ "آج صبح میں نے بھائی سے کہا۔ "آؤ کچی گولیاں کھیلیں" اس نے کہا جاؤ جاؤ میں کچی گولیاں نہیں کھیلتا۔ بارش ہو گئی تو سب کا ناس ہو جائے گا۔"

☆☆☆

ہم مضمون نگاروں کے نام قارئین کی طرف سے روز ہی قیامت کے نامے آیا کرتے ہیں۔ پتہ نشان والے بھی گمنام بھی۔ ان میں کچھ اب بے تبے کے ہوتے ہیں ،ناوکِ دشنام سے وریدہ۔ بعض محبت سے بھرے چالیس چالیس صفحے کے اور پسندیدہ۔ بلکہ محبت کا شہد بیرنگ لفافے کو پھاڑ کر باہر چکیدہ۔ تیسری قسم میں نصیحت نامے۔ ملامت نامے۔ ہدایت نامے آتے ہیں۔ از بزرگانِ عمر رسیدہ یا گرگانِ باراں دیدہ۔ جب ہم اپنے کالم میں ع ٹوک دو گر برا کرے کوئی، پر عمل کرتے ہیں تو کسی دوسرے کے ٹوکنے کا برا کیوں مانیں۔ ہمارے ایک گمنام مہربان نے ہمیں لکھا ہے کہ آپ بات بات پر دوسروں کی زبان پکڑتے ہیں اور خود غلط محاورے لکھتے ہیں۔ یہ کیا محاورہ ہوا ''جب تک جیوڑا چلے ستر بلا ٹلے۔'' اصل محاورہ ہے۔ ''ایک داڑھ چلے ستر بلا ٹلے۔'' ان صاحب نے ہمیں صحیح ٹوکا۔ ہمارا کالم فلم برداشتہ گھسیٹ ہوتی ہے۔ اتنا کسے دماغ کہ لکھ کر پڑھے۔ اُس روز کالم چھپ کر آیا تو ہم بھی حیران ہوئے کہ ''جیوڑا'' کیا؟ غلطی کاتب کی نہ تھی۔ ہمارا ذہن اور قلم ہی رپٹ گیا تھا۔ شاید تحت الشعور میں دلی کے جیوڑے تھے جن کا یہ قول شریف ہے۔ بہر حال ہم نے غلط لکھا اور شرمندہ ہیں۔ ''آپ کس چکّی کا پسا کھاتے ہیں۔'' بیشک یہ محاورہ کسی کے تن وتوش پر چپکایا جاتا ہے ہم نے خاں محمد نقی محمد خاں خورجوی کے باب میں (جودھان پان ہیں) لکھا تو مرا معنیٔ تازہ مدعا ست کی تقریب ہے۔ ہم ان کی بابرکت لمبی عمر کی کُنہ دریافت کر رہے تھے۔ یہ لغزش نہ تھی، اجتہاد تھا۔

اتنے ناداں بھی نہ تھے جاں سے گزرنے والے
واعظو پند گرد راہ گزر تو دیکھو

☆☆☆